WWW.PAKSOCIETY.COM
پسِ زنداں
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
طاہر جاوید مغل
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

پیش لفظ

پسِ زنداں اُس لڑکی کی کہانی ہے جو معاشرے اور حالات کے بے پناہ جبر کو جھیلتی رہی اور پسپا ہوتی رہی۔ معاشرہ اور حالات اُسے پسپا کرتے رہے لیکن ایک جگہ جا کر وہ رک گئی۔ وہ اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی...... کیونکہ وہ ایک عورت تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ایک مرد اُس سے اُس کی آدھی زندگی مانگ رہا تھا۔ آدھا گھر، آدھے دن، آدھی راتیں، آدھے راز و نیاز اور آدھی مسکراہٹیں۔ وہ دوسری عورت لانا چاہتا تھا۔ اور اپنی زندگی میں ہر طرح کا دکھ سہنے کے بعد یہی وہ مقام ہے جہاں عورت مزاحمت کرتی ہے، اُسے کرنا پڑتی ہے۔ خوبرو حجاب نے بھی کی۔ وہ تڑپی مچلی لیکن بے بس کر دی گئی۔ اُس کے اندر بغاوت کی چنگاریاں چمکی لیکن وہ چنگاریاں بھی جبر کے پاؤں تلے مسل دی گئیں۔ لیکن کیا واقعی بغاوت کی چنگاریاں مسلی اور بجھائی جا سکتی ہیں؟ شاید نہیں۔ یہ چنگاریاں بجھتی نہیں۔ بس اپنی جگہ اور شکل بدل لیتی ہیں۔ حجاب کی چنگاریوں نے بھی اپنی جگہ بدل لی اور اُس کے "غم خوار ہادی" کے سینے میں ٹھکانا کر لیا......

ہادی اُس کی محبت میں گرفتار ہوا اور پھر ایک دن حجاب کے ظالم و قاہر شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ہادی کی آنکھوں میں اپنی موت دیکھ کر حجاب کے شوہر نے ہتھیار ڈال دیے...... اور حجاب اپنے زنداں سے آزاد ہو گئی، مگر وہ کتنی آزاد ہوئی اور کتنی اُس زنداں کے اندر ہی رہ گئی، اس کا اندازہ آپ کو کہانی پڑھ کر ہی ہو گا۔

اس کہانی میں چند بار ایک معروف انگریزی نظم کا ذکر بھی آیا ہے۔ اس نظم میں ایک فرانسیسی جہاز راں، جنگ کے دوران میں اپنے بارہ تیرہ سالہ بیٹے کو جہاز میں ایک مقام پر کھڑا ہونے کا حکم دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دوسرے حکم تک وہ اُسی جگہ کھڑا رہے گا۔ لڑکا اپنے باپ کے حکم کی تعمیل میں جان قربان کر دیتا ہے۔

پسِ زنداں کا مرکزی کردار حجاب بھی ایسی ہی بے مثال اطاعت مندی اور دلیری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اپنے باپ کے حکم پر وہ مصائب کے ہولناک بھنوروں میں مستحکم قدموں سے کھڑی رہتی ہے۔ یہی عورت کی شان ہے۔ اُس کی یہی وہ غیر معمولی ہمت اور ایثار کی خوبی ہے جو اُسے کارخانۂ حیات میں ایک بلند تر مرتبہ عطا کرتی ہے۔

تاریخ گواہ ہے، دنیا کے بڑے بڑے ہوس کار۔ معاشرے کے فرعون اور مذہب کے بہروپیے ٹھیکیدار، عورت کے جذبۂ ایثار اور روح کی توانائی کے آگے بالآخر بے بس ہوئے ہیں۔

طاہر جاوید مغل

ہادی ٹرین میں تھا۔ ٹرین ایک ایسی پٹڑی سے گزر رہی تھی جس کے دونوں جانب پانی تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک سہانی شام تھی اور وینس کا شہر تھا۔ وہ شہر جو پانی میں رہتا ہے اور تاریخ جس کے تذکروں سے بھری پڑی ہے۔ یہ وہ بے مثال بستی ہے جس کی خوبصورتی اور ندرت دنیا بھر کے سیاحوں کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کشش کرتی ہے۔ ہادی بھی آج شام اس شہرِ ہفت رنگ میں اُتر رہا تھا۔ اس کے سامنے ایک حسین رات تھی۔ پروگرام کے مطابق اسے تھوڑی دیر اپنے کیمپ میں آرام کرنا تھا۔ پھر چائے پینا تھی اور تازہ دم ہو کر وینس کے خوبصورت گلی کوچوں میں گم ہو جانا تھا۔ لیکن اسے پتا نہیں تھا کہ اس رات میں اس کے لیے کیا چھپا ہے۔ یہ بظاہر ایک عام سی تفریحی شب اس کے لیے کتنی اہم ثابت ہونے والی ہے۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا۔

ٹرین وینس کے شاندار اسٹیشن پر رکی۔ وہ اپنے سامان سمیت اُترا اور پیدل ہی بس اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔ ایک مقامی شخص کے مطابق بس اسٹینڈ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وینس شہر میں پانی کی سڑکیں تھیں، پانی کی گلیاں تھیں اور ان سارے آبی راستوں پر چلنے والی گاڑیاں یعنی چھوٹی بڑی کشتیاں اور بجرے وغیرہ رواں تھے۔

موسم میں تھوڑا سا حبس محسوس ہوتا تھا لیکن یہ حبس زیادہ ناخوشگوار نہیں تھا۔ شام کی مست ہوا کے جھونکے اس حبس کو قابلِ قبول بنا رہے تھے۔ اس حبس کی وجہ یقیناً وہ پانی ہی تھا جو اس شہر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ روشنیاں جل اُٹھی تھیں۔ وینس کی عمارتوں میں چمکنے والی یہ روشنیاں ہر طرف سمندری پانی میں اپنا عکس دے رہی تھیں۔

ہادی نے تھکاوٹ دور کرنا چاہی۔ وہ سرِ راہ واقع ایک جدید ریسٹورنٹ میں داخل ہو گیا۔ یہاں اطالوی میوزک کی گونج تھی۔ تمباکو اور الکحل کی بو پھیلی ہوئی تھی اور کئی نوجوان اونچے اونچے اسٹولوں پر بیٹھے پاؤں تھرکا رہے تھے ان میں چند نیم عریاں سیاح لڑکیاں بھی تھیں۔ ہادی نے اپنا سامان ایک طرف کونے میں ڈھیر کیا اور سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنے قدرے لمبے بالوں کو اس نے کانوں کے عقب میں اُڑسا اور سگریٹ سلگا کر کولڈ کافی کا آرڈر دیا۔

آرڈر لینے والی ایک خوش پوش ویٹرس تھی۔ پہلے ویٹرس نے اٹالین بولی پھر شستہ انگلش میں بات کی۔ پتا نہیں آرڈر دینے میں کیا گڑبڑ ہوئی کہ کچھ دیر بعد کولڈ کافی کے بجائے ٹھنڈی شمپین سے بھرا ہوا گلاس اس کے سامنے تھا۔ ایک

پلیٹ میں آلو اور مچھلی کے تلے ہوئے گول قتلے تھے۔ وہ ٹھٹکا لیکن پھر مسکرا کر رہ گیا۔ وہ الکحل نہیں لیتا تھا لیکن آج کل جس موڈ سے گزر رہا تھا اس نے اسے درہم برہم کر رکھا تھا۔ اس نے سوچا چلو اب آ ہی گئی ہے تو پھر ..... آ جائے۔ شاید گناہ کے کھاتے میں بھی کچھ نرمی لکھی جائے کیونکہ یہ خود بخود آئی تھی۔

اس نے نیا سگریٹ سلگایا اور گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لینے لگا۔ سیال آگ دھیرے دھیرے معدے میں اُترنا شروع ہوئی تو سڑک کے مناظر کچھ اور بھی رنگین نظر آنے لگے۔ دور پانی میں ڈولتی ہوئی تفریحی کشتیاں، ان کی روشنیاں اور روشنیوں میں تھرکتے ہوئے جسم مزید دلچسپ محسوس ہونے لگے۔

اس نے ایک کے بعد دوسرا گلاس منگوالیا۔ ہاتھ پاؤں بھاری ہوتے چلے گئے۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جب وہ وہاں سے اُٹھا تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور اس کے سامنے 30 یورو یعنی تقریباً 3200 پاکستانی روپے کا بل تھا۔ ایسے موٹے بل ہادی کے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس نے بل چکتا کیا اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آیا۔ اس کے جسم میں حرارت پیدا ہوگئی تھی۔ الکحل کے ساتھ ساتھ آلو اور مچھلی کے لذیذ قتلوں نے بھی کام دکھایا تھا۔ اس کے بال ہوا میں لہرانے لگے۔ وینس کی روشنیاں ہزار ہا جگنوؤں کی طرح اس کے اردگرد دمک رہی تھیں۔ یہ جگنو جیسے موسیقی کی لہروں پر رقصاں تھے۔ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ ایک تنگ سڑک سے گزرتے ہوئے اسے اپنے پہلو میں خوبصورت منظر دکھائی دیا۔ شہر کی ایک آبی سڑک کے اوپر سے گزرنے والا محرابی پل۔ اس پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ نیچے سے کشتیاں گزر رہی تھیں اس نے اپنے گلے سے Nikon کا ڈیجیٹل کیمرا اُتارا اور تصویر اُتارنے لگا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنا شولڈر بیگ نیچے فٹ پاتھ پر رکھ دیا تھا۔ رک سیک اور دیگر اشیاء اس کی کمر پر تھیں۔ وہ دوسری یا تیسری تصویر اُتارنے کے لیے ذرا سا آگے چلا گیا۔ یہی وقت تھا جب اسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس کا شولڈر بیگ ابھی تک فٹ پاتھ پر ہی پڑا تھا۔ اسے لگا کہ کوئی اس بیگ پر جھپٹا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں چمکا کہ اب وہ سوئٹزرلینڈ میں نہیں اٹلی میں ہے۔ اور اٹلی میں امن وامان کی صورت حال زیادہ اچھی نہیں۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سایہ سا اس کا بیگ اُٹھا کر واپس دوڑ رہا تھا۔

''پکڑو..... پکڑو۔'' ہادی پہلے اردو میں چلایا پھر انگلش میں پکارا۔ ''تھیف ..... تھیف'' اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی اٹھائی گیرے کے پیچھے دوڑا۔ اس کی کمر پر رک سیک اور دیگر سامان کا بوجھ تھا۔ وہ زیادہ تیزی سے نہیں دوڑ سکا۔ اردگرد اکا دکا لوگ تھے اور حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ فوری طور پر کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے۔ وہ شخص ہادی سے بیس پچیس قدم آگے تھا اور کسی بھی وقت اس تنگ سڑک کی کسی بغلی گلی میں گم ہوسکتا تھا۔ اچانک ہادی نے دیکھا کہ ایک خاتون نے اٹھائی گیرے کے راستے میں ایک بانس نما شے پھینک دی۔ اٹھائی گیرا اس بانس نما شے سے اُلجھ کر اوندھے منہ پختہ سڑک پر گرا۔ بیگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دو تین افراد اس کی طرف جھپٹے، ان میں ہادی بھی شامل تھا۔ اس جواں سال اٹھائی گیرے کو پکڑ لیا گیا۔ اس پر گھونسوں اور ٹھوکروں کی بوچھاڑ کی گئی۔ اسی دوران میں پھرتیلے شخص نے خود کو چھڑایا اور تیزی سے جھکائی دے کر ایک نیم تاریک گلی میں دوڑ لگا دی۔ دو افراد اس

کے پیچھے لپکے لیکن ایک دو منٹ بعد ہی ہانپتے ہوئے واپس آ گئے۔ وہ خبیث گلیوں کے جال میں کہیں گم ہوگیا تھا۔

ہادی کی بائیں کلائی سے خون ٹپک رہا تھا۔ اٹھائی گیرے کو دبوچنے کے دوران میں یہ چوٹ اس کی کلائی پر لگی تھی۔ خاتون نے جو بانس اٹھائی گیرے کے راستے میں گرایا تھا وہ دراصل ایک طویل چھتری تھی جو سرِ راہ ایک ریسٹورنٹ سے باہر ایک میز پر تانی گئی تھی۔ ہادی کو اسی چھتری کا کوئی راڈ وغیرہ لگا تھا۔

حاضر دماغی کا مظاہرہ کرکے اٹھائی گیرے کی راہ میں چھتری گرانے والی خاتون دراصل ایک نوجوان لڑکی تھی۔ اس نے جین اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جوگر تھے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ اسے دیکھتے ہی ہادی کو اندازہ ہوگیا وہ انڈین یا پاکستانی ہے۔

''بہت بہت شکریہ۔'' ہادی نے ہانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ مدد نہ کرتیں تو میرا بیگ ملنا مشکل تھا۔''

حسبِ توقع اردو میں ہی جواب ملا۔ ''شکریہ تو آپ اس ریسٹورنٹ والوں کا ادا کریں جنہوں نے فٹ پاتھ پر یہ چھتری لگا رکھی تھی۔'' اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ اچھی لگتی تھی۔ تب اس کی نگاہ ہادی کی کلائی پر پڑی۔ ہادی نے اپنے دوسرے ہاتھ سے کلائی کو تھام رکھا تھا۔

چوٹ اچھی خاصی لگی تھی لیکن صورت حال کے تناؤ کی وجہ سے ہادی کو کچھ زیادہ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ''آپ کو مرہم پٹی کی ضرورت ہے۔ وہ سامنے گلی کے سرے پر ایک میڈیکل سٹور ہے۔ وہاں سے بینڈیج کا سامان مل جائے گا۔''

لڑکی ہادی کے قریب آ کر مدھم آواز میں بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اکثر اوقات ان راہزنوں کے ساتھی بھی ہوتے ہیں۔ وہ بدلہ لینے پر تل جاتے ہیں۔ آپ یہاں سے نکل جائیں۔ کہیں آگے جا کر پٹی وغیرہ کرا لیجیے گا۔''

''آپ کا مشورہ ٹھیک لگتا ہے۔ آپ پاکستانی ہیں؟''

''جی ہاں..... اس لیے نیک مشورہ دے رہی ہوں۔ آپ کو..... سامان اُٹھانے میں دقت تو نہیں ہو رہی؟'' ہادی نے دائیں ہاتھ سے اپنی زخمی کلائی تھام رکھی تھی۔ ظاہر ہے دقت تو ہو تا تھی۔ وہ چند سیکنڈ سوچتی رہی پھر اس نے جھک کر ہادی کا ایک بیگ اُٹھایا اور بولی۔ ''چلیں آئیں۔ میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔''

شکریے کے الفاظ ہادی کے منہ میں ہی رہ گئے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا سا لڑکی کے ساتھ چل دیا۔ لوگ یہاں وہاں کھڑے تماشائی کی حیثیت سے انہیں دیکھ رہے تھے لڑکی کے انداز میں اعتماد اور وقار تھا۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ اس کی طرح یہاں نو وارد نہیں ہے۔ شاید یہیں کی رہنے والی تھی۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے ایک تنگ سڑک پر مڑے اور پھر مین روڈ پر آ گئے۔ مین روڈ کے ساتھ ساتھ آبی سڑک بھی تھی اور دونوں سڑکیں روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں۔ ہادی کی نگاہیں ٹیکسی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکیں لیکن کوئی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک بس دکھائی دی۔ ''اس میں بیٹھ جائیں؟'' ہادی نے کہا۔

لڑکی نے نگاہیں سکیڑ کر بس کا نمبر پڑھا اور بولی۔ ''ہاں ٹھیک ہے۔''

دونوں سوار ہو گئے۔ انہیں نشستیں بھی مل گئیں۔ بس روانہ ہوئی تو دونوں نے اطمینان کی سانس لی۔ ہادی نے پہلی بار لڑکی کو ذرا دھیان سے دیکھا۔ عمر یہی کوئی تیئس چوبیس سال رہی ہوگی۔ وہ خوش شکل تھی۔ ہادی کے اندازے کے مطابق اس کے چہرے کی سب سے جاذب نظر شے اس کی پیشانی تھی جو مسکراتے ہوئے کچھ اور بھی خوبصورت ہو جاتی تھی۔ بے شک وہ جدید لباس میں تھی تاہم اس کے انداز میں ایک طرح کی مشرقیت اور معصومیت تھی۔

"یہ بس کہاں جائے گی؟" ہادی نے پوچھا۔

"ٹھیک سے تو مجھے بھی پتا نہیں، لیکن فی الحال یہ مین بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی ہے۔ وہاں جا کر اُتر جائیں گے۔ پھر آپ چاہے جس مرضی بس میں بیٹھ جائیں۔ ویسے آپ نے جانا کہاں ہے؟"

"جانا تو کہیں بھی نہیں۔ بس کسی ٹھکانے پر سامان رکھنا ہے اور پھر ساری رات ادھر اُدھر گھومنا ہے۔ یہ ویک اینڈ کی رات ہے۔ میں اسے کہیں سو کر گزارنا نہیں چاہتا۔"

"کتنے دن کے لیے یہاں ہیں آپ؟"

"زیادہ سے زیادہ پانچ دن۔"

"پھر کہاں جائیں گے؟"

"فلورنس یا روم۔ لیکن زیادہ چانس ہے کہ روم...... روم مجھے ہمیشہ سے بہت زیادہ اٹریکشن کرتا ہے۔"

"آپ اکیلے ہی نکلے ہوئے ہیں پاکستان سے؟"

"ہاں...... جناب ابن انشاء صاحب نے کہا تھا کہ سیاحت کا اصل مزا اکیلے میں ہی ہے۔ میرا اپنا بھی خیال ہے کہ انسان کسی کی کمپنی میں جو کچھ دیکھتا ہے۔ اکیلا رہ کر اس سے دس گنا زیادہ دیکھ سکتا ہے۔"

"اوہو...... پھر تو میں نے بہت غلط کیا آپ کے ساتھ آ کر۔" وہ ادا سے بولی۔ اس کی مسکراہٹ اس کی پیشانی کو روشن تر کر رہی تھی۔

"نہیں...... میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ نے تو بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔" وہ تہہ دل سے بولا۔

وہ اس سے اس کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا مگر اس سے پہلے ہی وہ بول اُٹھی۔ "ویسے آپ نے رہنا کہاں ہے؟"

"آپ نے میرے سامان میں خیمہ تو دیکھ ہی لیا ہوگا۔ کیمپ سائٹ پر خیمہ لگاؤں گا۔"

"ونڈر فل۔ بڑا رومانی آئیڈیا ہے۔ مجھے بھی کیمپنگ بہت پسند ہے لیکن افسوس کہ ایک دفعہ کے سوا کبھی کسی "کیمپ پلیس" میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

"تو اب چلیے۔ کیمپ پلیس کی سیر ہو جائے گی۔ بڑی شاندار جگہ ہے۔ میرے پاس اس کی تصویریں بھی ہیں۔" ہادی نے کہا اور شولڈر بیگ کی زپ کھول کر اس میں سے چند پکچر کارڈز نکال لیے۔ ان میں وینس کی ایک معروف کیمپس پلیس "ونیزیا" کی تصویریں موجود تھیں۔ دو تین معلوماتی پمفلٹ بھی تھے۔ درختوں کے درمیان حد نگاہ تک رنگ برنگے ٹینٹ لگے تھے اور چلتے پھرتے گھر یعنی کیرو ینز (Carvans) موجود تھے۔ لڑکی محویت سے دیکھنے لگی۔

چہرے پر اشتیاق تھا۔

"میں نے ابھی تک آپ کا نام نہیں پوچھا۔" ہادی نے کہا۔

وہ ذرا اٹک کر بولی۔ "عطیر ا...... عطیرا باسط۔"

"آپ یہیں رہتی ہیں؟"

"نہیں...... ہماری رہائش روم میں ہے۔ میں یہاں اپنی ایک فرینڈ کے پاس آئی ہوئی ہوں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کہ آگے بتانا نہ چاہتی ہو۔

اس سے پہلے کہ ہادی کچھ کہتا وہ پھر بول اُٹھی۔ "اور آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

"مجھے ہادی کہتے ہیں۔ کراچی کا رہائشی ہوں۔ شاعری میں منہ مارتا ہوں۔ فلموں کے لیے بھی شاعری کی ہے۔ آج کل ٹی وی ڈراموں کے تھیم سانگ وغیرہ بھی کہہ رہا ہوں۔"

اس کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اشتیاق سے بولی۔ "اچھا تو آپ شاعر ہیں لیکن شکل سے تو نہیں لگتے۔ ویسے...... ویسے مجھے بڑا شوق ہے فنکار ٹائپ لوگوں سے ملنے کا۔ میرے ایک ماموں بھی نعتیہ شاعری کرتے تھے اور مشاعروں وغیرہ میں بھی پڑھتے تھے۔ ترنم کے ساتھ۔ اب وہ کافی عرصے سے بیمار ہیں۔ اکثر فنکاروں کی طرح وہ بھی بالکل مختلف اور الگ قسم کے تھے۔ کیا آپ بھی ایسے ہی ہیں؟"

"آپ خود بتایئے۔ میں آپ کو کیسا لگ رہا ہوں؟"

"اس کے لیے تو پھر تھوڑا سا وقت آپ کے ساتھ گزارنا پڑے گا۔ اچھا کیا بتایا تھا ابھی آپ نے؟ آپ کو کون سی کیمپ پلیس پر جانا ہے؟"

"ونیزیا...... میرا خیال ہے کہ سٹی سینٹر سے ذرا ہٹ کر ہے۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ میں کیمپ پلیس تک آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ پھر دیکھتے ہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔ ویسے......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

"آپ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔" ہادی نے کہا۔

اس نے نچلے ہونٹ کو ہولے سے دانتوں تلے دبایا۔ پھر آہستہ سے بولی۔ "ویسے تو آج میں بھی شہر میں گھومنا چاہ رہی ہوں۔ پرسوں صبح مجھے واپس چلے جانا ہے۔ آپ بھلے آدمی لگ رہے ہیں۔ ہم اکٹھے گھوم سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے پہلے مجھے ماریہ کو فون کرنا ہوگا۔ ماریہ میری فرینڈ کا نام ہے۔"

"کیا وہ بھی آئے گی؟"

"نہیں اس کے ساتھ تو بہت گھومی ہوں میں۔ آج اکیلے نکلنا چاہتی ہوں۔" وہ من موجی انداز میں بولی۔

"پھر اس کو فون کیوں کر رہی ہیں؟"

"بھئی...... میزبان کو انفارم تو کرنا ہوتا ہے نا۔" اس نے کہا۔

ہادی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی کالی سیاہ آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ وہ جیسے اپنی ہی کسی لہر

میں بہے چلی جا رہی تھی۔

ایک اسٹاپ پر وہ بس سے اترے۔ وینزیا کی کیمپ پلیس تک پہنچنے کے لیے انہیں ایک اور بس پکڑنا پڑی۔ لیکن اس سے پہلے ایک میڈیکل سٹور سے ہادی نے اپنی کلائی کی بینڈیج کروائی۔ ہادی نے دیکھا تھا کہ سوئٹزر لینڈ میں بغیر ڈاکٹری نسخے کے اسپرین تک لینا مشکل تھا لیکن یہاں اٹلی میں ایسا نہیں تھا۔ کم از کم وینس میں تو میڈیسن مل رہی تھی بلکہ سٹور میں موجود ایک ملازم ٹائپ لڑکے نے اس کی بینڈیج بھی کر دی تھی۔

بینڈیج کے بعد وہ جس بس پر سوار ہوئے اس کا نمبر پانچ تھا۔ اس بس نے دس پندرہ منٹ کے خوشگوار سفر کے بعد انہیں کیمپنگ سائٹ پر پہنچا دیا۔ یہاں پہنچ کر علیزا بچوں کی طرح خوش ہوئی۔ واقعی جگہ بھی خوبصورت تھی۔ بلند و بالا درختوں کے نیچے دور تک خیموں اور "چلتے پھرتے گھروں" کا شہر آباد تھا۔ سامنے ہی ایک شاندار ریسٹورنٹ نظر آیا۔ اس میں بار بھی تھا۔ درجنوں جوڑے یا نہوں میں بانہیں ڈالے گھوم رہے تھے اور کھا پی رہے تھے۔ وہ دونوں استقبالیہ پر پہنچے۔ یہاں خیمہ لگانے کی فیس 40 یورو روزانہ یعنی تقریباً 4200 پاکستانی روپے تھی۔ ہادی کو یہ ہرگز زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے وہ سوئٹزر لینڈ میں دو مہنگے ہوٹلوں میں قیام کر چکا تھا۔ زیورک جھیل کے کنارے ایک ہوٹل کا کرایہ تو اس نے تقریباً پندرہ ہزار روپے یومیہ ادا کیا تھا۔ حسبِ دستور استقبالیہ پر ہادی کا پاسپورٹ رکھ لیا گیا اور اسے ایک سلپ جاری کر دی گئی جو دراصل خیمہ لگانے کا اجازت نامہ تھی۔

ہادی نے ریسٹورنٹ کے عقب میں ایک جگہ خیمے کے لیے منتخب کی۔ خیمے کو جوڑنے اور پھر کھڑا کرنے میں علیزا نے بھی ہادی کا ساتھ دیا اور اس کام میں بڑی دلچسپی لی۔ وہ واقعی بچوں کی طرح خوش نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہ بڑی جلدی بے تکلف ہو جانے والی لڑکی ہے یا پھر وہ اس سلسلے میں ہادی کو خاص رعایت دے رہی تھی۔ بہرحال اس کے رویے میں کسی طرح کا رومانوی ٹچ ہرگز محسوس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہادی کے ساتھ ایک دوست کی طرح ہی برتاؤ کر رہی تھی۔

خیمہ کھڑا کرنے کے دوران میں ہادی کا دل بار بار چاہا کہ وہ اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات حاصل کرے، مگر اس کی ہمت نہیں ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ علیزا نے خاموشی کی زبان میں اسے باور کرا دیا ہے کہ وہ اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش نہ کرے ورنہ یہ خوبصورت ساتھ کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے اور وہ اسے "بائی" کہہ کر وینس کی روشنیوں میں گم ہو سکتی ہے اور ہادی اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم آج رات تو نہیں۔ سوئٹزر لینڈ میں وہ اکیلا ہی گھومتا رہا تھا اور اب اس "تنہا گردی" سے قدرے اُکتایا ہوا تھا۔

خیمہ ایستادہ کرنے کے بعد اور اس میں سامان رکھنے کے بعد وہ نکل کھڑے ہوئے دونوں اجنبی تھے لیکن ہم زبانی اور ہم وطنی نے انہیں ایک دوسرے کے قریب لا کھڑا کیا تھا۔ وینس شہر کی اس پُرفسوں شب میں گم ہونے کے لیے وہ یوں روانہ ہوئے جیسے مدت سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔ "کہاں جانا ہے؟" علیزا نے بس سٹاپ پر پہنچ کر قدرے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"یہ سوال تو مجھے پوچھنا چاہیے۔ کیونکہ آپ تین چار دن سے یہاں موجود ہیں۔ وینس کو مجھ سے زیادہ جانتی

ہیں۔"

"تو پھر کسی "امیوزمنٹ پارک" میں چلتے ہیں۔ جھولے وغیرہ لیں گے۔ کشتی چلائیں گے۔" اس کی آواز میں بھاری پن تھا، جو ہادی کو شروع سے ہی محسوس ہو رہا تھا۔

ہادی نے کہا۔ "یہ آپ کی آواز بھرائی ہوئی کیوں ہے۔ کیا گلا خراب ہے؟"

"اور آپ کیا سمجھتے ہیں۔ مجھ جیسی سمارٹ لڑکی کی آواز اتنی بھدی ہوگی۔" وہ مسکرائی اور اس کی قدرے اُبھری ہوئی پیشانی دمک اٹھی۔ یہ پیشانی اس کی مسکراہٹ کو ایک دم ونڈرفل بنا دیتی تھی۔

وہ اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "دراصل میں کل بھی ایک تفریحی پارک میں تھی۔ وہاں پاکستانی انڈین کھانے بھی تھے۔ مزے کی بات یہ کہ گول گپے بھی تھے۔ اور گول گپوں کو دیکھ کر میری وہی حالت ہوتی ہے جو صحرا میں لیلیٰ کو دیکھ کر مجنوں کی ہوتی تھی۔ میں نے ضرورت سے زیادہ کھا لیے۔"

"کوئی دوا لی؟"

"نہیں..... اگر کہیں نظر آ گئے تو آج پھر گول گپے کھاؤں گی۔ کہتے ہیں کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔"

"بڑی مستقل مزاج ہیں آپ۔"

"اسی لیے تو آپ کے ساتھ چل رہی ہوں۔ ورنہ جس طرح کی باتیں کرتے ہیں آپ اب تک ہم دو مختلف بسوں میں بیٹھے ہوتے۔"

"میری باتیں پسند نہیں آئیں آپ کو؟"

"یہی بات ہے کہ ابھی تک تو نہیں۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" اس نے کہا۔ پہلے ہونٹ سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کا سر جھک گیا اور پونی ٹیل لہرانے لگی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "نہیں مذاق کر رہی ہوں۔ آپ کی کمپنی بہت اچھی ہے۔"

اسی دوران میں سٹی سینٹر جانے کے لیے ان کی مطلوبہ بس پہنچ گئی۔ یہ وہی پانچ نمبر تھی۔ دونوں سوار ہوئے۔ اس دفعہ نشستیں نہیں ملیں اور وہ دونوں کھڑے رہے۔ بالکل آمنے سامنے۔ علیزا کی خوشگوار سانس ہادی اپنے بالکل پاس محسوس کر رہا تھا۔ ان کے دائیں جانب سمندر تھا۔ یہاں بڑے بڑے لگژری جہاز کھڑے تھے۔ جیسے شاندار کثیر المنزلہ عمارتیں جن کے اندر زندگی کی ہر سہولت موجود ہو۔

مین بس اسٹینڈ پر پہنچ کر انہوں نے ٹیکسی لی اور تفریحی پارک "اوساوا" کی طرف چل دیے۔ یہ ایک آرام دہ کشادہ کار تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور...... ڈرائیور کم اور جہاز کا کپتان زیادہ نظر آتا تھا۔ وہی دبدبہ...... وہی اکڑفوں۔ کرایہ بھی کافی زیادہ تھا۔ ہادی نے کرایہ ادا کیا۔ علیزا نے اس میں شیئر کرنے کی کوشش کی مگر ہادی بولا۔ "اس وقت آپ کی حیثیت ہمسفر سے زیادہ میرے محترم گائیڈ کی ہے۔ اس لیے ادائیگیوں میں زیادہ تیزی نہ دکھائیں۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر چپ رہ گئی۔ ہادی نے سمجھا کہ وہ مان گئی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس کا پتا اسے آگے جا کر چلا۔

وہ دونوں پارک میں داخل ہوئے۔ یہاں تفریح کے لیے بہت کچھ تھا۔ جھولے کشتیاں، رولر کوسٹر ٹائپ گاڑیاں، بھیڑ...... سرکس...... اور نہ جانے کیا کیا۔

"چلیں پہلے یہ جھولا لیتے ہیں۔" اس نے کہا اور بے تکلفی سے ہادی کا ہاتھ تھام کر ایک چکر دار جھولے کی طرف لے آئی۔ یہاں قطار لگی ہوئی تھی۔ دونوں قطار میں کھڑے ہو گئے۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے بھی اس جھولے میں بیٹھ چکی ہے اور "ایکسائیٹڈ" ہے۔ ان کے آگے قطار میں کھڑا ایک جوڑا گاہے بگاہے بغلگیر ہوتا تھا اور دیگر حرکات میں مصروف ہو جاتا تھا۔ یہ وطیرہ تو پورے یورپ میں عام ہے اور اب لوگ ایسے مناظر کی طرف زیادہ توجہ بھی نہیں دیتے۔ شاید انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ ہر طرح کے ماحول سے جلد مانوس ہو جاتا ہے۔ مگر دوسری طرف یہ بھی انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ دوسروں کو چونکانا چاہتا ہے۔ اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے رومانی جوڑے عوام الناس کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے نئی حرکات اور نئے "وطیرے" ڈھونڈ لیتے ہیں۔

قطار آگے کو سرکتی رہی۔ چکر دار جھولا کافی بڑا تھا اور اس کی لہراتی ہوئی "موومنٹ" بھی کافی سنسنی خیز لگتی تھی۔ اس پر بیٹھے ہوئے مرد و زن جوش اور خوف کے عالم میں چلا رہے تھے ان میں حسبِ رواج بچے کم ہی نظر آتے تھے۔ اچانک علیزا نے ہادی سے پوچھا۔ "آپ یہ گیت وغیرہ کس طرح لکھتے ہیں؟"

"جس طرح یہ جھولا چل رہا ہے۔" ہادی نے رواں لہجے میں کہا۔ "اس جھولے کو چلانے کے لیے بجلی درکار ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی تخلیقی کام کے لیے اندر کی تحریک اور توانائی درکار ہوتی ہے۔ جب یہ توانائی ایک خاص حد تک پہنچ جاتی ہے تو تخلیق کا جھولا خود بخود چل پڑتا ہے۔"

"اور یہ توانائی آتی کہاں سے ہے جناب؟"

"اپنے اردگرد سے، کوئی پھول کھلتا ہے، کوئی آنسو گرتا ہے، کوئی صبح ہوتی ہے، کوئی آپ جیسی لڑکی مسکراتی ہے۔ تو یہ توانائی خود بخود تخلیق کے سوتوں میں داخل ہوتی ہے اور انہیں رواں کر دیتی ہے۔"

"اب مجھے یقین آ گیا۔ آپ یقیناً شاعر ہوں گے۔ آپ بہت گاڑھی گفتگو کرتے ہیں۔" وہ مسکرائی اور اس کی پیشانی پر پھر چودھویں کا چاند روشن ہو گیا۔

"یعنی اس سے پہلے آپ کو میرے شاعر ہونے پر شک تھا؟"

"زیادہ نہیں...... تھوڑا تھوڑا تھا۔" وہ ادا سے بولی۔ پھر موضوع بدل کر کہنے لگی۔ "اچھا آپ اپنا کوئی مشہور گیت سنائیں۔ گیت یا کوئی غزل وغیرہ۔"

"آپ شناخت پریڈ کر رہی ہیں۔"

"اوہو...... آپ ناراض ہو گئے۔"

"ناراض ہونے کا حق تو مجھے نہیں ہے۔ ابھی ہماری جان پہچان ہی کتنی ہے۔"

"تو پھر سنائیں گے۔"

ہادی نے ٹی وی چینلز سے نشر ہونے والے ایک گیت کا ٹکڑا سنایا تو علیزا کی آنکھیں بے ساختہ پھیل گئیں۔ اس

نے غیر یقینی نظروں سے ہادی کو دیکھا۔ "یہ گیت تو میں نے سنا ہوا ہے۔ کیا یہ واقعی آپ نے گایا...... میرا مطلب ہے کہ لکھا ہے؟"

"اب آپ ثبوت یا گواہی مانگ رہی ہیں۔ آپ تو مجھے پولیس والی لگ رہی ہیں۔"

"نہیں...... نہیں ہادی صاحب! میں تو بس حیران ہو رہی ہوں۔ اگر یہ واقعی آپ نے لکھا ہے تو پھر تو آپ مشہور آدمی ہوئے۔ مجھے میوزک وغیرہ سے بہت زیادہ دلچسپی تو نہیں لیکن پھر بھی ٹی وی اور ایف ایم پر کبھی کبھی سن لیتی ہوں۔ میرے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج وینس کی ان خوبصورت روشنیوں میں ایک مشہور پاکستانی فنکار میرے ساتھ ہے۔" وہ ایک دم خوشی سے نہال نظر آئی۔

"خیر ایسا مشہور فنکار بھی نہیں۔" ہادی نے متانت سے کہا۔ "اصل مشہوری تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جو سکرین پر نظر آتے ہیں۔ یا پھر جن کی آواز عوام کے کانوں تک پہنچتی ہے۔ ہم تو بیک اسٹیج کے لوگ ہیں۔ ہمیں کوئی نہیں پہچانتا۔ نہ کوئی آٹوگراف لینے کے لیے ہماری طرف لپکتا ہے۔"

"لیکن بھئی اصل بنیاد اور سوچ تو آپ لوگ ہی دیتے ہیں نا۔ اسی پر کسی شہ پارے کی عمارت بنتی ہے۔"

"سب لوگ تو آپ کی طرح نہیں سوچتے۔ کسی مشہور ہو جانے والے گیت کے گلوکار کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔ اگر وہ گیت کسی ڈرامے یا فلم میں ہو تو گیت گانے والے اداکار کی واہ واہ ہوتی ہے۔ ایوارڈ ملتے ہیں۔ سندیں عطا ہوتی ہیں۔ اس گیت کو سینکڑوں ہزاروں بار چلا کر اور اس کے ری میکس بنا کر روپیہ کمایا جاتا ہے۔ وہ کمرشلز میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پڑوسی ملکوں کی فلموں اور ڈراموں میں داخل ہو جاتا ہے مگر اسے لکھنے والا بے چارا گمنام اور الگ تھلگ رہتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے ہادی صاحب! اس بارے میں میں نے بھی کئی بار سوچا ہے اور افسوس کے ساتھ سوچا ہے۔ کسی شاندار فلم یا ڈرامے کے لکھنے والے کا نام چھوٹے موٹے تکنیک کاروں کے ناموں کے ساتھ سکرین پر آتا ہے اور تیزی سے گزر جاتا ہے۔ جبکہ ہدایت کار اور پروڈیوسر وغیرہ کے ناموں کو خوب ہائی لائٹ کیا جاتا ہے۔ دراصل ہم کسی بھی شعبے میں حق دار کو اس کا حق نہیں دیتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ شعبے زوال کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن "وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"لیکن کیا؟" ہادی نے پوچھا۔

"معاف کیجیے گا۔ آپ تو اتنے زیادہ بے چارے دکھائی نہیں دیتے۔ لگتا ہے کہ آپ کما رہے ہیں اور خرچ بھی کر رہے ہیں۔"

"ہاں علیزا! کمانے کے حوالے سے تو میں کسی حد تک مطمئن ہوں۔ لیکن ہم گیت نگاروں کی آمدن میں تسلسل نہیں ہوتا۔ کوئی اچھی چیز لکھ لی اور وہ "ہٹ" بھی ہو گئی تو کافی پیسے آ گئے لیکن اس کے بعد دو تین ماہ مندے کے گزرے اور حساب برابر ہو گیا۔"

"تو آپ کوشش کیا کریں کہ بس ہٹ چیزیں ہی لکھیں۔" وہ معصومیت سے بولی۔

ہادی نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ تو ایسے ہی ہے جیسے آپ کرکٹر محمد یوسف سے کہیں کہ وہ ہر بال پر چھکا کیوں نہیں مارتا یا پھر میراڈونا سے پوچھا جائے کہ وہ ہر پندرہ منٹ بعد گول کیوں نہیں کر دیتا تھا۔"

"مثالیں تو آپ اچھی دیتے ہیں۔ لگتا ہے کہ گیت بھی اچھے ہی لکھتے ہوں گے۔"

"بس گزارہ کر لیتا تھا۔" ہادی نے پھر لمبی سانس لی۔

"کیا مطلب؟ اب نہیں لکھتے آپ؟" اس نے دیدے گھمائے۔

"نہیں ... لکھتا ہوں۔ مگر کچھ زیادہ اچھا نہیں۔ جس طرح کھلاڑی آؤٹ آف فارم ہوتے ہیں۔ اس طرح میں بھی خود کو محسوس کر رہا ہوں۔"

"آؤٹ آف فارم۔" وہ ہنسنے لگی۔ "یہ اچھی اصطلاح استعمال کی ہے آپ نے۔" اس کی پیشانی حسبِ معمول دمک اٹھی۔ ہادی پیشانی کی اس دمک میں کھو سا گیا۔ اس کی "شاہکار" مسکراہٹ کی بنیادی وجہ تو اس کے غیر معمولی طور پر سفید اور ہموار دانت تھے۔ لیکن پیشانی بھی اس میں بھرپور کردار ادا کرتی تھی۔ اسی دوران میں جھولے پر ان کی باری آ گئی۔

وہ جھولے پر سوار ہو گئے۔ بڑا جدید اور شاندار جھولا تھا۔ اس کی موومنٹ نے بار بار علیزا کو چلانے اور ہادی کا بازو پکڑنے پر مجبور کر دیا۔ یہ سب کچھ بڑے بے ساختہ انداز میں ہوا۔ ہادی نے کن انکھیوں سے علیزا کی طرف دیکھا۔ پتا نہیں کیا لڑکی تھی یہ۔ کسی اچھے گھرانے کی لگتی تھی۔ چہرے سے شرافت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی مگر خبر نہیں کہ وہ کس موڈ میں تھی کہ اس وقت ہادی کے ساتھ ایک تفریحی پارک میں تھی اور بچوں کی طرح چہکاریں مار رہی تھی۔ اس کے بقول وہ یہاں اپنی کسی سہیلی کے پاس آئی ہوئی تھی لیکن رات کی اس سیر و تفریح میں وہ سہیلی بھی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس نے اسے بس ایک فون کیا تھا اور بالکل بے فکر ہو گئی تھی اس جھولے سے اترتے ہی علیزا نے ہادی کی دائیں کلائی پکڑی اور ایک دوسرے جھولے کی طرف لپکی۔ "دوڑو بھئی" وہ پکاری۔

دراصل ایک گروپ اس دوسرے جھولے کی قطار میں لگنے کے لیے آ رہا تھا۔ وہ اس گروپ سے پہلے ہی قطار میں لگ جانا چاہتی تھی۔ وہ خود دوڑی اور اس نے ہادی کو بھی دوڑا دیا۔ دونوں کسی کالجیٹ جوڑے کی طرح بھاگتے ہوئے لائن میں لگ گئے۔

بھاگنے سے اس کے گال شہابی ہو گئے اور وہ ذرا ہانپ گئی۔ بھاگنے سے اس کے بال بھی ذرا ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اس نے پونی ٹیل کا بینڈ اتارا اور بازو اوپر اٹھا کر بال کسنے میں مصروف ہو گئی۔ وہ بڑے متناسب جسم کی مالک تھی۔ پتا نہیں کیوں، ہادی اس میں عجیب سی کشش محسوس کر رہا تھا۔ وہ کوئی دل پھینک نوجوان نہیں تھا۔ اس کی شاعری کے پرستاروں میں بہت سی خواتین اور لڑکیاں بھی شامل تھیں۔ کئی لڑکیوں نے اس سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ان میں سے دو تین ایسی تھیں جن کے ساتھ اس کی دوستی پروان چڑھی تھی۔ نوجوان جوڑوں کی طرح اکٹھے گھوما پھرا کیا تھا۔ ریستورانوں میں کھانا کھایا گیا تھا۔ شاعری اور شاعری کی "وجوہات" پر لمبی چوڑی باتیں ہوتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی لڑکی بھی ہادی کی سوچوں پر قابض نہیں رہ سکی تھی۔ یہ تعلق جس طرح شروع ہوئے

اسی طرح بتدریج ختم ہو گئے تھے۔ مگر اس لڑکی میں ہادی کو کوئی جدا شے نظر آ رہی تھی۔ اس کی قربت اور اس کے لمس میں کچھ ایسی بات تھی جو ہادی نے اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ جیسے کوئی ان دیکھی چیز اسے اس سیلانی لڑکی کی طرف کشش کر رہی تھی۔ پتا نہیں کہ یہ آبی گزرگاہوں کے شہر وینس کا کمال تھا۔ اس دلفریب رات کا فسوں تھا یا کوئی اور وجہ تھی۔

دوسرا جھولا بھی بڑا سنسنی خیز قسم کا تھا۔ اس نے جھولا سواروں کو اٹھایا، گھمایا، اٹھایا اور دہلایا۔ چلا چلا کر لوگوں کے گلے بیٹھ گئے۔ علیزا کی آواز تو پہلے ہی بھرائی ہوئی تھی کچھ اور بھرا گئی۔

اس نے بمشکل کہا۔ "بہت مزہ آیا۔"

"آپ کی آواز تو مزید بیٹھ گئی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اب گول گپے کھا لینے چاہئیں۔"

"کیا بالکل خاموش ہونے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں آپ دیکھئے گا، گول گپے کھانے سے میری آواز بہتر ہو جائے گی۔"

"یہ تو مذاق کی بات کی ہے آپ نے...... اور اگر مذاق نہیں بھی تو...... گول گپے ملیں گے کہاں سے؟ یہاں تو کوئی ایسے آثار نظر نہیں آ رہے۔"

"آثار ہیں۔ بلکہ باقاعدہ گول گپے بھی ہیں۔ اس کے علاوہ آلو چنے، سموسے، جلیبیاں اور شاید دہی بڑے بھی مل جائیں۔ یہاں باقاعدہ ایک فوڈ اسٹریٹ ہے جناب! ہر ملک کے کھانے ہوتے ہیں۔"

"لیکن گول گپوں کے لیے تو "کھانے" کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایسی چیزوں کو تو سیانے لوگ "بدپرہیزی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔"

اس نے سنی ان سنی کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنے ڈھیلے بال کس کر باندھے اور ہادی کو لے کر آگے بڑھ گئی۔ اس کے انگ انگ سے توانائی اور خوشی کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ جلد ہی وہ دونوں فوڈ ہاؤس کے اندر تھے۔ ایسی جگہوں پر بہت رش ہوتا ہے اور ہر ملک و نسل کے لوگ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ غالباً اپنی فرینڈ کے ساتھ پہلے بھی یہاں آ چکی تھی۔ تیر کی طرح سیدھی انڈین پاکستانی اسٹال تک جا پہنچی۔ گول گپے اسے دور ہی سے نظر آ گئے تھے۔ وہ باقاعدہ ان پر جھپٹی۔ ہادی نے آخری بار اسے منع کیا۔ "دیکھیں آپ اپنے گلے کے ساتھ ظلم کریں گی۔"

وہ ترت بولی۔ "یہ بھی تو مجھ پر ظلم کر رہا ہے۔ کبھی کبھی ظلم کا جواب ظلم سے دینے کو بھی دل چاہتا ہے۔"

اس نے آخری الفاظ عجیب سے لہجے میں کہے تھے۔ ہادی نے چونک کر اسے دیکھا وہ اب بڑے خشوع خضوع سے گول گپوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اپنا مرمریں انگوٹھا ایک گول گپے میں چبھو کر اس نے گول گپے میں سوراخ کیا پھر اس میں تھوڑے سے کالے چنے ڈالے۔ اسے املی والے پانی کے پیالے میں ڈبویا اور بڑی مہارت سے اپنے منہ میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی سر کے اشارے سے اس نے ہادی کو بھی ہدایت کی کہ وہ بھی اس نیک کام میں دیر نہ کرے۔

ہادی کو کھٹی میٹھی چیزوں کا کچھ زیادہ شوق نہیں تھا۔ پھر بھی اپنی ساتھی کی دلجوئی کے لیے اس نے گول گپوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ وہ کھاتی جا رہی تھی اور سی سی بھی کرتی جا رہی تھی۔ اس کی خوبصورت ناک قدرے سرخ دکھائی دینے لگی۔

ہادی کے کانوں میں ابھی تک اس کا لہجہ اور اس کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ "کبھی کبھی ظلم کا جواب ظلم سے دینے کو بھی دل چاہتا ہے۔"

کہیں اس پر بھی تو کوئی ظلم نہیں ہو رہا تھا۔ جس کے ردعمل کے طور پر وہ یوں رات گئے اس آبی شہر میں بے مہار گھوم رہی تھی۔ اگر یہ ردعمل تھا تو کس کے خلاف تھا؟ اس کے اپنے والدین کے خلاف؟ کسی دوست کے خلاف یا پھر شوہر کے خلاف؟ کیا وہ شادی شدہ تھی؟ ہادی ابھی تک اس بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ اس سے پوچھنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

گول گپوں کے بعد وہ آلو چنے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ ہادی کوشش کے باوجود اس مرتبہ اس کا ساتھ نہیں دے سکا۔ بس ایک اونچی کرسی پر بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وہ محویت سے کھا رہی تھی۔ اس کی ایک لٹ بار بار اس کے ہونٹوں کی طرف آتی تھی جسے وہ اپنے اُلٹے ہاتھ سے یا اپنی کہنی کے ساتھ پیچھے ہٹا دیتی تھی۔ عجیب چلبلی مزاج لڑکی تھی۔ ہادی کو چند لمحوں کے لیے ڈر محسوس ہوا۔ کہیں اس دیارِ غیر میں وہ اسے کہیں پھنسا ہی نہ دے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ ہونے کو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ وہ "غلط لوگوں" کی ساتھی بھی ہو سکتی تھی۔ یا پھر گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی جس کے پیچھے اس کے اہلِ خانہ یا پولیس والے لگے ہوں۔ یا ایسا ہی کوئی اور معاملہ۔ بہرحال ہادی کے اس ڈر کی عمر زیادہ طویل نہیں تھی۔ اس نے ایک بار پھر دھیان سے اس نوجوان لڑکی کا چہرہ دیکھا۔ وہاں شرافت اور خاندانی نجابت جھلک دکھائی دی۔ بے شک وہ فی الوقت ایک شوخ اور ترنگ بھرے موڈ میں تھی اس کے باوجود ایک طرح کا وقار بھی اس کے اندر سے پھوٹتا تھا اور دیکھنے والوں کو اس سے فاصلے پر رکھتا تھا۔

آلو چنے کھانے کے بعد وہ مصنوعی جھیل میں تیرتی کشتیوں کی طرف بڑھ گئے۔ اب رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ وینس رنگ اور مستی میں ڈوبا ہوا تھا۔ یہ تفریحی پارک بھی اسی مستی کا حصہ تھا۔ ان ملکوں کی تفریحی جگہوں کو دیکھ کر یہی لگتا ہے جیسے یہاں صرف جوڑے ہی بستے ہیں۔ نوعمر جوڑے۔ جوان جوڑے، ادھیڑ عمر اور بوڑھے جوڑے اور یہ جوڑے ہر جگہ اور ہر وقت اپنی محبت کا برملا اظہار کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ ہر نسوانی کمر کے گرد ایک بازو نظر آتا ہے اور ہر مردانہ کندھے پر کسی خاتون کا سر ٹکا ہوتا ہے۔ بہت سے زیبا اور نازیبا مناظر بھی ہادی دیکھتا رہتا تھا۔

ٹکٹوں کے حصول کے بعد دونوں ایک پیڈل بوٹ پر سوار ہوئے اور نیم تاریک جھیل میں بوٹ چلاتے ہوئے آگے نکل گئے کنارے کی روشنیاں جھیل میں جھلملا رہی تھیں اور ایک خوشگوار ہوا شمالاً جنوباً چل رہی تھی۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ ہادی جانتا تھا کہ اگر اس ہوا سے جنوری فروری میں واسطہ پڑا ہوتا تو وہ دونوں چھ منٹ میں برفاب ہو جاتے۔

علیزا کے ریشمی بال ایک بار پھر ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اس نے انہیں باندھنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اوپر

اُٹھائے لیکن پھر باندھنے کا ارادہ بدل دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد یہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے، کسی ایسے آبشار کی طرح جس کا پانی ہولے ہولے ہوا میں لہراتا ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" اس نے روانی سے پوچھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ آپ پونی ٹیل میں زیادہ اچھی لگتی تھیں یا اس طرح۔" ہادی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے ذرا ٹھٹک کر ہادی کو دیکھا پھر بات بدلتے ہوئے بولی۔ "ہاں...... آپ نے بتایا نہیں کہ آپ پاکستان سے کسی گھوڑے کی طرح دگڑ دگڑ دوڑتے ہوئے یہاں کیوں تشریف لائے؟ کیا اسے گھاس نہیں ملتی تھی۔" اس نے ہنس کر کہا۔

"پتا نہیں "گھاس" سے آپ کا کیا مطلب ہے لیکن میرا مسئلہ اور تھا آپ یوں سمجھ لیں کہ میں ایک فنکار کی حیثیت سے خود کو اندر سے بالکل خالی محسوس کر رہا تھا۔ خالی اور بنجر۔ مجھے دو مشہور میوزک کمپنیوں کی طرف سے البم لکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ خاصی موٹی رقمیں بھی آفر کی جا رہی تھیں لیکن میرا دل کام کو نہیں چاہ رہا تھا۔ بالکل بھی نہیں۔ میں نے ایک جگہ سے تو ایڈوانس بھی پکڑ رکھا تھا۔ وہ بھی واپس کر دیا۔ قریباً تین چار ماہ تک کوشش کرتا رہا کہ گیت نگاری کی طرف مائل ہو سکوں۔ لیکن نہیں ہو سکا۔ پھر بہتر سمجھا کہ بُرا بھلا لکھنے کی بجائے نہ لکھوں۔ ویزہ لگوایا کچھ سامان اُٹھایا اور نکل پڑا۔ یہ تین ماہ کا (Schengen) ویزہ ہے۔ یورپ کے ڈھیر سارے ملکوں میں جا سکتا ہوں۔ چند دن سوئٹزرلینڈ میں گزارے ہیں۔ پہلے زیورک گیا پھر انٹرلاکن۔ اب بذریعہ یوریل (ٹرین) اٹلی آ گیا ہوں۔ چند ہفتے یہاں رہنے کا ارادہ ہے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آسٹریا یا جرمنی کا راؤنڈ لگا لوں۔"

وہ مسکرائی۔ "اس سے کیا ہو گا؟ گھوڑے کی اُداسی ختم ہو جائے گی اور وہ پھر سے گیت لکھنے شروع کر دے گا۔"

"ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔"

"بس آپ فنکاروں کی یہی غیر یقینی باتیں ہوتی ہیں جو عام لوگوں کو کشش کرتی ہیں۔ جب آپ سگریٹ کا کش لے کر اور بالوں میں انگلیاں چلا کر کھوئے کھوئے سے انداز میں بولتے ہیں تو دوسروں سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کا یہ "مختلف پن" کبھی کبھی لوگوں کو بیزار بھی کرتا ہے اور اُلجھاتا بھی ہے۔"

"آپ بتائیں آپ کشش محسوس کر رہی ہیں یا بیزار ہو رہی ہیں۔"

"بیزار ہو رہی ہوتی تو اس وقت آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔ خاموشی سے شہر کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئی ہوتی۔ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والے مرد و زن مجھے ہمیشہ سے اچھے لگتے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ میرے ایک ماموں بھی بڑے اچھے نعت گو شاعر ہیں۔ کچھ ملی نغمے بھی لکھے تھے انہوں نے ضیاء الحق کے دور میں۔"

ہادی نے لمبی سانس لی۔ "مجھے پتا ہے خاموشی سے شہر کی بھیڑ میں گم ہو جانے کا آپشن آپ نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے کچھ بتایا ہی نہیں اپنے بارے میں۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ چند گھنٹے ایک ساتھ گزارنے کے لیے ہم اپنا اپنا شجرۂ نسب ایک دوسرے سے بیان کریں۔ کیا اس طرح مزہ نہیں آتا کہ ہم ایک دوسرے کی زندگیوں میں جھانکے بغیر بس دو انسانوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ کچھ وقت بتائیں۔"

"چلیں جیسے آپ کی مرضی۔"

"اچھا..... آپ مجھے اپنی شاعری کے بارے میں بتا رہے تھے مجھے سمجھائیں کہ آپ کس طرح لکھ لیتے ہیں؟ کیا واقعی یہ کوئی آمد وغیرہ کا چکر ہوتا ہے۔ یا پھر کوشش کر کے آمد والا موڈ بنایا جاتا ہے۔"

"دونوں کام ہی ہوتے ہیں۔" ہادی نے کہا۔ "اپنی مرضی سے لکھا جائے اور اپنی خواہش کے ساتھ تو پھر آمد ہوتی ہے۔ ورنہ دیہاڑی دار مزدور کی طرح زور لگانا پڑتا ہے۔"

"تو پھر آپ بھی بس کبھی لکھا کریں نا۔"

"بڑی بھولی ہیں آپ۔ کبھی کبھی لکھیں گے تو پھر معاوضہ بھی کبھی کبھی ہی ملے گا اور زندگی تو ہر روز ہی کے تقاضوں کے ساتھ آن کھڑی ہوتی ہے نا۔ پروفیشنل لکھاریوں کو آمد کے حساب سے نہیں خرچے کے حساب سے لکھنا پڑتا ہے۔"

"اچھا..... اپنی کوئی ایسی چیز سنائیں جو آمد والی ہو۔" اس نے پھر موضوع بدلا۔

"نہیں.....اس وقت موڈ نہیں۔"

"موڈ بنالیں نا بھئی۔ آپ کی ایک پرستار آپ سے فرمائش کر رہی ہے بلکہ التجا۔"

ہادی کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے تحت اللفظ میں اپنی ایک آزاد نظم سنائی اس نظم میں ایک پہاڑی لڑکی کا ذکر تھا۔ وہ شبنم کی طرف شفاف اور جھرنوں کی طرح البڑھی۔ وہ چیڑ کے بلند و بالا درختوں کے نیچے کھڑی ہو کر روز ڈاکیے کی راہ دیکھتی تھی۔ اسے ایک خط کا انتظار تھا۔ یہ خط کس نے لکھا تھا؟ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ کہاں سے آنا تھا یہ بھی پتا نہیں تھا۔ یہ کہیں سے بھی آ سکتا تھا۔ جنوب کے سرسبز میدانوں سے شمال کے بلند ترین برفیلے پہاڑوں سے یا مشرق کی نیلی جھیل سے، مغرب کی کسی بے نام بستی سے، مگر اسے یقین تھا کہ وہ خط ضرور آئے گا۔ لکھنے والا اس کے نام ضرور لکھے گا اور وہ روز ڈاکیے کی راہ دیکھتی تھی۔

"زبردست..... زبردست۔" نظم ختم ہوئی تو علیزا نے دل کھول کر داد دی اور باقاعدہ تالی بجائی۔

کشتی کے پیڈل چلا چلا کر وہ ذرا ہانپ گئی تھی۔ ہادی نے اسے پیڈل چلانے سے روک دیا اور خود ہی کشتی کھینچنے لگا۔ اس نے ممنونیت سے ہادی کی طرف دیکھا۔ اس کے بالوں کی چند لٹیں اُڑ کر ہادی کے چہرے سے ٹکرائیں اور اس کی حسِ شامہ کے ساتھ ساتھ پورے جسم نے خوشبو کی لہر محسوس کی۔ علیزا نے جلدی سے شریر لٹوں کو پیچھے ہٹایا اور کانوں کے پیچھے اڑسا، جیسے وہ لٹیں نہ ہوں..... شریر بچے ہوں جو اس کی مرضی کے خلاف اٹکھیلیاں کر رہے ہوں۔

کچھ ہی دیر بعد ان کی پیڈل بوٹ کنارے لگ گئی۔ ہادی پہلے اترا پھر علیزا کو اتارنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ ذرا جھجکی پھر ہادی کی آفر قبول کر لی۔ پھول جیسے نرم ہاتھ کے لمس نے ہادی کا دل بے طرح دھڑکا دیا۔ اس نے بمشکل اپنے تاثرات پر قابو پایا اور علیزا کو کنارے پر لے آیا۔

دونوں جھیل کے ساتھ ساتھ چلتے تفریحی پارک سے باہر آ گئے۔ باہر کی گہما گہمی بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ایک اوپن ایئر ریسٹورنٹ نے آبی راستے کے کنارے کنارے دور تک میزیں سجا رکھی تھیں۔ یہاں جام حرکت میں تھے اور کھانے کھائے جا رہے تھے۔ آرکسٹرا زور و شور سے دھنیں بکھیر رہا تھا۔ سامنے والے پل پر اتنا ہجوم تھا کہ گزرنا مشکل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ ویک اینڈ کی رات نہیں بلکہ کوئی اہم تہوار ہے۔ بدمست جوڑے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ فضاؤں میں نشیلے قہقہوں کی گونج تھی۔ وہ پل کے پار جانا چاہتے تھے۔ رش کی وجہ سے وہ دوسرے پل کی طرف بڑھے۔ اچانک گارڈینا کی ایک باڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے دونوں ٹھٹک گئے انہیں سسکیوں کی مدھم آواز سنائی دی تھی۔ یہ ایک لڑکی تھی جو کسی باغیچے کی سیڑھیوں پر گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ بال جوڑے کی صورت میں بندھے تھے۔ وہ کراہ رہی تھی اور اپنا ایک ٹخنہ بار بار دبا رہی تھی۔

"کیا ہوا سسٹر؟" علیزا نے اس پر جھکتے ہوئے کہا۔

اس نے چہرہ اُٹھایا جو آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ نفی میں سر ہلا کر وہ پھر اپنے اوپر اُٹھے ہوئے ٹخنوں پر جھک گئی۔ بلکہ اس کے رونے میں تھوڑی سی تیزی آ گئی۔ ہادی اور علیزا نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر علیزا لڑکی کے پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی اور اس سے رونے کی وجہ پوچھنے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک بنگلہ دیشی لڑکی ہے۔ اس کا نام انیسہ ہے۔ اس کی سخت مزاج ساس نے اسے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔

انیسہ نامی یہ لڑکی چوبیس پچیس سال کی رہی ہوگی۔ وہ بنگالی لہجے میں اردو بول رہی تھی۔ بیچ میں کہیں کہیں انگلش کا فقرہ بھی بول جاتی تھی۔ علیزا نے پوچھا۔ "شوہر کہاں ہے تمہارا؟"

"وہ فلورنس گئے ہوئے ہیں۔ کوئی دفتری کام تھا انہیں۔" وہ بنگالی لہجے میں بولی۔ فلورنس ایک قریبی شہر تھا۔

علیزا نے کہا۔ "یہ تو اور بھی بُری بات ہے۔ تمہارا شوہر یہاں نہیں اور اس عورت نے مار پیٹ کر تمہیں نکال دیا۔ وہ بھی رات کے وقت۔ اس کی تو پولیس رپورٹ ہونی چاہیے۔"

لڑکی کی سیاہ آنکھوں کے کٹورے پھر آنسوؤں سے بھر گئے۔ اس کا ٹخنہ ذرا سوج گیا تھا اور نیلگوں ہو رہا تھا۔ کراہتے ہوئے بولی۔ "وہ کبھی کبھی ٹائم غصے میں آ جاتی ہیں وہ۔ میں نے ہاتھ جوڑے۔ منت کی لیکن ایک نہیں سنی۔ مجھے باہر دھکا دے کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔"

"بات کیا ہوئی تھی؟" ہادی نے پوچھا۔

"کسی بات کا ہونا ضروری نہیں۔ بس میں اچھی ہی نہیں لگتی ان کو۔ شادی کو سات ماہ ہوئے ہیں۔ بس پہلے ایک دو ماہ ہی ٹھیک گزرے پھر میری بدنصیبی شروع ہو گئی چھوٹی چھوٹی باتوں پر میری مصیبت آ جاتی ہے۔"

"شوہر ساتھ نہیں دیتا تمہارا؟" علیزا نے پوچھا۔

"کبھی تھوڑا بہت دیتے ہیں کبھی نہیں۔ انہیں بھی اپنی والدہ کی ناراضگی کا ڈر رہتا ہے۔"

"اب کیا بات ہوئی تھی؟"

"انہیں میری ہر بات ہی بُری لگتی ہے۔ میرے والدین ڈھاکا میں رہتے ہیں۔ اگلے مہینے مجھے ان کے پاس جانا ہے اپنے بھتیجوں کے لیے کچھ چیزیں بازار سے لے کر آئی تھی۔ بس اسی بات پر ان کو غصہ آ گیا کہنے لگیں کہ مجھے اپنے میکے والوں کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ مجھ سے بہت سخت بولنے لگیں۔ میرے ماں باپ کو گالیاں دیں۔ میں نے بس اتنا کہا کہ وہ ہزاروں میل دور بیٹھے ہیں انہیں کیوں بُرا کہتی ہیں۔ میں آپ کے سامنے ہوں، میرے ساتھ جو چاہے کریں بس اس بات پر اور بھڑک اُٹھیں۔ کہنے لگیں میں آج تمہیں گھر سے نکال کر ہی چھوڑوں گی۔ دھکے دیئے۔ میرا پاؤں مڑ گیا۔ مجھے بالوں سے کھینچتی ہوئی باہر لے آئیں۔ میں نے بہت منت کی لیکن مجھے باہر نکال دیا۔"

علیزا کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اگر تم چاہو تو ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔ تمہیں گھر واپس لے جاتے ہیں۔ تمہاری "مدر اِن لا" سے بات کرتے ہیں۔ انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ بیٹے کی غیر موجودگی میں تمہیں رات کے وقت اس طرح نکالیں۔"

"نہیں...... وہ نہیں مانیں گی اور زیادہ غصے میں آئیں گی۔ میرے ساتھ مار پیٹ شروع کر دیں گی۔"

"تو پھر کیا کرو گی؟" علیزا نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"میری ایک فرینڈ ہے یہاں پاس ہی "ڈورز برگ" میں۔ میں وہاں چلی جاؤں گی ایک دو دن وہاں رہوں گی۔ پھر توفیق آ جائیں گے۔ توفیق میرے شوہر کا نام ہے میری ساس کو پتا ہے اور توفیق کو بھی کہ میں گھر سے نکل کر کہاں جاؤں گی۔"

"تو پھر تم فرینڈ کی طرف کیوں نہیں جاتی یہاں کیوں بیٹھی ہو؟" ہادی نے سوال کیا۔

وہ ذرا توقف سے بولی۔ "بس اپنی بے بسی پر رونا آ رہا ہے۔ میرے پاس ٹیکسی کا کرایہ بھی نہیں ہے۔ کوئی چیز اپنے ساتھ نہیں لا سکی۔"

علیزا، انیسہ کی بھرپور مدد پر آمادہ تھی۔ اس نے اسے اُٹھایا اور کہا کہ وہ ان کے ساتھ چلے۔ وہ اسے اس کی فرینڈ کے گھر تک چھوڑ کر آئیں گے۔

انیسہ نے پہلے تو انکار کیا پھر علیزا کا اصرار دیکھ کر مدد لینے پر آمادہ ہو گئی۔ پاؤں کی چوٹ کے سبب اس سے چلنا محال ہو رہا تھا۔ علیزا نے اسے ایک طرف سے سہارا دے کر چلنے میں مدد دی۔ وہ تینوں اس تنگ سڑک پر چلتے ہوئے مین روڈ پر آ گئے۔ کچھ دیر بعد انیسہ کا پاؤں گرم ہو کر رواں ہو گیا اور وہ سہارے کے بغیر خود ہی قدم اُٹھانے لگی اس مرتبہ وہ ایک واٹر ٹیکسی یعنی چھوٹی کشتی پر بیٹھے۔ اس ٹیکسی پر بیٹھنے کا یہ ہادی کا پہلا اتفاق تھا۔ آبی راستے یعنی وینس کی نہریں، سڑکوں کی طرح تھیں۔ بڑی سڑکوں سے بغلی سڑکیں نکلتی تھیں اور پھر تنگ آبی گلیاں تھیں۔ ٹریفک ویسے ہی رواں تھی جیسے پختہ سڑکوں پر ہوتی ہے۔ تفریحی بجرے، بڑی بڑی آبی بسیں، آبی ٹیکسیاں چھوٹی بڑی لانچیں اور بالکل چھوٹے ڈونگے جن پر دو یا تین افراد سوار ہوتے تھے۔

انیسہ یکسر خاموش تھی۔ وہ بار بار اپنی ساڑھی کے پلو کو درست کرتی اور بال سمیٹتی تھی۔ علیزا کا دل جیسے اس کے لیے درد سے بھرا ہوا تھا۔ ہادی کو لگا کہ اگر اس وقت انیسہ کو کسی دوسرے شہر بھی لے جانا پڑتا تو شاید علیزا آمادہ ہو جاتی۔ وہ بار بار انیسہ کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی جیسے اسے سمجھانے اور حوصلہ دینے کی کوشش کر رہی ہو۔

جلد ہی وہ ایک سٹاپ پر پہنچ گئے۔ ٹیکسی کا کرایہ علیزہ نے ادا کیا پھر وہ پختہ سڑک پر چلتے ہوئے ایک رہائشی گلی میں داخل ہوئے اور ایک سہ منزلہ عمارت کے سامنے جا کر رُک گئے۔ وینس شہر کی بیشتر عمارتوں کی طرح یہ عمارت بھی قدیم طرزِ تعمیر کی تھی۔ تاہم دیگر عمارتوں کی طرح اس کی بالکونیاں بھی پھولوں سے سجی ہوئی تھیں۔ انیسہ نے دو تین بار ڈور بیل بجائی آخر پہلی منزل کی ایک کھڑکی میں روشنی نمودار ہوئی۔ کسی نے سر نکال کر باہر دیکھا پھر تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ گیا۔ یہ بھی ایک ساڑھی پوش لڑکی ہی تھی۔ اس کی جسمانی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ حاملہ ہے۔ ماتھے پر بندیا کا نشان اسے ہندو ظاہر کر رہا تھا۔ اپنے حلیے سے بھی وہ انڈین نظر آتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی انیسہ اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔

"کیا ہوا انیسو! کیا پھر لڑائی ہوئی؟" انیسہ کی سہیلی نے انگریزی میں پوچھا۔

انیسہ نے روتے روتے اثبات میں سر ہلایا۔

"بے رحم عورت!" انیسہ کی سہیلی نے دُکھی آواز میں کہا۔ پھر انیسہ کی کمر سہلاتے ہوئے بولی "اور وہ توفیق کہاں ہے؟"

"وہ باہر ہیں۔" انیسہ نے مختصر جواب دیا۔

نو وارد لڑکی اب سوالیہ نظروں سے ہادی اور علیزا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انیسہ نے مختصر لفظوں میں اسے بتایا کہ ان دونوں نے اس کی مدد کی ہے اور ٹیکسی کا کرایہ دے کر اسے یہاں لائے ہیں۔ نو وارد نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ اس نے علیزا کو کرایہ دینے کی بھرپور کوشش کی جو اس نے ناکام بنا دی۔

وہ دونوں ان دونوں سہیلیوں سے رخصت ہو کر ایک بار پھر روشنیوں سے جگمگاتے وینس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لیکن اب علیزا کے موڈ میں وہ پہلے جیسی شوخی اور ترنگ نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ بجھی بجھی سی واٹر ٹیکسی میں بیٹھی اور دلوں نئی سینٹر کی طرف چل دیئے۔

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "علیزا! کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ عورت ہی عورت کا بُرا سوچتی ہے۔ وہ جب بیوی یا بہو ہوتی ہے تو خود پر ہونے والی سختیوں کا رونا روتی ہے لیکن جب بڑی عمر میں اختیار حاصل کر لیتی ہے اور ساس وغیرہ بن جاتی ہے تو وہی کرنے لگتی ہے جسے وہ ظلم قرار دیتی تھی۔"

"میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔" علیزا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ وہ ابھی تک انیسہ کے دُکھ میں اُلجھی ہوئی تھی۔

"شاید یہ چکر ہمارے معاشروں میں زیادہ ہے۔ یعنی برصغیر میں۔" ہادی نے کہا۔

"وہی کلچر کا معاملہ ہے نا۔ ہمارے ملکوں میں عورت جب تک اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوتی۔ اسے پاؤں کی جوتی ہی سمجھا جائے گا۔ کبھی مذہب کے نام پر کبھی رسم و رواج کے نام پر اور کبھی رشتوں کے جکڑ بند سے اسے لاچار کیا جاتا رہے گا۔"

"بہرحال تھوڑی بہت تبدیلی تو اب نظر آنا شروع ہوگئی۔ہے علیزا! لڑکیوں کو تعلیم دینے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ وہ گھروں سے نکل رہی ہیں۔عملی زندگی میں قدم رکھ رہی ہیں۔بے شک ڈری ڈری ہیں، سہمی سہمی ہیں لیکن آگے تو بڑھ رہی ہیں نا۔"

"ہاں.....ایسا ہو تا رہا ہے لیکن رفتار بڑی سست ہے۔اگر آپ بُرا نہ مانیں تو سچ یہ ہے کہ عورت کے پاؤں پر کھڑے ہونے سے مرد کی حاکمیت پر زد پڑتی ہے خاص طور سے ہمارے ہاں کا مرد تو یہی سمجھتا ہے کہ عورت آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ اس کے اثر سے نکلنے اور اس کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتی ہے۔وہ اس عمل کو اپنی مردانگی کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ڈکٹیٹر بن جاتا ہے اور عورت کے پَر کاٹ کر اسے پنجرے میں کھینچنے کے لیے اپنے پورے اختیار استعمال کرتا ہے۔"

ہادی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔"لیکن علیزا! ہمیں تصویر کا بس ایک رخ ہی تو نہیں دیکھنا چاہیے۔ہم یہ بھی تو دیکھ رہے ہیں کہ جو لڑکیاں یا عورتیں برسرِ روزگار ہو جاتی ہیں وہ اپنے گھروں کی طرف سے غفلت برتنے لگتی ہیں اپنے والدین اور شوہروں کو کسی خاطر میں نہیں لاتیں۔سسرالیوں کو تنگنے میں لگنے لگتی ہیں۔بعض اوقات ان کی پوری ازدواجی زندگی درہم برہم ہو جاتی ہے۔"

علیزا نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اپنے بالوں کو پونی ٹیل میں کسا۔ایسا کرتے ہوئے اس کا سراپا مزید جاذب نظر ہو جاتا تھا۔اس کی شرٹ کا گریبان ہوا میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔وہ ذرا ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"میں اس بات سے انکار نہیں کرتی ہادی صاحب کہ کہیں کہیں ایسا ہو رہا ہے۔لیکن یہ دونوں طرف سے ہے کہیں مرد سے زیادتی ہوتی ہے کہیں عورت سے لیکن ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اس حوالے سے ایک ابتدائی مرحلے سے گزر رہے ہیں۔عورت عملی زندگی میں پہلے پہلے قدم رکھ رہی ہے۔دوسری طرف مرد کو بھی عورت کی اس آزادی کا نیا نیا تجربہ ہو رہا ہے۔دونوں ایڈجسٹمنٹ کے دور میں ہیں لیکن اگر کہیں کوئی خرابی نظر آتی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم تبدیلی کے اس پورے عمل کو ہی لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔پھر وہی سوچ اپنا لیں کہ عورت اور گائے بکری میں زیادہ فرق نہیں۔دونوں کا کام بس اپنے مالک کی خدمت کرنا ہے۔اپنی جان، اپنے گوشت اور اپنی کھال کو ان کے لیے وقف کرنا ہے اور خدمت کرتے کرتے مر جانا ہے۔"

ہادی خاموشی سے علیزا کی طرف دیکھنے لگا۔اس کے خیالات علیزا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن وہ جان بوجھ کر اختلافی بات کر رہا تھا۔وہ اسے کریدنا چاہ رہا تھا اور اسے اس میں تھوڑی بہت کامیابی ہو رہی تھی۔

دس پندرہ منٹ کی گفتگو میں ہادی کو اندازہ ہوا کہ یا تو علیزا خود شادی شدہ ہے اور اس کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں ہیں، یا پھر اس کی شادی ہونے والی ہے لیکن وہ اپنے ہونے والے شوہر اور سسرالیوں سے مطمئن نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ علیزا کی کسی بڑی بہن یا قریبی عزیزہ کی ازدواجی زندگی تلخ ہو اور ان تلخیوں نے علیزا کے اندر بھی خدشے اور بیزاریاں بھر دی ہوں۔ابھی تھوڑی دیر پہلے علیزا نے اپنی کسی شادی شدہ بہن کا ذکر بھی کیا تھا جواب بہت کم ان سے ملتی تھی۔

وہ واپس سٹی سینٹر پہنچے اب رات کا تیسرا پہر چل رہا تھا مگر گرد و پیش کی رونق میں کچھ زیادہ فرق نظر نہیں آیا تھا۔ فضا میں موسیقی کی لہریں تھیں اور رومانی مناظر پانی میں اور کناروں پر بکھرے ہوئے تھے تاہم اس لڑکی اسیہ والے واقعے کے بعد ہادی کو علیزا میں وہ خوشی اور ترنگ نظر نہیں آئی۔ان دونوں نے ایک دو تفریحات میں حصہ لیا۔ایک جگہ سے پیزا لے کر کھایا۔پھر ہادی نے محسوس کیا کہ علیزا اب واپس جانا چاہتی ہے۔وہ ایک دم خالی خالی سا ہو گیا۔ یہ لڑکی چند گھنٹوں میں ہی اس کے لیے خاصی اہم ہو گئی تھی اور اب وہ جانا چاہ رہی تھی۔

"کیا دوبارہ ملاقات ہوگی؟" ہادی نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

وہ پھیکے پن سے مسکرائی۔"اگر آپ چاہیں گے تو ہو جائے گی۔"

ہادی نے جرأت کر کے کہا۔"میں تو اس ملاقات کو اتنا لمبا کرنا چاہتا ہوں کہ تین چار ہفتے ہنسی خوشی گزر جائیں۔"

"خیر ایسا تو نہیں ہو سکتا۔پرسوں تو مجھے ویسے ہی واپس چلے جانا ہے۔"

"تو پھر جانے سے پہلے کب آئیں گی آپ؟"

"کل دوپہر کو چکر لگا لوں گی آپ کی طرف۔میں نے کیمپ دیکھ لیا ہے اور آپ کا خیمہ بھی؟"

"یہ میرا سیل نمبر بھی لے لیجیے۔اگر کوئی کنفیوژن ہو تو......"

"نہیں.....نہیں.....اس کی ضرورت نہیں۔مجھے سب یاد ہے۔میں گیارہ سوا گیارہ بجے تک پہنچ جاؤں گی۔"

صاف ظاہر تھا کہ دیگر معلومات کی طرح وہ سیل نمبرز کا تبادلہ بھی نہیں چاہتی ہادی نے فی الحال اصرار مناسب نہیں سمجھا۔وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ شیشہ صفت لڑکی ہے ذرا سے دباؤ سے چھناکے سے ٹوٹ جائے گی۔وہ اسے کسی بھی طرح دوبارہ ملنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔اگر اسے آنا تھا تو خود ہی آنا تھا۔

بڑے بس اسٹینڈ کے قریب وہ اس سے رخصت ہو گئی۔جاتے جاتے وہ مڑی اور بولی۔"صبح اپنی پٹی بدل لیجیے گا۔انفیکشن نہ ہو جائے۔"

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔علیزا کی فکرمندی کی یہ ادا اسے بھلی لگی اور اس کے دل میں امید جاگی کہ وہ کل ضرور آئے گی۔

عام ٹیکسی اور آٹو ٹیکسی کے کرائے ہوشربا تھے۔خواہ مخواہ زرِ مبادلہ ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ہادی پیدل ہی وینزیا کیمپ پلیس کی طرف روانہ ہو گیا۔تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد وہ اپنے خیمے کے اندر تھا۔وہ چٹائی پر لیٹ گیا اور خیمے کی مخروطی چھت کو گھورنے لگا۔اس کی نگاہوں میں بار بار علیزا کی شبیہ اُبھر رہی تھی۔اس کی روشن پیشانی جو اس کی دلنشیں مسکراہٹ کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔کوئی خاص بات تھی اس معصوم صفت لڑکی میں۔ورنہ وہ اس طرح کسی کے بارے میں سوچنے والا تو نہیں تھا۔اس نے اپنا نام علیزا بتایا تھا۔پتا نہیں یہ نام بھی درست تھا یا نہیں۔وہ سوچتا رہا نہ جانے اسے کب تھکاوٹ کے سبب نیند آ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو دن کافی چڑھ آیا تھا۔وینزیا کیمپ میں سرخ و سپید جوڑوں کی چہل پہل تھی۔زیادہ تر نوجوان

لڑکے لڑکیاں ہی نظر آتے تھے۔ وہ نہا نہا کر نکل رہے تھے اور نکل نکل کر نہا رہے تھے۔ کچھ ناشتہ کر رہے تھے۔ کچھ اس کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ایک علیحدہ جگہ صاف ستھرے پختہ واش روم بنے ہوئے تھے۔ ہادی نے شیو کی۔ منہ ہاتھ دھویا اور فریش ہو کر ناشتہ کرنے کے لیے ریسٹورنٹ پہنچ گیا۔ یہ ریسٹورنٹ اس کے خیمے کے بالکل پاس ہی واقع تھا۔ ناشتے کے بعد اس نے علیزا کا انتظار شروع کر دیا۔ کبھی دل کہتا تھا کہ وہ آئے گی، کبھی کہتا تھا نہیں آئے گی۔ اگر اسے آنا ہوتا اور ایک دم چھپانا پھرانا ہوتا تو کم از کم اپنا کوئی کنٹیکٹ تو اسے دیتی۔

وہ ادھر اُدھر گھومنا چاہ رہا تھا۔ بگ بیم تلے خیموں کے اس شہر کا نظارہ کرنا چاہتا تھا مگر یہ ڈر تھا کہ کہیں علیزا خیمہ خالی دیکھ کر واپس نہ چلی جائے۔

وہ واپس خیمے میں آ گیا اور ادھر اُدھر بکھری اشیا درست کرنے لگا۔ گاہے بگاہے اس کی نگاہ اپنی ریسٹ واچ کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔ پورے سوا گیارہ بج گئے تو وہ اٹھ کر خیمے سے باہر آ گیا۔ یہی وقت تھا جب کوئی اس پر جھپٹا اور ساتھ ہی زوردار نسوانی آواز سنائی دی۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا اور گرتے گرتے بچا۔ یہ علیزا تھی۔ وہ خیمے کے در کے پاس ہی موجود تھی اور اس نے ہادی کو کامیابی سے ڈرا دیا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی۔ اس کا چہرہ گلنار تھا۔

ہادی کھسیانے انداز میں ہنسا۔ علیزا کے ڈرانے پر جب وہ پیچھے ہٹا تو اس کا ہاتھ لکڑی کے ایک پول سے ٹکرا گیا تھا۔ اس کی زخمی کلائی پھر دُکھ گئی۔ اس نے ذرا تکلیف محسوس کی۔ علیزا نے فوراً یہ بات نوٹ کی۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔

"اوہو..." اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور وہ ہادی کی کلائی پر جھک گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ہادی کا ہاتھ دبایا۔ "اوہ...... سوری ایم ویری سوری...... میں نے آپ کی کلائی دُکھا دی۔ تکلیف ہو رہی ہے آپ کو؟"

"نہیں...... کچھ زیادہ نہیں۔" ہادی نے کہا۔

"ویسے آپ بہت بُرے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ سویرے سب سے پہلے یہ پٹی بدلیں۔ یہاں ہوا میں رطوبت ہوتی ہے۔ انفیکشن کا خطرہ ہو سکتا ہے۔"

وہ ہادی کو کھینچ کر خیمے کے اندر لے آئی۔ خیمے کی ایک پاکٹ میں مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ اس نے فوراً پٹی کھولی۔ وہ ذرا چپکی ہوئی تھی۔ ہائیڈروجن کے استعمال سے اس نے پٹی کو زخم سے علیحدہ کیا۔ پھر کاٹن کے استعمال سے اچھی طرح زخم کو صاف کیا اور آئنٹمنٹ لگا کر دوبارہ پٹی باندھ دی۔

یہ کام اس نے بڑے انہماک سے کیا۔ اتنے انہماک سے کہ اسے ہادی کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ علیزا کا لمس، اس کا محبت بھرا انداز، اس کی فکر مندی، یہ سب کچھ مل کر ہادی پر عجیب سا اثر کر رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں ان لمحوں میں ہادی کا دل چاہا کہ اس کا زخم شدت میں زیادہ ہوتا اور وہ دیر تک بند خیمے میں اسی طرح اسے اپنی انگلیوں کے مہربان لمس سے نوازتی رہتی۔

ہادی نے اس کے لیے ناشتہ منگوانا چاہا لیکن اس نے بتایا کہ وہ ناشتہ کر کے گھر سے چلی تھی۔ کیونکہ سیر و تفریح کا

یہ قیمتی وقت کہیں بیٹھ کر ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ استعمال کی عام چیزیں مثلاً کیمرا، ٹیلی اسکوپ، چھتری اور تھرماس وغیرہ لے کر کیمپ پلیس سے نکلے اور وینس کی سڑکوں پر آ گئے۔ علیزا کے ہاتھوں میں ایک نقشہ بھی تھا جس سے وہ گاہے بگاہے مدد لے رہی تھی۔ گرمی توقع سے کچھ زیادہ تھی۔ موسم کی مناسبت سے علیزا نے گہرے رنگ کی ہاف سلیو شرٹ اور سفید پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے بال ایک خوبصورت ربن سے بندھے تھے۔ اس کے پاس شرٹ کا ہم رنگ شولڈر بیگ تھا۔ دھوپ کے سیاہ چشمے میں اس کے چہرے کی رنگت کچھ اور نکھری نظر آئی۔

ان دونوں نے قریبی سٹاپ پر پانچ نمبر بس کا انتظار کیا۔ اس میں زیادہ تر سیاح ہی ٹھسے ہوئے تھے۔ آج چھٹی کے دن یہ سب لوگ وینس کے گلی کوچوں میں آوارہ منڈلانا چاہتے تھے۔ پتا نہیں کیوں آج ہادی ایک ٹین ایجر لڑکے کی طرح سوچ رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آج پھر بس میں بہت رش ہو اور اسے علیزا کے ساتھ کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑے۔ ایسی صورت میں وہ علیزا کی قربت کو زیادہ شدت سے محسوس کر سکتا تھا۔

ہادی کی یہ تمنا پوری ہوئی اور انہیں ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا لیکن کچھ دیر بعد علیزا ایک ادھیڑ عمر خاتون سے اس طرح باتوں میں مصروف ہوئی کہ آخر تک اس نے ہادی کی طرف رُخ نہیں پھیرا۔ وہ اپنے آپ میں کو مست رہا۔ بس پر وینس کے پرفیوم کی خوشبو علیزا کے جسم سے اُڑ اُڑ کر ہادی تک پہنچتی رہی۔ بس کی "نیک دل" لیڈی ڈرائیور نے بھی شاید ہادی کی اس کڑھن کو محسوس کر لیا۔ سفر کے آخری مرحلے میں اس نے ایک جگہ اتنے زور سے بریک پیڈل دبایا کہ علیزا تقریباً ہادی کے اوپر ہی آن گری۔ ہادی چند سیکنڈ کے لیے اس کے جسم کے گداز اور خوشبو میں ڈوب سا گیا۔ ہادی خود ایک معمر اطالین خاتون کی آغوش میں گرتے گرتے بچا تھا۔

"ویری سوری۔" علیزا نے کہا۔ چہرہ گلنار ہو رہا تھا۔ (مخاطب ہادی تھا)

معمر خاتون مسکرائی اور علیزا کی طرف دیکھ کر شرارت سے بولی۔ "کوئی بات نہیں...... میرے خیال میں تو تمہارے اس بوائے فرینڈ کو تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔"

علیزا کا چہرہ کچھ اور بھی سرخ ہو گیا۔ تاہم اس نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معمر خاتون کے اس مذاق کا کوئی جواب نہیں دیا اور بس سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ لوگ مین بس اسٹینڈ پر اترے اور پھر وہاں سے پیدل ہی ایک آبی سڑک کے کنارے کنارے چل دیئے۔ علیزا چہک رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اسی جگہ سے گزرے جہاں کل رات تھیسا نامی لڑکی سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ دور سے اس باغیچے کی سیڑھیاں نظر آئیں جس پر وہ کل شب بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔ علیزا ایک دم پھر بجھ سی گئی۔ ہادی نے صاف محسوس کیا اس کی پیشانی کی غیر معمولی چمک کسی دھند کے میں کھو گئی ہے۔

ہادی اس کا موڈ مزید خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ خود ہی ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "اللہ کرے وہ خیریت سے ہو اور خیریت سے گھر واپس چلی جائے۔"

"ہاں اچھی لڑکی لگتی تھی۔ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس کے شوہر کو اس کے لیے اسٹینڈ لینا چاہیے۔"

"دل تو چاہتا تھا کہ پھر اس سے ملیں لیکن اب اتنا وقت ہی نہیں ہے۔" وہ اپنی رسٹ واچ دیکھ کر بولی۔

ہادی نے اس کی تائید کی۔ اب وہ ایک کشادہ نہر کے کنارے تھے۔ اس کو وینس کی شاہراہوں میں سے ایک شاہراہ کہا جا سکتا تھا۔ یہاں بڑی بڑی آبی بسیں اور بجرے وغیرہ تیر رہے تھے۔ وہ مشہور زمانہ کشتیاں بھی تھیں جنہیں گنڈولا یا وینز ٹیکسی کہا جاتا ہے۔ انہیں ایک لمبے چپو سے چلایا جاتا ہے۔ چلانے والے نے ایک خاص دھاری دار شرٹ اور ہیٹ زیب تن کر رکھا ہوتا ہے۔ ان وینز ٹیکسیوں یا "گنڈولاز" کا کرایہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہادی اور علیزا نے ان کی طرف رخ نہیں کیا۔ علیزا نے بتایا کہ وینس کا مقبول ترین ذریعہ آمد و رفت ACTV سروس ہے۔ اس سروس میں چھوٹی بڑی کشتیاں، پانی کی بسیں اور کرائے پر دی جانے والی کشتیاں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے بھی ACTV کی ایک بس کے ذریعے ہی سفر کیا اور ریالٹو سے کچھ فاصلے پر اتر گئے۔ نہروں کا جال تھا اور ان پر محرابی پل بنے ہوئے تھے۔ یہاں لوگوں کا اژدھام تھا۔ کئی لوگ ساز بجا رہے تھے۔ بہت سے کھا پی رہے تھے۔ یہاں وہاں بے فکر ٹولیوں کی شکل میں بیٹھے دلچسپ مصروفیات اپنائے ہوئے تھے۔ سامنے ہی دو نوجوان دوست ایک پل کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے ان کے گرد کچھ تماشائی موجود تھے۔ دونوں دوست شرط لگا کر کھیل رہے تھے۔ کھیل بیہودہ لیکن دلچسپ تھا۔ وہ دونوں تھوک رہے تھے اور دیکھنا یہ تھا کہ کس کا تھوک زیادہ دور جاتا ہے۔

علیزا نے بُرا سا منہ بنایا۔ وہ چلتے رہے اور تصویریں کھینچتے رہے۔ کبھی علیزا ہادی کی تصویر کھینچتی کبھی وہ اس کی۔ لیکن دونوں کی تصویریں ان کے اپنے اپنے کیمروں میں تھیں۔ دونوں کی اکٹھے کوئی تصویر نہیں کھنچی تھی۔ ایک مرتبہ بے خیالی میں ہادی نے اپنے کیمرے سے علیزا کی تصویر کھینچنا چاہی، تو وہ ایک دم بدک سی گئی۔ "نو...... نو......" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور رُخ دوسری طرف پھیر لیا۔

"سوری۔" ہادی نے کہا اور ایک دم بجھ سا گیا۔

"فروٹ کھائیں گے؟" کچھ آگے جا کر علیزا نے ہادی کو آفر کی اور پھر اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک ریڑھی کی طرف لپک گئی۔ اس خوبصورت ریڑھی پر شیشے کا بڑا بکس تھا اور اس میں مختلف قسم کا کٹا ہوا پھل پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں بھرا گیا تھا۔ چند ٹکڑے سیب کے، چند خربوزے کے، تھوڑی سی ناشپاتی، تھوڑا سا تربوز، دو چار دانے کالے انگور کے۔ ایک چھوٹا گلاس ڈھائی یورو میں آیا۔ سالم پھل کے مقابلے میں یہ کافی مہنگا تھا۔ علیزا نے ایک گلاس ہادی کو تھما دیا۔ ہادی نے تھوڑا سا کھایا۔ پھر ہاتھ روک لیا۔ گلاس ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سامنے کھڑے غبارے والے کی طرف متوجہ تھا۔ بہت بڑے بڑے رنگ برنگے غبارے تھے۔ خریدار بچے ارد گرد جمع تھے۔

"کیا بات ہے؟ آپ کھا نہیں رہے؟" علیزا نے اداسے پوچھا۔ "کیا اچھا نہیں لگا؟"

"اچھا تو ہے...... لیکن ذرا ٹھہر کے کھاؤں گا۔"

"کیا بات ہے۔ آپ چپ سے ہو گئے ہیں؟" وہ ہولے سے مسکرائی۔

"کوئی خاص بات نہیں...... بس سوچ رہا تھا کہ کل آپ تو چلی جائیں گی۔ میں اکیلا یہاں گھوم رہا ہوں گا۔ اس

وقت گھومنا کیسا لگے گا۔"

وہ کچھ دیر گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ تب اس نے نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبایا اور اس کی پیشانی پر مسکراہٹ چمکی۔ "میرا خیال ہے کہ آپ کو بُرا لگا ہے۔"

"کیا بُرا لگا ہے؟" ہادی کا دل دھڑک اُٹھا۔

"یہی جو میں نے آپ کو فوٹو بنانے سے منع کر دیا۔"

ہادی نے انگلیاں چلا کر اپنے بالوں کو پیشانی سے ہٹایا اور دور پانی پر ڈولتی خوش رنگ کشتیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "بُرا نہ مانیے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں کوئی گرہ کٹ ہوں اور میرے ساتھ چلتے ہوئے آپ ہر وقت اپنی جیب پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"وہی جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ آپ کو اپنے بارے میں کچھ بھی بتانا پسند نہیں۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں ایک لڑکی کے ساتھ نہیں ایک پہیلی کے ساتھ چل پھر رہا ہوں اور یہ پہیلی میرے ذہن کو ہر وقت تناؤ میں رکھ رہی ہے۔"

اس نے ہونٹ سکوڑے "تو آپ میرے ساتھ نہیں ایک "تناؤ" کے ساتھ گھوم پھر رہے ہیں۔"

"ایسا ہی سمجھ لیں۔"

"تو پھر اس تناؤ کا کیا حل ہو؟" اس کا لہجہ اب سپاٹ تھا۔

"جوں جوں وقت گزرے گا یہ تناؤ بڑھتا جائے گا۔ بہتر ہے کہ اسے مزید نہ بڑھایا جائے۔ اگر آپ آج اکیلے گھومنا پھرنا چاہتی ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔"

اس نے غور سے ہادی کو دیکھا۔ کچھ دیر چپ رہی پھر بولی۔ "ٹھیک ہے ہادی صاحب اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔"

ہادی کے سینے پر گھونسہ سا لگا۔ لیکن اب تو تیر کمان سے نکل ہی چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اب یہ "خوبصورت ساتھ" اسے آناً فاناً چھوڑنا پڑے گا۔ تب وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "اور آپ؟"

"میں ابھی یہیں رُکوں گی، اچھی جگہ ہے...... یہاں چھاؤں ہے اور ہوا بھی آ رہی ہے۔" اس کا لہجہ اجنبیت لیے ہوئے تھا۔

وہ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔ "ٹھیک ہے میں بہت مشکور ہوں کہ آپ نے کچھ اچھا وقت گزارنے کا موقع دیا اور مجھے یہاں گائیڈ بھی کیا......"

اگر ہادی کا خیال تھا کہ وہ کچھ بولے گی تو ایسا نہیں ہوا۔ وہ بس سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہ گئی، چہرے پر سنجیدگی تھی۔

ہادی نے اپنا شولڈر بیگ کندھے سے جھلایا، کیمرا اُٹھایا، دو تین رسمی کلمات ادا کیے اور چل پڑا۔ پتا نہیں کیوں ہادی کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے آواز دے گی، بلائے گی۔ لیکن اس نے آواز نہیں دی۔ وہ چلا آیا۔ پندرہ بیس

قدم آگے گیا تھا کہ اس کے کان کے پاس ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ وہ بدک کر رہ گیا۔ بلکہ ایک خوانچہ فروش پر گرتے گرتے بچا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ علیزا تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پھٹا ہوا سرخ غبارہ تھا۔ اسی غبارے کی آواز نے ہادی کو سرتا پا دہلایا تھا۔ علیزا اب ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھی۔ اس نے جھک کر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لیے تھے۔ چہرہ سرخ تر ہوتا جا رہا تھا۔ اردگرد کھڑے تماشائی بھی علیزا کی اس شرارت پر مسکرا رہے تھے شاید ان میں سے کچھ کا خیال تھا کہ علیزا کی شرارت کے جواب میں اب وہ بھی کوئی شرارت کرے گا۔ مگر ہادی ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔

ہادی کا شولڈر بیگ کندھے سے کھسک کر گر گیا تھا۔ ہادی نے اسے دوبارہ کندھے پر ٹکایا۔ ہنس ہنس کر علیزا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اب وہ ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر ایک دم اس نے ہادی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''ویری سوری! آئی ایم رئیلی ویری سوری ہادی صاحب! خود مجھے بھی پتا نہیں تھا کہ غبارے سے اتنی زور کی آواز نکلے گی۔''

پھٹے ہوئے غبارے سے بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کافی بڑا تھا۔ علیزا نے اسے اپنی ہیئر پن کے ذریعے پھاڑا تھا۔ ہیئر پن ابھی تک اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ اس نے ایک بار پھر لجاجت سے ہادی کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ انداز ایسا تھا کہ ہادی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ بولا۔ ''میں نے صحیح کہا تھا نا کہ آپ ایک ''پہیلی لڑکی'' ہیں۔''

''میں شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کیوں...... مجھے ایک دم آپ پر بہت غصہ آ گیا تھا۔ بہر حال میں ایک بار پھر غیر مشروط معافی چاہتی ہوں۔''

ہادی جب بدکا تو لڑکھڑا کر خود خوانچا فروش سے ٹکرایا تھا۔ اس کی ٹیلی اسکوپ کا ایک ڈھکنا بھی اتر کر نہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ علیزا نے یہ ڈھکنا ڈھونڈنے میں ہادی کی مدد کی اور پھر خوانچا فروش کی ایک چوبی چوکی کے نیچے سے ڈھکنا ڈھونڈ نکالا۔

وہ دونوں قریب ہی ایک پل کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ علیزا بار بار اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس دوران میں اس نے ایک دو بار پھر معذرت کے الفاظ بھی استعمال کیے۔ آخر ہادی نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''معذرت کا عملی مظاہرہ تو آپ اس طرح کر سکتی ہیں کہ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔ کس ستارے سے تشریف لائی ہیں آپ؟ کیا چیز ہیں اور کیونکر ہیں؟''

''اس سے آپ کو کوئی خاص فرق نہیں پڑنے والا۔'' وہ اپنی کلائی کے چمکیلے بینگل کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔

''لیکن ہو سکتا ہے کہ آپ کو پڑ جائے۔ میرا کوئی ناچیز مشورہ یا تجویز آپ کے لیے فائدہ مند ثابت ہو جائے۔''

''تو آپ نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ واقعی میرے کوئی مسئلے مسائل ہیں۔''

''بس میری چھٹی حس کہتی ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ انوکھا ضرور ہے اور آپ جو اس طرح اکیلی شہر میں گھوم رہی ہیں تو اس کے لیے کوئی خاص وجہ کوئی اُلجھن ہے۔''

''آپ سیدھی طرح نفسیاتی اُلجھن کیوں نہیں کہتے۔ کوئی ذہنی صحت کا مسئلہ۔'' وہ مسکرائی۔

''میں یہ جسارت نہیں کر سکتا لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے جو حرکت فرمائی ہے تو اس کے بعد تو یہ کہا بھی جا سکتا ہے۔'' ہادی نے بھی ہلکے پھلکے انداز میں جواب دیا اور وہ مسکرانے لگی۔

''دراصل مجھے بہت غصہ آیا تھا جب آپ اس طرح اچانک منہ پھیر کر چل پڑے تھے۔''

''مجھے بھی بہت آیا تھا جب آپ نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا کہ میں جانا چاہوں تو جا سکتا ہوں۔''

''چلیں دونوں اپنا اپنا غصہ تھوک دیتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ کس کا غصہ زیادہ دور جا کر گرتا ہے۔'' اس نے کہا اور دونوں بے ساختہ ہنس دیے۔

کچھ دیر بعد ہادی دوبارہ اصل موضوع پر آ گیا۔ ''پھر کچھ بتائیں گی آپ؟''

''چلیں...... ٹھیک ہے... اگر آپ کا اصرار ہے تو...... لیکن کہیں بیٹھ کر بات کریں گے۔ یہاں تو شور ہے اور دیکھیے بہت سے لوگ بھی تاڑ رہے ہیں۔ وہ سامنے غبارے والا بھی انتظار کر رہا ہے کہ شاید اس کا ایک اور غبارہ بک جائے۔''

دونوں مسکرا دیے۔ ہادی نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اوکے..... تو پھر گھوم پھر لیں تھوڑا سا؟''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ''لیکن میں بتاؤں گی تو پھر آپ کو بھی اپنے بارے میں بتانا پڑے گا۔''

''میں نے کب انکار کیا ہے؟'' ہادی نے کہا۔

وہ دونوں ایک بار پھر خوشگوار ہوا کے جھونکوں کو محسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ تفریحی موڈ میں تھے۔ علیزا میں وہ کھلنڈرا پن ایک بار پھر لوٹ آیا تھا جس کا تجربہ ہادی نے کل رات کیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ریالٹو کے علاقے میں تھے۔ پاکستان سے روانگی کے وقت ہادی کے ایک دوست نے کہا تھا کہ اگر وینس جا کر اس نے ریالٹو اور مارکو وغیرہ نہ دیکھے تو سمجھو کہ آدھا وینس Miss کر دیا۔ یہ واقعی دلکش جگہ تھی۔ گنجان علاقے سے گزرتے ہوئے ایک دلکشادگی کا احساس ہوا۔ ایک بہت بڑا قدیم پل جسے ''ریالٹو برج'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ان کے سامنے تھا۔ اس کے نیچے سے شاید وینس کی سب سے بڑی شاہراہ گزرتی تھی لیکن یہ تارکول کی نہیں پانی کی سڑک تھی۔ اس پر ACTV کی بڑی بڑی آبی بسیں چل رہی تھیں اور ہر طرح کا ٹریفک رواں تھا۔ اس شاہراہ کے دونوں کناروں پر وینس کی قدیم عمارتوں کا نظارہ دیدہ زیب تھا۔ سیاح یہاں ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ سینکڑوں لوگ مسلسل تصویر کشی اور وڈیوز وغیرہ بنانے میں مصروف تھے۔ دھوپ تھی اور آبی بخارات کی وجہ سے گرمی بھی کچھ زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک شاپنگ مال میں گھس گئے اور ونڈو شاپنگ کرنے لگے۔ علیزا نے ایک خوبصورت اطالوی ہیٹ خریدا۔ یہاں چیزیں مہنگی لیکن کوالٹی میں بہتر تھیں۔ ہادی کو ایک پارکر قلم بہت پسند آیا۔ یہ دراصل ایک فونٹین پین اور ایک بال پوائنٹ کا Set تھا۔ مگر قیمت ہوشربا تھی۔ وہ چھوٹی موٹی چیزیں خریدتے آگے بڑھ گئے۔ ان میں کی رنگ، کچھ دستی پنکھے تھے اور اس طرح کے دیگر سووینیرز تھے۔ پنکھے بڑے دیدہ زیب تھے۔ علیزا نے خوش رنگ ہیٹ پہن کر دستی پنکھا

اپنے چہرے کے سامنے ہلایا اور بولی۔

"میں خود کو ایک دم میڈ ان چائنہ محسوس کر رہی ہوں۔"

"آپ کے محسوس کرنے سے کیا ہوگا۔ آپ ایسی ہیں ہی۔"

ان تعریفی کلمات پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی لیکن اس کے علاوہ وہ کچھ نہیں کہا۔ غالباً اس موضوع کو مزید طول دینا نہیں چاہتی تھی۔

بازار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ کچھ تھک گئے تھے۔ ایک جگہ پتھریلے بنچ پڑے نظر آئے۔ یہاں چھاؤں بھی تھی۔ وہ بیٹھ گئے اور آئس کریم کھانے لگے۔ اچانک علیزا کو یاد آیا کہ اسے اپنی ایک بھانجی کے لیے ایک خاص طرح کا دستی پنکھا لینا ہے۔ وہ اٹھ کر دوبارہ شاپنگ مال کی طرف چلی گئی۔ ہادی وہیں بیٹھا آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا رہا۔ اس بازار کو دیکھ کر اسے "انار کلی" جیسے پاکستانی بازار یاد آ گئے۔ جو ہر قسم کے سامان سے بھرے رہتے ہیں۔ دکانوں کے آگے سٹال اور سٹالوں کے آگے ٹھیلے۔ شاپنگ مال کی نسبت یہاں اشیاء مناسب داموں مل رہی تھیں۔

علیزا کو گئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس کی چھتری، کیمرا اور شاپنگ والا لفافہ بھی ہادی کے پاس ہی پڑا تھا۔ "کہاں چلی گئی؟" ہادی نے سوچا۔

چار پانچ منٹ مزید انتظار کرنے کے بعد وہ اشیاء سمیت کر اپنی جگہ سے اٹھا اور واپس شاپنگ مال کی طرف بڑھا۔ ایک دستی پنکھے کے لیے اس نے اتنی دیر لگا دی تھی۔ ابھی وہ پندرہ بیس قدم ہی چلا تھا کہ اس کی نگاہ علیزا پر پڑ گئی۔ وہ بازار کے موڑ پر موجود تھی۔ شاپنگ پلازہ کے ایک گول ستون کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ اس کے پاس اس کی ایک ہم عمر لڑکی تھی۔ لڑکی نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ وہ درمیانی شکل و صورت کی تھی بلکہ تھوڑی سی رعایت کے ساتھ قبول صورت بھی کہی جا سکتی تھی۔ اس کے چہرے کی سب سے نمایاں چیز اس کی کھڑی لمبی ناک تھی۔ وہ دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ علیزا نے دو تین بار تیزی سے انکار میں سر ہلایا۔ پھر لمبی ناک والی لڑکی نے اپنے شولڈر بیگ میں سے کوئی چیز نکالی اور علیزا کو تھما دی۔ یہ کوئی کاغذ تھا۔ علیزا نے اسے احتیاط سے اپنے بیگ کے اندرونی خانے میں رکھ لیا۔

علیزا کافی جلدی میں لگتی تھی۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ اب اسے خدا حافظ کہہ کر واپس آنے والی ہے۔ ہادی بھی واپس مڑا اور پتھریلے بنچوں کی طرف چلا آیا۔ پاس ہی ڈیکوریشن پیسز کی ایک شاندار دکان تھی۔ وہ اس کے "ڈسپلے" میں جھانکنے لگا۔

اسی دوران میں علیزا واپس آ گئی۔ "ہیلو ہادی صاحب! آپ کیا کر رہے ہیں؟"

ہادی نے چونکنے کی اداکاری کی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "بھئی بڑی دیر کر دی آپ نے دستی پنکھا خریدنا تھا یا ایئر کنڈیشنر۔"

وہ بچکانے انداز میں مسکرائی۔ "خریدا تو پنکھا ہی ہے لیکن جیسا چاہتی تھی ویسا نہیں ملا۔" اس نے چائنیز طرز کا ایک کثیر رنگی پنکھا ہادی کو دکھایا۔

"آپ خواتین کی ہمت ہے بھئی بازاروں میں تھکن سے بے ہوش ہو جاتی ہیں لیکن ہوش میں آنے کے بعد پھر گشت شروع کر دیتی ہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لڑکی کا ذکر بھی نہیں کیا جس سے وہ ابھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک بار پھر کچھ بجھی ہوئی نظر آ رہی تھی ہادی نے بھی کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

وہ دونوں ریالٹو کی بارونق وسعت میں گھومنے لگے۔ وہ ایک بڑی سی قدیم بلڈنگ کے سامنے بنچ پر رک گئے۔ یہ انگریزوں کے زمانے سے تعلق رکھتی تھی۔ یہاں ریالٹو کی تاریخ بزبان انگلش دیواروں پر کندہ تھی۔ وہ گھومتے رہے اور مختلف آثار دیکھتے رہے۔ ساتھ ساتھ تھوڑی بہت گفتگو بھی ہوتی رہی۔ اس گفتگو سے صرف اتنا پتا چلا کہ علیزا روم میں (جسے وہ روما کہہ رہی تھی) شمالی جانب Cassia t کی کسی علاقے میں رہتی ہے۔ ہادی نے تفصیلاً پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ تفصیل سے بات کرنے کا وعدہ تو علیزا خود ہی کر چکی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ کسی پرسکون جگہ پر بیٹھ کر لنچ کریں گے اور باتیں بھی لیکن پتا نہیں کیوں کسی وقت ہادی کو لگتا تھا کہ وہ تذبذب میں ہے۔ جیسے سوچتی ہو کہ وہ بات کرے یا نہیں۔

یہاں پاس ہی کہیں تاریخی نوعیت کی مچھلی مارکیٹ بھی تھی۔ شور وغیرہ تو سنائی دے رہا تھا اور مچھلیوں کی باس بھی محسوس ہوتی تھی مگر مارکیٹ نظر نہیں آئی۔ وہ وینس کے قدیم دلکش گلی کوچوں میں گھومتے رہے۔ چکراتے رہے اور پھر "مارکو" کی طرف نکل آئے اس قدیم عبادت گاہ کی کشش نے علیزا کی ساری توجہ کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ وہ اس عمارت کا دیدار کر رہی تھی اور ہادی چپکے چپکے اس کا۔ وہ کسی بچے کی سی بے مہار ترنگ کے ساتھ ان در و دیوار میں کھوئی تھی۔ ہادی کا دل چاہا کہ وہ چپکے سے اس کی ایک تصویر اتار لے اس نے اپنے گلے میں آویزاں کیمرے کا رُخ غیر محسوس طور پر علیزا کی طرف کیا اور بٹن دبا دیا۔ فلیش آن نہیں تھا اس لیے علیزا کو کچھ خبر نہیں ہوئی۔ بہرحال یہ ایک رسک تھا۔ علیزا کو پتا چل جاتا تو خبر نہیں کہ اس کا ردعمل کیا ہوتا۔ ہادی کو یہ بھی پتا نہیں تھا کہ تصویر کیسی آئی ہوگی اور آئی بھی ہوگی یا نہیں۔ لیکن وہ دوبارہ کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

علیزا نے کہا۔ "آپ کو پتا ہے اس جگہ کا پورا نام کیا ہے؟" ہادی نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولی (Besilica of San Marko) اور یہ جو سامنے چرچ نظر آ رہا ہے نا اس کی تعمیر 828ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر کی کہانی بھی بڑی مزیدار ہے۔ آپ نے سنی ہوئی ہے؟"

"نہیں۔"

"اُف ... مجھے تو لگ رہا ہے کہ آپ آنکھوں پر پٹی باندھ کر وینس میں گھوم رہے ہیں۔ بندۂ خدا جس شہر کی سیاحت فرمانی ہو پہلے اس کے بارے میں تھوڑا بہت پڑھنا چاہیے۔"

"آئندہ خیال رکھوں گا میم!" ہادی نے کہا۔ حالانکہ وہ کہنا چاہتا تھا کہ آنکھوں پر پٹی تو آپ کی وجہ سے بندھ گئی ہے محترمہ۔

وہ مسکرائی اور بولی۔ "مارک نام کے بہت بڑے عیسائی بزرگ تھے۔ روایت کے مطابق وہ اسکندریہ میں رہتے

تھے۔ ایک فرشتے نے سینٹ مارک کو بتایا تھا کہ مرنے کے بعد ان کی آخری آرام گاہ وینس نام کے ایک شہر میں ہوگی جس میں ہر طرف نہریں بہتی ہوں گی۔ حالانکہ اس وقت وینس شہر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ صدیوں بعد جب وینس نے ایک بھرے پُرے شہر کا روپ دھارا تو وہاں کے باسیوں کو سینٹ مارک کی پیش گوئی یاد آئی۔ انہوں نے پختہ ارادہ کیا کہ وہ سینٹ مارک کے جسدِ خاکی کو اسکندریہ یعنی مصر سے لا کر وینس میں دفن کریں گے۔ وینس کے کچھ تاجروں نے یہ خطرہ مول لیا اور سینٹ کی لاش کو اسکندریہ سے اسمگل کر کے وینس پہنچا دیا۔ تب یہاں یہ شاندار مقبرہ تعمیر کیا گیا اور دوسری عمارات بنا دی گئیں۔"

شاندار گنبدوں، اور دروازوں والی یہ عمارت ہادی کو بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے داخلی دروازے پر چار بہت بڑے گھوڑوں کے کلاسیکل مجسمے نصب تھے۔ مگر ان سارے مناظر سے زیادہ دلچسپی ہادی کو اس بات میں تھی کہ وہ جلد از جلد کہیں بیٹھ کر لنچ کریں اور علیزا اسے اپنے بارے میں بتائے۔

اب سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہادی کی گھڑی ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھی۔ ہادی کو بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ بھوک یقیناً علیزا کو بھی لگی ہوگی مگر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جلدی کھانا نہیں چاہتی۔ یا پھر وہی تذبذب والی بات تھی۔ وہ اس کشمکش میں تھی کہ ہادی کو اپنے بارے میں کچھ بتائے یا نہیں۔ ہادی غور سے دیکھتا تھا تو یہ کشمکش اس کے چہرے پر بھی نظر آتی تھی۔

آخر ایک ریسٹورنٹ پر دونوں کی نگاہ پڑ ہی گئی۔ علیزا بولی۔ "چلیں پھر یہیں بیٹھتے ہیں۔"

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ ایک پیزا شاپ تھی۔ اٹلی کا پیزا پوری دنیا میں مشہور ہے لیکن علیزا اور ہادی کے سامنے حلال حرام کا مسئلہ بھی تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس عام سی بنگلہ دیشی پیزا شاپ میں بیٹھنا مناسب سمجھا۔ علیزے یہاں آرڈر پر تیار کیا جاتا تھا۔ آرڈر دینے کے بعد وہ دونوں میز کے مقابل کناروں پر خاموش بیٹھ گئے۔ علیزا کی اندرونی کشمکش اس وقت عروج پر نظر آتی تھی۔ ایک دو بار اس نے ہادی کی طرف دیکھا پھر نگاہیں جھکا لیں۔ کچھ کہنے کے لیے ہونٹوں کو حرکت دی مگر پھر ہونٹوں پر بس زبان پھیر کر رہ گئی۔

"ہاں جی کچھ کہیے گا یا پھر اسی طرح بس سٹارٹ ہی لیتی رہیں گی؟"

"کیا کہوں؟" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ منمنائی۔

"جو بھی آپ کے دل میں آئے اور جو آپ اپنی خوشی سے بتا سکیں۔"

"چلیں..... پہلے آپ بتائیں۔" وہ خشک گلے کے ساتھ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں بتا دیتا ہوں۔ پوچھیں آپ کیا جاننا چاہتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے آپ تھوڑا سا کچھ پی لیں۔"

"بس..... سادہ پانی پلا دیجیے۔"

پیاس تو ہادی کو بھی لگ رہی تھی اور سادے پانی کو ہی دل چاہ رہا تھا۔ اس نے ویٹر کو آواز دی۔ مگر حسبِ اندیشہ ان لوگوں کے پاس صرف کوک اور لائم جوس وغیرہ تھے۔ سامنے سڑک کے پار ایک سٹور نظر آ رہا تھا وہاں منرل واٹر کی

بوتلیں موجود تھیں۔ "ابھی آیا" ہادی نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

سڑک پار کر کے وہ جنرل سٹور تک پہنچا۔ منرل واٹر کی دو بوتلیں لیں دو جوس لیے اور لہسن کی چٹنی جو پیزا کے ساتھ بہت اچھی لگتی تھی۔ جب وہ کاؤنٹر پر ادائیگی کرنے لگا تو کیش مشین میں کچھ خرابی ہو گئی۔ مشین کے ٹھیک ہونے میں چار پانچ منٹ لگ گئے۔ ہادی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ کاؤنٹر پر اس کا نمبر چوتھا تھا ادائیگی کر کے اور سڑک پار کر کے وہ پیزا شاپ میں داخل ہوا تو ٹھٹک گیا۔ علیزا میز پر نہیں تھی۔ پہلا خیال اس کے ذہن میں یہی آیا کہ وہ شاید واش روم تک گئی ہوگی۔ مگر جب دھیان سے دیکھا تو اس کے سینے میں ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ علیزا کا شولڈر بیگ جو میز پر رکھا تھا وہاں نہیں تھا۔ نہ ہی کیمرا، نہ ہی وہ شاپرز جن میں اس کی شاپنگ موجود تھی۔ فقط ہادی والا شولڈر بیگ اور شاپر ایک خالی کرسی پر موجود تھے۔ "تو وہ چلی گئی؟" یہ خیال ایک زہریلے تیر کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

وہ تیزی سے مڑا۔ پیزا شاپ سے باہر آیا۔ فٹ پاتھ پر دائیں بائیں دور تک دیکھا۔ قریبی دکانوں کے اندر جھانکا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ تب وہ دوبارہ پیزا شاپ کی طرف پلٹ آیا۔ دل میں اُمید تھی کہ شاید وہ دوبارہ میز پر موجود ہو اور مسکراتے ہوئے کہے۔ سامنے گفٹ شاپ تک گئی تھی۔

لیکن وہ نہیں تھی۔ کہیں نہیں تھی۔ وہ شاید جا چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ ہادی کو شدید تذبذب میں دکھائی دی تھی۔ کبھی لگتا تھا کہ ایک قریبی دوست کی طرح سب کچھ ہادی سے گوش گزار کر دے گی، کبھی محسوس ہوتا تھا کہ کچھ نہیں بتائے گی اور یونہی پہلو بدلتی رہے گی۔ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتی رہے گی۔ پہلا امکان درست ثابت ہوا تھا۔ اسے موقع ملا تھا اور وہ اچانک چلی گئی تھی۔

ہادی قریباً ایک گھنٹے تک وہیں بیٹھا رہا۔ بڑے سائز کا اٹالین پیزا آ گیا جس پر "موٹلی" کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ میں لہسن کی چٹنی بھی موجود تھی۔ مگر اب ہادی کو کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے چند لقمے لیے اور بل دے کر باہر آ گیا۔ ابھی بھی امید کی موہوم کرن باقی تھی کہ شاید وہ لمبی ناک والی دراز قد فرینڈ اسے پھر مل گئی ہو اور وہ اس کے ساتھ فوراً کہیں جانے پر مجبور ہو گئی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ دوبارہ یہاں آئے۔ پیزا شاپ سے نکلنے کے باوجود وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ وہیں فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا اور دکانوں میں جھانکتا رہا۔ شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ عمارتوں کے عکس اب نئے زاویے سے دکھ رہے تھے۔ سورج کی ترچھی کرنیں وینس کی آبی شاہراہوں پر اشرفیاں سی بکھیر رہی تھیں۔ ہادی تھکے تھکے قدموں سے واپس روانہ ہوا۔ رات 8 بجے تک وہ اپنے کیمپ میں واپس پہنچ چکا تھا۔ وہ خیمے کی چٹائی پر چت لیٹ گیا اور علیزا کی اس عجیب حرکت پر غور کرنے لگا۔ اسے علیزا سے ایسی بدعہدی اور کج روی کی توقع نہیں تھی۔ اگر وہ کچھ نہیں بتانا چاہتی تھی تو بھی صاف لفظوں میں ہادی سے کہہ سکتی تھی۔ ایسی صورت میں وہ اچھے طریقے سے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ پاتے۔ انجان چہروں کے حوالے سے انسان زیادہ کشش محسوس کرتا ہے۔ علیزا بھی ایک انجان ہستی کے طور پر اس کے سامنے آئی تھی۔ لیکن عین اس موقع پر جب وہ انجان سے شناسا بننے والی تھی اسے اپنے بارے میں کچھ بتانے والی تھی، وینس نے اسے "ہڑپ" کر لیا تھا۔

وہ وینس کی ہزار ہا روشن اور نیم تاریک گلیوں اور آبی گزرگاہوں میں گم ہو گئی تھی۔ اب وہ اسے کیسے ڈھونڈ سکتا تھا۔ اس کے پاس اس اُلجھی ہوئی گتھی کا کوئی سرا ہی نہیں تھا۔ ہاں اگر وہ خود چاہتی تو اب بھی اس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اس نے یہ کیمپ پلیس دیکھی ہوئی تھی اور ہادی کا خیمہ بھی۔ لیکن اگر اس نے اس خیمے تک آنا ہوتا تو پھر یوں نام ونشان چھوڑے بغیر غائب ہی کیوں ہوتی۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ اور تناؤ کے سبب ہادی کے جسم میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔ اس نے ڈسپرین نکالنے کے لیے اپنے شولڈر بیگ کی بیرونی پاکٹ میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں کسی سخت چوکور شے سے ٹکرائیں۔ یہ پلاسٹک کی کوئی ڈبیا تھی۔ ہادی نے اسے باہر نکالا اور غور سے دیکھا۔ یہ پارکر پین کا وہی سیٹ تھا جو اس نے ریالتو کے ایک شاپنگ مال میں دیکھا تھا۔ قیمت کچھ زیادہ تھی اس لیے اس نے خریدنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس امر میں شبہے کی گنجائش نہیں تھی کہ یہ علیزا نے ہی اس کے بیگ کی پاکٹ میں رکھا ہے لیکن یہ اس نے کب خریدا اور کب رکھا؟ اسے یاد آیا کہ شاپنگ مال سے کچھ آگے آنے کے بعد وہ پھر پیچھے پلٹ کر بیٹھ گئے تھے۔ علیزا نے کہا تھا کہ وہ اپنی کسی بھانجی کے لیے دستی پنکھا خریدنا چاہتی ہے۔

''او گاڈ'' ہادی کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

اس نے بڑی نرمی سے ڈبیہ کو چھوا۔ اس میں سے قلم اور بال پوائنٹ نکالا اور انگلیوں کی پوروں سے ان کے ملائم لمس کو محسوس کیا۔ علیزا کا چہرہ پوری آب وتاب سے اس کی نگاہوں میں چمکا۔ اس کے دل میں امید جاگی کہ وہ پھر آئے گی۔ وہ اس خیمے کو ایک بار پھر رونق بخشے گی۔ ایک دھیمی سی مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں کو چھو لیا۔ اس نے لیٹے لیٹے ایک انگڑائی لی اور آنکھیں موند لیں۔

اگلی صبح وہ زیادہ دیر تک نہیں سویا۔ اس نے آنکھ کھولی تو گھڑی کی سوئیاں آٹھ بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ سورج کی روپہلی کرنیں، درختوں میں سے چھن چھن کر رنگ برنگے خیموں تک پہنچ رہی تھیں۔ علیزا نے اسے بتایا تھا کہ اسے یعنی آج اسے روم واپس چلے جانا ہے۔ مگر وقت کا نہیں بتایا تھا۔ ہادی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ جانے سے پہلے ایک بار ضرور یہاں آئے گی۔ عین ممکن تھا کہ صبح سویرے ہی پہنچ جاتی۔ پچھلی دفعہ جب وہ خیمے سے نکلا تھا تو وہ اچانک ایک طرف سے برآمد ہوئی تھی اور اس نے ہادی کو ڈرا دیا تھا۔ اسی امید کے تحت ہادی نے خیمے کے دروازے کی ڈوری کھولی اور گردن نکال کر دائیں بائیں دیکھا۔ جاگنگ کرتے ہوئے دو جوڑے اس کے سامنے سے گزر گئے۔ ایک ادھیڑ عمر اطالوی خاتون اپنے ننھے منے کتے کے ساتھ خراماں خراماں چلی جا رہی تھی۔

ہادی نے در کا پردہ پھر گرا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ واش رومز کی طرف چلا گیا۔ فریش ہو کر واپس آیا، ناشتہ کیا، کپڑے بدلے۔ اس دوران میں اس کی نگاہیں مسلسل علیزا کی منتظر رہیں۔ ٹورسٹ اب سیر سپاٹے کے لیے کیمپ سے نکلنا شروع ہو گئے تھے لیکن وہ خیمے میں ہی جما بیٹھا رہا۔ گیارہ بجے..... بارہ بجے اور پھر ایک بج گیا۔ وہ نہیں آئی۔ ہادی کی امیدیں دم توڑنے لگیں۔ اگر اسے واقعی آج روم کے لیے نکلنا تھا تو پھر وہ اتنی دیر نہیں کر سکتی تھی۔ نکل چکی تھی۔

اس نے ایک بار پھر بیگ میں سے پارکر کی خوبصورت ڈبیہ نکالی۔ اسے محویت سے دیکھنے لگا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ ایک دم کیوں چلی گئی؟ اور اگر جانا ہی تھا تو پھر جاتے جاتے یہ امید کا دُم چھلا کیوں چھوڑ گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے پرسوں رات اور کل کے سیر سپاٹے کا حساب برابر کرنے کی کوشش کی ہو۔ گھومنے پھرنے کے دوران میں اکثر موقعوں پر ہادی نے ہی ادائیگی کی تھی اور علیزا کے اصرار کے باوجود اسے پرس کھولنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

ہادی کے سینے میں مایوسی کی ایک سرد لہری دوڑ گئی۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر اس کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس نے بے دلی سے لنچ کیا۔ اپنی کلائی کی پٹی ایک فرنچ خاتون کی مدد سے بدلی۔ تھوڑے سے کالے انگور کھائے اور خیمے کے اندر ہی لیٹ گیا۔

اچانک اسے اپنی وہ حرکت یاد آئی جو اس نے کل علیزا کی بے خبری میں کی تھی۔ اس نے جلدی سے کیمرا نکالا۔ اسے آن کیا اور ڈسپلے پر کل والی تصویریں دیکھنے لگا۔ جلد ہی وہ تصویر اسے مل گئی۔ اس کا دل دھڑک اُٹھا۔ تصویر بہت اچھی تو نہیں تھی مگر علیزا کا سائیڈ پوز واضح تھا۔ اس کا دلکش جسم کمان کی طرح خم کھائے ہوئے تھا۔ وہ چرچ کی ایک دیوار پر جھکی ہوئی تھی اور اس پر کندہ آرٹ ورک دیکھ رہی تھی۔ جھکنے سے اس کی روشن پیشانی کچھ اور بھی تمتمائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ بالکل بے خبر تھی۔

ہادی دیر تک تصویر کو کیمرے کی سکرین پر چھوٹا اور بڑا کر کے دیکھتا رہا۔ ساتھ ساتھ اس کی نگاہیں کیمپ کے داخلی راستے کی طرف بھی اُٹھ رہی تھیں۔ وہ اسی گومگو کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ شام کے سائے طویل ہونے لگے۔ وہ نہیں آئی۔

○......❖......○

اگلے روز دوپہر بارہ بجے تک بھی ہادی اپنے خیمے کے آس پاس ہی رہا۔ پھر اسے یقین ہونے لگا کہ اب وہ نہیں آئے گی۔ اسے خود پر جھلاہٹ محسوس ہوئی۔ وہ کسی بیوقوفوں کی طرح بار بار اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔ ''گو ٹو ہیل'' اس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنے جوگر پہن کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ اب اس کا انتظار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وینس میں کچھ اچھا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیوں جب وہ اپنے خیمے سے روانہ ہونے لگا تو اس نے ساتھ والے خیمے میں موجود فرنچ خاتون سے رابطہ کیا اور انگلش میں اس سے کہا۔ ''اگر کوئی لڑکی مجھ سے ملنے کے لیے آئے اور آپ یہاں موجود ہوں تو اسے میرا یہ سیل نمبر دے دیجیے گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک چٹ فرنچ خاتون کی طرف بڑھا دی۔

یہ وہی خاتون تھی جس نے کلائی کی پٹی بدلنے میں ہادی کی مدد کی تھی۔ وہ اپنے بھائی بہن کے ساتھ یہاں موجود تھی۔ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''میں نے پرسوں اسے دیکھا تھا آپ کی فرینڈ بڑی پیاری ہے۔''

''شکریہ'' ہادی نے کہا اور کیمپ سے نکل کھڑا ہوا۔

آج ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر بادلوں کے سفید ٹکڑے تھے۔ وہ چلتا رہا اور تصویریں لیتا رہا۔

پھر وہ آبی بس پر بیٹھ کر ریالٹو کی طرف آ گیا۔ لیکن آج ریالٹو اسے نسبتاً اُداس اور کم دلچسپ محسوس ہوا۔ وہ اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ چھوٹی موٹی خریداری کرتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی علیزا کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کے دل میں امید ہے کہ شاید وہ اسے کہیں گھومتے پھرتے نظر آ جائے۔ پہیلیاں ہمیشہ انسان کو اُلجھاتی ہیں۔ ان کے جواب نہ ملیں تو وہ اکثر ذہن سے چمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ وہ سوچنے لگا۔ کتنا اچھا ہوتا کہ کل وہ پانی کی بوتلیں لینے کے لیے سڑک کے پار نہ جاتا۔ ویٹر سے ہی کچھ منگوالیتا۔ ہوسکتا تھا کہ اظہار کے وہ لمحے اس طرح گم نہ ہوتے تو علیزا اپنے تذبذب میں سے نکل کر اسے اپنے بارے میں بتانا شروع کر دیتی۔

وہ ایک دم ٹھٹکا وہ اس جگہ کے پاس تھا جہاں کل دوپہر اس نے علیزا کو ایک لمبی ناک والی لڑکی سے بات کرتے دیکھا تھا۔ وہ دونوں اس گول ستون کے پیچھے کھڑی تھیں۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ چند کبوتر فرش پر چونچیں مار رہے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کل علیزا کے اچانک چلے جانے کی وجہ وہی لڑکی ہو۔ وہ دوبارہ آئی ہو۔ اس نے علیزا کو کوئی ایسی اطلاع دی ہو کہ اسے اچانک وہاں سے نکلنا پڑ گیا ہو۔ بے شمار امکانات تھے بہرحال یہ بات تو طے تھی کہ علیزا اپنی مرضی سے گئی ہے۔ اس نے ہادی کے شولڈر بیگ میں پازیب والی ڈبیہ ڈالی تھی۔ اپنا سامان اُٹھایا تھا اور ہادی کے لوٹنے سے پہلے ہی نکل گئی تھی۔

گزرتے گزرتے ہادی نے اس پیزا شاپ میں بھی جھانکا جہاں اس نے کل آخری بار علیزا کو دیکھا تھا۔ پھر وہ سیدھا نکلتا چلا گیا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد وہ وینس کی معروف سیر گاہ Doge's Palace میں تھا۔ یہ قدیم عمارت اپنے اندر ایک خاص قسم کی شان اور دبدبہ رکھتی تھی۔ ہادی نے سنا تھا کہ جب پرانے زمانے میں بحری جہاز وینس کے ساحل کی طرف آتے تھے تو مسافروں کو سب سے پہلے اس شاندار پیلس کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ اس قلعہ نما محل کے دالانوں، راہداریوں اور چیمبرز میں گھومتا رہا۔ آرٹ ورک کے نادر نمونے اور پینٹنگز دیکھتا رہا۔ دل کے کسی گہرے گوشے میں شاید یہ خیال بھی موجود تھا کہ ہوسکتا ہے اسی طرح چلتے پھرتے کہیں وہ مہ جبیں بھی نظر آ جائے۔ شام تک آوارہ گردی کرنے کے بعد وہ تھکا ہارا اسی سینٹر کی طرف آ گیا۔ ایک سوڈانی ہوٹل سے رات کا کھانا کھایا اور کیمپ واپس آ گیا۔

اگلے دو تین دن ہادی نے عجیب سی کیفیت میں گزارے۔ وہ اس پُر بہار شہر سے بیزار سا ہو گیا تھا۔ اپنی تمام رعنائیوں کے باوجود اب وینس اسے زیادہ کشش نہیں کر رہا تھا۔ اس کا دل جگہ بدلنے کو چاہ رہا تھا۔ اور جگہ عظیم الشان روما یعنی روم کے علاوہ اور کیا ہو سکتی تھی۔ عجائبات کے اس پُر شکوہ شہر کو دیکھنے کی خواہش ہمیشہ ہادی کے دل میں رہی تھی۔ اور اب تو اس شہر کو دیکھنے کی ایک اور "وجہ" بھی پیدا ہو چکی تھی۔

وینس چھوڑنے سے ایک دن پہلے وہ یونہی گھومتا پھرتا اور ACTV کی بس پر سفر کرتا اس بستی کی طرف نکل گیا جہاں وہ ایک رات علیزا کے ساتھ آیا تھا۔ مصیبت زدہ بنگلا دیشی لڑکی انیسہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ وہ اسے اس کی فرینڈ کے گھر چھوڑ کر گئے تھے۔ آج پھر ہادی نے اس سہ منزلہ مکان کی درمیانی ڈور بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد کھڑکی میں اسی لڑکی کا چہرہ دکھا دیا جو اس رات بھی انہیں ملی تھی۔ وہ ہادی کو پہچان کر نیچے چلی آئی۔ وہ آج بھی ایک ہلکی پھلکی

سا ڑھی میں تھی۔ رسمی کلمات کے بعد ہادی نے اس سے پوچھا۔ "انیسہ کا شوہر اسے لے گیا؟"

لڑکی نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ بنگالی لب و لہجے میں بولی۔ "وہ فلورنس سے واپس آ چکا ہے لیکن ابھی تک یہاں نہیں آیا۔ فی الحال اپنی والدہ کی سائیڈ لے رہا ہے اور انیسہ سے کہہ رہا ہے کہ وہ خود ہی واپس آئے لیکن......" وہ چپ ہو گئی۔

"لیکن کیا؟" ہادی نے پوچھا۔

"ٹیلیفون پر بات چیت ہو رہی ہے۔ دوش تو صاف طور پر انیسہ کی ساس ہی کا ہے۔ اب وہ کہہ رہی ہیں کہ انیسہ نے بھی ان پر ہاتھ اُٹھایا ہے۔ میں بڑی سے بڑی سوگند کھا سکتی ہوں کہ انیسہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کر ہی نہیں سکتی۔"

"انیسہ کا شوہر اس بارے میں کیا کہتا ہے؟"

"من تو اس کا بھی یہی کہتا ہے کہ انیسہ نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ معاملہ سلجھنے کی آشا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک دو روز میں وہ آ کر انیسہ کو لے جائے۔"

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "علیزا تو دوبارہ یہاں نہیں آئی؟"

"علیزا! وہی لڑکی جو اس رات آپ کے ساتھ تھی؟" ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "نہیں وہ تو نہیں آئی۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ بس وہ ایک دو دن سے رابطے میں نہیں تھی۔" ہادی نے گول مول سا جواب دیا اور پھر چند رسمی کلمات کے بعد اس انڈین لڑکی سے رخصت ہو کر واپس آ گیا۔ اگلے روز وہ بذریعہ ٹرین قریباً نو گھنٹے کا سفر کر کے روم جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

O......✣......O

روم حدِ نگاہ تک ہادی کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ یہ بہت وسیع رقبے پر بسا ہوا شہر تھا۔ سات رنگوں سے سجا ہوا اور دنیا بھر کے سیاحوں کی نگاہوں کا مرکز۔ ہادی نے اس شہر کو دیکھا اور بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ یہاں ایک صاف ستھرے ہوٹل ڈولو لیے میں قیام پذیر تھا۔ علاقہ تھا "پرائی" یہ روم سنٹرم میں واقع تھا۔ ہادی کو آسانی سے من پسند سواری مل جاتی تھی اور وہ ہر طرف سفر کرنے کے قابل تھا۔

دو تین دن میں اس نے گھوم گھوم کر اپنے پاؤں پر ورم کر لیا۔ اسے لگا کہ اگر روم کے کچھ علاقوں کو میوزیم سے تشبیہ دے دی جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہاں آثارِ قدیمہ اتنے پاس پاس ہوتے ہیں کہ سیاح کو پیدل چلنا ہی اچھا لگتا ہے اور جب وہ ایک بار پیدل چلتا ہے تو پھر چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ پاؤں تھک جاتے ہیں لیکن آنکھیں نہیں تھکتی۔ ہادی بھی بڑے اشتیاق سے روم کے طول و عرض میں گھوم رہا تھا۔ اسے مزہ آ رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ایک "بونس" کی طرح کا تھا کہ وہ سیلانی روح یعنی علیزا بھی اسی شہر میں کہیں رہتی ہے۔ اسی گلی کوچوں میں گھومتی ہے تیسری رات جب وہ ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں انرجی ڈرنک کا ایک گلاس پینے کے بعد سگریٹ پھونک رہا تھا۔ پاکستان سے فون آیا ایک والدہ اور بھائی کے سوا ہادی کا کوئی قریبی عزیز اس دنیا میں نہیں تھا اور یہ والدہ یا بھائی کا

فون نہیں تھا۔ ان سے تو کل ہی لمبی بات ہوئی تھی۔ یہ اس کے ایک کلائنٹ کا فون تھا۔ وہی میوزک کمپنی کے ڈائریکٹر احتشام شیخ جنہیں وہ لوگ کبھی کبھی بے تکلفی اور پیار سے شیخو صاحب بھی کہتے تھے احتشام شیخ کے ایڈوانس کی رقم چند ہفتے پہلے ہادی نے بمشکل اسے واپس کی تھی اور البم کے لیے گانے لکھنے کے لیے فی الحال معذرت چاہی تھی۔ اب وہ پھر اصرار پر آمادہ تھے۔ فون نہ سنتا تو بد اخلاقی ہوتی۔ ہادی نے بادلِ نخواستہ فون ریسیو کیا۔ "کیا حال ہے ہادی کیسے ہو؟" شیخو صاحب نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ٹھیک ہوں شیخو صاحب! لیکن اتنا نہیں جتنی آپ کو ضرورت ہے ابھی کچھ بھی نہیں سوجھ رہا۔ دماغ بالکل خالی ہو رہا ہے۔ ایک دم پاکستانی سینما گھروں کی طرح۔"

"یار! گولی مت دو مجھے پتا چلا ہے کہ ان ہوٹلوں کے مختار بھائی کے لیے کچھ لکھ رہے ہو تم۔"

"ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔ میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا آپ جانتے ہی ہیں۔ جو کچھ لکھا پہلے آپ کے لیے ہوگا۔ پھر کسی اور کے لیے۔"

"یار! بھاؤ تاؤ بڑھانے کی بات ہے تو بتا دو۔"

"کانوں کو ہاتھ لگائیں شیخو صاحب! میں نے آج تک ایسی بات کی ہے آپ سے؟ ہمیشہ سب کچھ آپ پر ہی چھوڑا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔"

"آئندہ تو تب ہوگا جب لکھو گے۔ مجھے تو لگتا ہے تم نے ویسے ہی دکان بڑھا دی ہے۔ اب خواہ مخواہ نخرے اٹھوا رہے ہو اور مزے لے رہے ہو۔"

"اگر آپ واقعی اس طرح سوچ رہے ہیں تو مجھے بہت افسوس ہے۔"

حسبِ معمول شیخو صاحب نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور بولے۔ "تم مجھ سے لاڈ کر لیتے ہو میں تم سے کر لیتا ہوں۔ مجھے پتا ہے تم دوسروں سے ذرا مختلف ہو۔ بہرحال اپنا خیال رکھو۔ وہاں اٹلی میں کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے کال کرنا۔ خاص طور سے روم میں وہاں اپنے ایک دو یار ہیں۔"

گفتگو ختم کر کے ہادی بستر پر چت لیٹ گیا۔ دونوں بازو موڑ کر سر کے نیچے رکھ لیے۔ وہ واقعی کچھ لکھ نہیں پا رہا تھا اور اس علیزا والے واقعے کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ وہ خالی خالی تھا۔ وسطی روم میں فروغِ اردو ادب کے نام سے ایک انجمن قائم تھی۔ بڑے بڑے نام اس انجمن سے وابستہ تھے۔ ان کے مقابلے میں ہادی کی کوئی حیثیت نہیں تھی لیکن ایک لحاظ سے حیثیت تھی بھی۔ وہ پاپولر شاعری کرتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ اس کے گیت سنتے اور سر دھنتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انجمن والوں نے اس کے ساتھ ایک شام منانے کا پروگرام بنایا تھا۔ یہ ایک چھوٹے پیمانے کی تقریب تھی اور کسی ہوٹل کی بجائے ایک مقامی ممبر کے گھر میں ہونا تھی۔ یقیناً وہاں اس سے تازہ کلام سنانے جانے کی فرمائش بھی کی جاتی تھی لیکن کوئی تازہ چیز اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ وہ رات گئے تک کوشش کرتا رہا اور بمشکل چار پانچ دوہے لکھ پایا۔ ان کا معیار بھی بس گزارے لائق ہی تھا۔

تقریب آٹھ بجے شروع ہوئی۔ مقامی نثر نگار اور شاعر حضرات بھی موجود تھے اردو ادب کے مقامی پرستاروں

کی معقول تعداد بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ہادی نے صرف پرانی چیزیں سنانے پر اکتفا کیا۔ تازہ لکھے ہوئے دوہے وہ کوشش کے باوجود نہیں سنا سکا۔ اس سلسلے میں ہمیشہ سے اس کا نظریہ تھا کہ کمزور چیز منظرِ عام پر لانے سے بہتر ہے کہ اسے ردی میں پھینک دیا جائے اور اچھی چیز کا انتظار کیا جائے۔

پرانی چیزوں پر ہادی کو خاطر خواہ داد ملی تاہم اس حوالے سے شرکا کو تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی کہ ہادی نے کوئی نئی چیز سرے سے سنائی ہی نہیں۔ اس نے جو کچھ پڑھا وہی تھا جو وہ پچھلے پانچ چھ سال سے ایسی نشستوں پر پڑھتا آیا تھا۔ یہ محفل موسم کی خرابی کے سبب مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے ہی اختتام پذیر ہوگئی۔

اگلے چار پانچ روز تک ہادی نے خوب "روم گردی" کی۔ وہ زیادہ تر پیدل ہی چلتا تھا اور اس کی خواہش ہوتی تھی کہ اکیلا ہی رہے۔ وہی ابنِ انشاء کا قول۔ اکیلا سیاح...... سیاحت کی اصل روح سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ واقعی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شاید مزید ہوتا اگر اس کے ذہن میں علیزا والا کانٹا نہ چبھا ہوتا۔ وہ گھومتے پھرتے، سڑکیں ناپتے اور مختلف عمارتوں کے اندر آتے جاتے جیسے لاشعوری طور پر علیزا کو بھی دیکھتا رہتا تھا۔ کسی لڑکی پر اسے علیزا کا شبہ ہوتا تو وہ اس شبہے کو رفع کیے بغیر آگے نہ بڑھتا۔

ایک دن اس کے ذہن میں آیا کہ روم میں آوارہ گردی کرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ اس علاقے میں کی جائے جہاں علیزا سے مڈبھیڑ ہونے کا چانس موجود ہے۔ وینس کے ایک بازار میں ہونے والی گفتگو کے دوران میں علیزا نے روانی میں اسے بتایا تھا کہ وہ شمالی روم میں Cassia کے علاقے میں رہائش پذیر ہے۔ اب ہادی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ "کاسیا" کا علاقہ کتنا بڑا ہے۔ اور کیا وہاں گھومنے پھرنے سے سیاحت کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں یا نہیں۔ اور یہ کہ اس طرح گھوم پھر کر وہ کچھ حاصل بھی کر پائے گا یا یہ بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے والی بات ہی ہوگی۔ پھر ایک اور سوال بھی اس کے ذہن میں ابھرتا تھا۔ فرضِ محال علیزا اسے مل بھی گئی تو وہ اس سے کہے گا کیا؟ وہ تو ابھی تک خود بھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ اس سے چاہتا کیا ہے۔

اگلے روز ناشتے کے فوراً بعد ہادی زمین دوز ٹرین کے ذریعے "کاسیا" کے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہ جان کر اسے تسلی ہوئی کہ یہاں بھی گلی کوچوں میں قدیم آثار بکھرے ہوئے ہیں۔ سیاحوں کے جتھے بھی دکھائی دیتے تھے۔ یوں یہ ایک رہائشی علاقہ تھا۔ تنگ سڑکیں اور گلیاں تھیں لیکن تنگ سڑکوں اور گلیوں میں ہی چلتے چلتے "سیاح" اچانک خود کو کسی عظیم الشان "موومنٹ" کے سامنے پاتا تھا۔ ایک دو ایسے کوچوں میں بھی ہادی گیا جہاں گاڑی کا داخل ہونا بھی دشوار تھا۔ لیکن ان کوچوں میں ایک دو عظیم الشان چرچوں کے دروازے موجود تھے۔ اندر داخل ہو کر بندہ دنگ رہ جاتا تھا۔ اگلے تین دن ہادی نے اس علاقے کی بھول بھلیوں میں گھومتے گزارے۔ اس کے پاس علیزا کی تصویر موجود تھی۔ کسی وقت اس کا دل چاہتا کہ وہ اس تصویر کا پرنٹ نکلوائے، اسے ہاتھ میں تھام لے اور ہر راہگیر کو تصویر دکھا کر پوچھے۔ آپ نے اس اول جلول لڑکی کو دیکھا ہے۔ یہ وینس کے ایک بازار میں مجھے چکمہ دے کر کہیں غائب ہوگئی ہے۔

چوتھے دن تک وہ شمالی روم میں کاسیا کے علاقے میں گھوم گھوم کر تھک گیا۔ اب یہاں دیکھنے والی کوئی قابلِ ذکر

چیز باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے کیمرے میں سینکڑوں تصویریں جمع ہو چکی تھیں۔ یہ امید بھی تقریباً دم توڑ گئی تھی کہ اس علاقے میں چلتے پھرتے کہیں اچانک ڈرامائی انداز میں علیزا کی صورت نظر آ جائے گی۔ یہ واقعی بھوسے کے ڈھیر میں سے سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا۔ چوتھے دن دوپہر کے کچھ دیر بعد ہی وہ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ آج تقریباً دس بارہ کلومیٹر چلا تھا۔ اس کے شاندار جوگرز اسے چلنے میں زبردست مدد دیتے تھے۔ ایک بار پھر وہ قدیم روم کے گلی کوچوں سے گزرتا ہوا پیدل ہی انڈر گراؤنڈ میٹرو ٹرین کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ کاسیا کے علاقے سے نکلنے کے بعد اسے تقریباً دو کلومیٹر مزید پیدل چلنا تھا۔ اور پھر اسٹیشن تک پہنچنا تھا۔ وہ اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر تھا جب اسے ایک جگہ آئس کریم نظر آئی۔ گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آئس کریم بار کی طرف بڑھ گیا۔ کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر اس نے کون آئس کریم لی۔ کون آئس کریم لینا اس کی غلطی تھی۔ آئس کریم زیادہ سخت نہیں تھی۔ پگھلتی جا رہی تھی۔ اس سے نمٹنے کے لیے ہادی کو جلدی جلدی منہ چلانا پڑا۔ اس کا انداز دیکھ کر قریب کھڑے دو فربہ اندام لڑکے ہنسنا شروع ہو گئے۔ ہادی نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس کی نظر آئس کریم بار کے اندر گئی۔ یہاں لوگ موجود تھے۔ اچانک ایک چہرہ دیکھ کر وہ بے طرح چونکا۔ اس کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ لمبی ناک والی وہی دراز قد لڑکی تھی جسے ہادی نے ریالٹو میں دیکھا تھا۔ یہ وہی تھی۔ ہادی کو پتا ہی نہیں چلا کب اس کی کون آئس کریم پگھل کر نیچے گر گئی۔ اسے بس فربہ اندام لڑکوں کی مدھم ہنسی سنائی دی تھی۔ اسے اس ہنسی کی پروا نہیں تھی۔ بلکہ کسی چیز کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ لڑکی کو وضاحت سے دیکھنے کے لیے بار کے اندر چلا گیا۔ اس کی رگوں میں خون سنسنا اٹھا۔ یہ وہی علیزا کی دوست تھی۔ وہ فیملی کے ساتھ تھی۔ ایک طویل میز کے گرد چھ سات مرد و زن بیٹھے تھے۔ یہ سب ایشیائی بلکہ شاید پاکستانی تھے۔ دو تین پردہ نشین خواتین تھیں۔ ایک بھاری جسم کا خوش باش سا شخص تھا جس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ ایک بچہ تھا۔ سیاہ داڑھی والا ایک جواں سال شخص میز کے سرے پر بیٹھا تھا۔ اس کے بال انگریزی تراش کے تھے۔ وہ [illegible] قمیص میں تھا۔ اپنے لباس اور حلیے سے یہ سارے لوگ کسی خوش حال فیملی سے لگتے تھے۔ وہ جس آئس کریم بار میں بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی خاصا مہنگا تھا۔

لمبی ناک والی لڑکی آج ساڑھی میں تھی۔ پلو اس کے سر پر تھا۔ وہ محویت سے ایک چادر پوش معمر خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک میز خالی تھی۔ ہادی وہاں جا بیٹھا۔ اس کا دل سینے میں تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے علیزا تو کہیں نظر نہیں آئی مگر اس کی سہیلی کا نظر آ جانا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ہادی کا ذہن تیزی سے سوچنے لگا۔ وہ کیا کرے؟ کس طرح بات آگے بڑھائے۔ کیا اسے کھڑی ناک والی دراز قد لڑکی سے بات کرنی چاہیے۔ یا پھر خاموشی سے ان لوگوں کے پیچھے جانا چاہیے۔ ان کی رہائش معلوم کرنی چاہیے۔ یا کوئی اور طریقہ؟ وہ گاہے بگاہے چادر پوش خواتین کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ ان میں سے دو تو بالکل جوان دکھائی دیتی تھیں۔ چادر کے نقابوں میں سے فقط ان کی آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ کہیں ان میں سے ہی تو کوئی علیزا نہیں؟ اس نے سوچا لیکن پھر خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ یکایک وہ چونک گیا۔ اس نے پچیس چھبیس سال کے فربہ اندام شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ ہادی کے [illegible] پچھلے پندرہ بیس منٹ سے ہادی بار بار ان لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہیں ان

بات کا برا تو نہیں منا لیا گیا تھا۔

فربہ اندام شخص سیدھا اس کی میز پر آیا۔ ”السلام علیکم“ اس نے خوش اخلاقی سے ہادی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ہادی نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔

فربہ اندام شخص بولا۔ ”معاف کیجیے گا میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ ہادی صاحب ہی ہیں نا؟ پاکستان سے؟“

”جج...... جی ہاں...... میں ہادی ہی ہوں۔“

فربہ اندام شخص کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔ اس نے ایک بار پھر گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور بولا۔ ”ہم آپ کے پرستاروں میں سے ہیں جی۔ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ پرسوں یہاں روزیزے کے علاقے میں کوئی ادبی نشست بھی ہوئی تھی۔ اس کی تصویر آئی تھی یہاں کے اردو ہفت روزے میں۔ اس تصویر کی وجہ سے ہی میں نے پہچانا ہے۔ اٹ از ونڈرفل۔ کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں آپ کے پاس؟“

”کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔“ ہادی نے خوش خلقی سے کہا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ فربہ اندام شخص کا نام ظہیر الدین معلوم ہوا۔ فربہ اندام ہونے کی وجہ سے وہ ذرا بڑا نظر آتا تھا ورنہ بالکل نوجوان تھا۔ وہ اپنی والدہ اور بڑے بھائی کے ساتھ یہاں موجود تھا۔ بڑے بھائی ہی سیاہ داڑھی والے بارعب سے صاحب تھے جو میز کے سرے پر بیٹھے تھے۔ ساتھ میں ان کی وائف بھی تھی۔ بچہ بھی اسی فیملی کا تھا۔

یہ جان کر ایک بار پھر ہادی کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی کہ یہ لوگ یہیں کاسیا کے علاقے میں رہتے ہیں۔ علیزا بھی تو یہیں کی رہنے والی تھی۔ تو کیا وہ بھی اسی فیملی کا حصہ تھی۔ عین ممکن تھا کہ ظہیر الدین کی چھوٹی بہن یا بھاوج وغیرہ ہو لیکن اتنی جلدی وہ اس طرح کے نازک سوال نہیں پوچھ سکتا تھا۔ وہ بس ایک دوسرے سے جان پہچان کی باتیں کرتے رہے۔ ظہیر الدین نے بتایا کہ وہ دونوں بھائی یہاں ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور چلاتے ہیں۔ اچھا خاصا سٹور ہے۔ معقول آمدنی ہے۔ اپنا گھر گاڑی، ملازمین بھی کچھ ہے۔ کشائش سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ اب یہ لوگ میلانو میں بھی ایک ایسا ہی سٹور کھولنے کی تیاری کر رہے تھے۔

”آپ کا کتنے دن کا پروگرام ہے یہاں؟“ ظہیر نے اپنائیت سے پوچھا۔

”بس ایک ڈیڑھ ہفتہ۔“

”کہاں رہ رہے ہیں آپ؟“

”ڈول وے ہوٹل۔ وائٹ اسکوائر کے علاقے میں۔“

”نہیں جناب! ایسا تو نہیں چلے گا۔ ہمارے ہوتے ہوئے آپ ہوٹل میں نہیں رہیں گے۔ اتنا بڑا گھر ہے۔ آٹھ دس مہمانوں کے لیے تو گھر میں ہر وقت جگہ رہتی ہے۔“

ہادی کے سینے میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی لیکن اس نے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ”نہیں ظہیر

صاحب! میں بہت آرام سے ہوں۔" اس نے کہا۔

"آرام سے تو آپ یقیناً ہوں گے۔ ظاہر ہے اتنا مہنگا ہوٹل ہے مگر اکیلے بھی تو ہوں گے ہمارے پاس ہوں گے تو اکیلا پن نہیں ہوگا۔ پردیس میں دیس کا مزہ پائیں گے اور پھر آپ روم کی ایسی ایسی جگہیں بھی دیکھ سکیں گے جو کوئی گائیڈ آپ کو نہیں دکھا سکتا۔ بس یہ طے ہے۔ اگر کوئی خاص مجبوری نہیں تو پھر آپ میرے ساتھ چلیں۔ آپ کی مہمان نوازی کر کے مجھے بے حد خوشی ہوگی۔" ظہیر نے "بے حد" پر اتنا زور دیا کہ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"اچھا...... مجھے سوچنے کا موقع دیجیے۔"

"آپ بے شک سوچ لیجیے لیکن جواب (فیصلہ) ہماری پُر زور خواہش کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔"

پھر وہ ہادی کا جواب سنے بغیر اُٹھا اور اپنی میز کی طرف چلا گیا۔ اس نے بڑے بھائی کے قریب جھک کر کچھ کھسر پھسر کی۔ بڑے بھائی صاحب بھی اُٹھ کر ہادی کی میز کی طرف آ گئے۔ چھوٹے بھائی کی نسبت وہ قدرے خاموش طبع تھے۔ چہرے پر گہری کاروباری سنجیدگی تھی۔ براؤن شلوار قمیص پر ویسٹ کوٹ میں توانا جسم پر جچ رہا تھا۔ ہادی نے اُٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ وہ تینوں بیٹھ گئے۔ بڑے بھائی صاحب کا نام جلال الدین تھا۔ ظہیر نے بڑے بھائی سے ہادی کا تعارف ایک مشہور ملی نغمے کے حوالے سے کرایا۔ یہ ملی نغمہ اکثر ٹی وی اور ریڈیو سے نشر ہوتا رہتا تھا اور خاصا مقبول تھا۔

جلال صاحب نے نغمے کی تعریف کی اور اس طرح کے چند دوسرے گیتوں کو بھی سراہا۔ تاہم اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تعریف و توصیف میں کفایت شعاری سے ہی کام لیتے ہیں۔

اسی دوران میں ان کے سیل فون پر کال آگئی۔ وہ کال سنتے سنتے لابی کی طرف چلے گئے۔ ظہیر صاحب اور ہادی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کال سے فارغ ہونے کے بعد جلال صاحب نے ہادی کو بتایا کہ انہیں فوری طور پر واپس جانا ہے۔ انہوں نے ہادی سے ہاتھ ملایا اور خواتین کی طرف چلے گئے۔ ظہیر صاحب نے ہادی سے ہوٹل کا روم نمبر وغیرہ معلوم کر لیا تھا۔ جاتے جاتے انہوں نے کہا۔ "کل گیارہ بجے رابطہ ہوگا آپ سے۔ بلکہ شاید میں خود ہی آ جاؤں۔" انہوں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی ہادی کی طرف بڑھا دیا۔

صورت حال نے یہ عجیب پلٹا کھایا تھا۔ نہ صرف علیزا کا کھوج ہاتھ آیا تھا بلکہ اس کھوج کو مزید کھوجنے کا موقع بھی خود بخود ہی مل رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھا بیٹھا سوچنے لگا۔ کیا کل واقعی ظہیر کے گھر میں علیزا سے ملاقات ہو سکتی ہے اور اگر ایسا ہوا تو علیزا کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ تو اپنا نشان چھوڑے بغیر اوجھل ہو گئی تھی۔ اب اگر اس نے یکایک ہادی کو اپنے سامنے پایا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سوچے گی کہ ہادی اس کا سراغ لگاتا ہوا اس کے پیچھے آیا ہے۔ اس نے جس تعلق کو ایک خوبصورت موڑ دے کر ختم کر دیا تھا۔ وہ پھر ایک بے ڈھنگا موڑ مڑ کر اس کے سامنے آن کھڑا ہوگا۔

ہوٹل کے کمرے میں وہ رات ہادی نے بڑی بے قراری سے گزاری۔ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ وسوسہ سر اُٹھا رہا تھا کہ کہیں ظہیر الدین اپنا ارادہ بدل ہی نہ ڈالے۔ وہ علیزا کو کم از کم ایک بار مزید دیکھنا چاہتا تھا اور ضرور دیکھنا

چاہتا تھا۔ پتا نہیں کہ یہ بے معنی سی خواہش اس کے دل میں کیوں جڑ پکڑے ہوئے تھی۔ ایک سوال اور ہادی کے ذہن میں بار بار اُٹھ رہا تھا۔ اس گھرانے کی خواتین تو پردہ نشین تھیں اگر علیزا بھی اسی گھرانے سے تھی تو پھر وہ پردے کے بغیر کیوں نظر آئی تھی؟ اسے تو ہادی نے باقاعدہ پتلون شرٹ میں دیکھا تھا۔

اگلے روز گیارہ بجے تو ہادی سرتاپا ظہیر صاحب کی فون کال کا منتظر تھا۔ سوا گیارہ بجے کے قریب یہ کال آ گئی۔ یہ کال کمرے کے نمبر پر تھی۔ "جاگ گئے ہادی صاحب!" ظہیر کی خوش باش آواز سنائی دی۔

"تقریباً۔" ہادی نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے آپ تیار ہو جائیں۔ میں آپ کو لینے آ رہا ہوں۔"

"لیکن......"

"لیکن کی گنجائش نہیں۔" ظہیر نے کہا اور فون بند کر دیا۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہادی اپنے مختصر اسباب سمیت ظہیر صاحب کے گھر میں تھا۔ یہ ایک اچھا رہائشی علاقہ تھا۔ بڑی بڑی کوٹھیاں اور ولاز تھے۔ ہادی جس گھر میں آیا وہ بھی اندازاً دو ڈھائی کنال میں تھا۔ گھر کا رہائشی حصہ اور مہمان خانہ پاس پاس تھے احاطہ کافی وسیع تھا اور یہاں بہت سے چھتری نما سنوبر پائن کے درخت کھڑے نظر آتے تھے۔ ایک دو مور بھی چہل قدمی کرتے دکھائی دیئے۔ پورچ میں دو شاندار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کے علاوہ اٹلی کی خاص نشانی بڑے سائز کا ایک ویسپا اسکوٹر بھی یہاں موجود تھا۔ جو یقیناً شوقیہ رکھا گیا تھا۔ ورنہ اس گھر میں اسکوٹر کس نے چلانا تھا۔ ظہیر نے ہادی کو جس کمرے میں ٹھہرایا وہاں ہر جدید سہولت موجود تھی۔ ظہیر بڑی جلدی گھل مل جانے والا شخص تھا۔ اپنے بڑے بھائی جلال کی نسبت وہ زیادہ مذہبی نہیں تھا۔ جب ہادی نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی داڑھی بھی نہیں تھی۔ گھنی مونچھیں نفاست سے تراشی گئی تھیں۔ وہ جب مسکراتا تھا تو دونوں کانوں کا گوشت اوپر کی طرف چڑھ جاتا تھا اور آنکھیں چھوٹی نظر آنے لگتی تھیں۔

اس نے آتے ساتھ ہی کہا۔ "ہادی بھائی! اس کو اپنا گھر سمجھنا ہے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بول دینا ہے۔ میں صرف تین چار دن زیادہ مصروف ہوں کیونکہ بھائی میلانو گئے ہیں۔ اس کے بعد اگر آپ چاہیں گے تو آپ کے ساتھ ساتھ گھوموں گا۔ لیکن ان تین چار دنوں میں بھی ایک ڈرائیور گاڑی سمیت آپ کے لیے اسٹینڈ بائی رہے گا۔"

"یار آپ تو واقعی کرم فرمائی کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ میں سنگل پسلی اس کے نیچے دب کر مر جاؤں گا۔"

"کوئی کرم فرمائی نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ ایک نامی گرامی پاکستانی فنکار اس وقت میرا مہمان ہے۔ آپ روزانہ اپنے دو تین گیت اپنی زبان سے سنا دیا کیجیے گا بس سمجھے گا کہ اگر کوئی کرم فرمائی ہے بھی تو اس کا بوجھ اُتر گیا۔ میرے لیے بونس یہ ہوگا کہ اپنے دو چار دوستوں سے بھی آپ کو ملواؤں گا اور ان پر اپنی دھاک بٹھاؤں گا۔" وہ ہنسا اور اس کی آنکھیں کسی جاپانی کی آنکھیں لگنے لگیں۔

"یار! اتنا نامی گرامی نہیں ہوں میں اور اگر آپ کے بڑے بھائی صاحب کو پتا چلا کہ میں نے صرف ملی نغمے ہی

ارشاد نہیں فرمائے۔ گانے شانے بھی لکھے ہیں تو وہ مجھے کھڑے کھڑے روانہ کر دیں گے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ شاعر ہیں یار! اور یہ قابلِ فخر بات ہے بھائی جان خود اقبال اور فیض کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔"

"کانوں کو ہاتھ لگاؤ ظہیر صاحب! مجھ ناچیز کو کن لوگوں سے ملا رہے ہیں کسی باذوق بندے نے سن لیا تو ہتکِ عزت کا دعویٰ کر دے گا۔"

اسی دوران ظہیر کے سیل فون پر کال آ گئی۔ اس نے ذرا تذبذب کے بعد کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ایک زنانہ آواز تھی۔ "ہیلو خالہ جان! کیا حال ہے؟" ظہیر نے کہا۔

مدھم سی آواز ہادی کے کانوں تک پہنچی۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں ظہیر بیٹا! م...... میں تو یا آنا چاہ رہی تھی۔ حجاب سے ملنے کو دل کر رہا ہے۔ کافی دن ہو گئے ہیں۔"

"مگر......" ظہیر نے اُلجھن آمیز لہجے میں کہا۔

عورت جلدی سے بولی۔ "مجھے پتا چلا تھا کہ جلال بیٹا شہر سے باہر ہے دو تین دن تک آئے گا اس لیے سوچ رہی ہوں کہ مل لوں۔"

"پر خالہ جان! امی تو گھر میں ہی ہیں۔ پھر آپ سے ٹوٹو میں میں ہو جائے گی ان کی۔"

"مجھے پتا چلا تھا کہ انہوں نے بھی بازار جانا ہے آج......"

"لیکن وہ تو شام کو جائیں گی نا۔"

"بس...... بیٹا! کچھ کرو...... میرا دل بڑا اُداس ہو رہا ہے۔" عورت کی گھگیائی ہوئی آواز سنائی دی۔ اس نے شاید کچھ اور بھی کہا لیکن ظہیر کال سنتا ہوا باہر چلا گیا۔

ساتھ والے کمرے سے ظہیر کے بولنے کی مدھم آواز آتی رہی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ جس حجاب کی بات ہو رہی ہے وہ ظہیر کی بڑی بھابی یعنی جلال کی بیوی ہے۔ فون پر بولنے والی حجاب کی والدہ تھی اور بیٹی سے ملنے کے لیے یہاں آنا چاہ رہی تھی۔ یہاں سسرال میں حجاب کے حالات غالباً زیادہ اچھے نہیں تھے لہٰذا ظہیر تذبذب میں تھا۔ آخر میں بات ختم کرتے ہوئے ظہیر نے کہا۔ "ٹھیک ہے خالہ! میں کوشش کرتا ہوں کہ امی شام کے بجائے دوپہر کو چلی جائیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو میں آپ کو ابھی فون کر دیتا ہوں۔"

گفتگو ختم کر کے ظہیر پھر ہادی والے کمرے میں آ گیا۔ اس موضوع پر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ مہمان خانے کی ملازمہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں قہوے کی پیالیاں اور دیگر لوازمات سجے ہوئے تھے۔ اس درمیانی عمر کی ملازمہ کا نام شریفاں معلوم ہوا۔ لگتا تھا کہ اس گھر میں شریفاں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کافی باتونی بھی تھی۔

دوپہر کا کھانا کافی پُرتکلف تھا۔ بیڑا تھا، بٹیر کا بھنا ہوا گوشت اور کھیر قسم کی سویٹ ڈش تھی۔ مصروفیت کی وجہ سے ظہیر کھانے سے پہلے ہی چلا گیا تھا۔ لنچ ہادی نے اکیلے ہی کیا۔

لنچ کے بعد جب وہ واش بیسن پر ہاتھ دھو رہا تھا اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر گئی۔ دو پردوں کی درز میں اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر عورت ڈری ڈری سی گھر میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ شکل و صورت سے کھاتے پیتے گھر کی لگتی تھی۔ رنگ سفید، چہرے سے نیکی اور شرافت ٹپکتی محسوس ہوتی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ ایک خوش اخلاق اور نیک خو خاتون ہے۔ اس کے سر پر ایک لمبی چادر تھی جس نے جسم بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ ہاتھ میں ایک ٹوکری لیے وہ کھڑکی کے عین سامنے سے گزری اور رہائشی حصے کی طرف چلی گئی۔ ٹوکری میں پھل وغیرہ تھے ہادی کو اندازہ ہوا کہ یہی حجاب کی والدہ ہے۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے دُکھ ہوا کہ گھروں میں ایسے حالات کیوں پیدا ہو جاتے ہیں کہ والدین کو اپنی بیٹیوں سے ملنے کے لیے یوں مجرموں کی طرح آنا پڑتا ہے۔ خوفزدہ، نادم اور سہمے سہمے۔

کھانے کے بعد کچھ دیر کے لیے ہادی سو گیا۔ قریباً ایک گھنٹے بعد جاگا تو خدمت گار شریفاں آواز پیدا کیے بغیر کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ اس کا تعلق وسطی پنجاب کے شہر گجرات سے تھا اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پنجابی اپنے ہاتھوں کو حرکت دیتے ہی رہتے ہیں۔ شریفاں بھی غالباً ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی ہی رہتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے اس نے اس گھر میں اپنا مقام بنا رکھا تھا۔

اتنے میں مین گیٹ کی طرف گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ملازم نے ہارن پہچان کر گیٹ کھولا۔ ایک شاندار سفید جیپ اندر داخل ہوئی۔ اسے باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر ایک فربہ اندام عورت طمطراق سے بیٹھی تھی۔ ذرا چوڑے چہرے والی اس صحت مند عورت کو ہادی نے کل ظہیر کی فیملی کے ساتھ آئس کریم بار میں دیکھا تھا۔ اسے دیکھ کر شریفاں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "ہائے میں مر گئی یہ اتنی جلدی واپس آ گئیں۔"

"یہ کون ہیں؟" ہادی نے دریافت کیا۔

"ظہیر صاحب کی امی!" شریفاں نے بدستور کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ پھر وہ ہادی کی طرف کوئی توجہ دیے بغیر تیزی سے باہر لپک گئی۔

صورتِ حال کچھ کچھ ہادی کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ ظہیر نے اپنی والدہ کو وقت سے پہلے ہی شاپنگ کے لیے بھیج دیا تھا تاکہ اس دوران میں حجاب کی والدہ آ کر حجاب سے مل لے اور تسلی سے بات وغیرہ کر لے۔ لیکن اب غیر متوقع طور پر ظہیر کی والدہ جلدی لوٹ آئی تھیں۔ حجاب کی والدہ ابھی گھر میں ہی تھیں۔ اب ملازمہ انہیں باخبر کرنے گئی تھی کہ ظہیر کی والدہ واپس آ گئی ہیں۔

پندرہ بیس منٹ مزید گزر گئے۔ اندر نہ جانے کیا ہوا۔ کوئی جھگڑا ہوا یا نہیں۔ بہر حال ہادی نے اتنا ضرور دیکھا کہ وہ عورت جو یقیناً حجاب کی والدہ تھیں ذرا گھبرائی ہوئی سی باہر آئی اور لڑکھڑاتی ہوئی سی مین گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اس کی لمبی چادر کا پلو اس کے پیچھے فرش پر گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔

جانے کیوں ہادی کو اس عورت پر ترس آیا۔ نجانے کیا وجہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی کے گھر میں اس طرح ڈری ہوئی آئی تھی اور سہمی ہوئی نکلی تھی۔

شام سے ذرا پہلے ہادی مہمان خانے سے نکلا اور خوبصورت گراسی لان میں چہل قدمی کرنے لگا۔ گلاب اور

نرگس کے پھولوں کی مہک دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ سورج کی ترچھی کرنیں درختوں کی چوٹیوں پر جھلملا رہی تھیں۔ اکثر یورپی ملکوں کی طرح فضا گرد و غبار سے پاک تھی۔ اس لیے ہر شے دھلی نظر آتی تھی۔ ہادی سوچنے لگا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ علیزہ واقعی اس گھر کے کسی کمرے میں موجود ہو۔ اسی فضا میں سانس لے رہی ہو۔ اس نے دوپہر سے کئی بار سوچا تھا کہ ملازمہ شریفاں سے کچھ سن گن لے لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا۔ ابھی شریفاں سے اس کی جان پہچان اس درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ ایسے سوالات کر سکتا۔ ویسے بھی اسے اس گھر میں آئے ابھی سات آٹھ گھنٹے ہی ہوئے تھے۔

اچانک وہ ایک منظر دیکھ کر ٹھٹکا۔ اس کی نگاہ رہائشی حصے کی طرف گئی تھی۔ رہائشی حصے کو باقی دنیا کی ایک چار پانچ فٹ اونچی باڑ نے علیحدہ کر رکھا تھا۔ باڑ کے قریب پھول دار پودوں کی کیاریاں تھیں۔ ان کیاریوں کے قریب ہادی کو کچھ گرد آلود پھل پڑے نظر آئے یوں لگا جیسے یہ پھل باڑ کے اوپر سے باہر پھینک دیئے گئے ہوں۔ کچھ گچھے انگوروں کے تھے۔ انجیریں تھیں۔ کچھ کیلے اور تر و تازہ ناشپاتیاں تھیں۔ یقیناً یہی وہ پھل تھا جو قباب کی والدہ ٹوکری میں لے کر آئی تھیں۔

ہادی سمجھ گیا۔ یہ پھل گرا نہیں بلکہ پھینکا گیا تھا۔ غالباً گھر کی مالکن کو اس پھل کی آمد پسند نہیں آئی تھی۔ شاید اب کسی نوکر کو بھی اتنی ہمت نہیں ہوئی تھی کہ اس پھل کو سمیٹ کر کوڑے دان میں ڈال دیتا۔ وہ جہاں کا تہاں پڑا تھا۔

پتا نہیں کہ اس گھر میں کس طرح کا تناؤ چل رہا تھا۔ چھوٹا بھائی ظہیر جتنا خوش باش تھا، بڑا بھائی جلال اتنا ہی خاموش طبع تھا۔ گھر میں اس کا کافی رعب داب بھی نظر آتا تھا۔ اگر جلال کی بیوی اور ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا تھا تو ممکن تھا کہ اس میں جلال کا اپنا ہاتھ بھی ہو۔

بہر حال ہادی کو ان باتوں سے کیا لینا دینا تھا۔ وہ کسی اور مقصد سے یہاں آیا تھا اور ابھی تک اس مقصد کی جھلک اسے نظر نہیں آئی تھی۔

O.....◆.....O

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ظہیر الدین اپنے ڈیپارٹمنٹل سٹور سے لوٹ آیا۔ وہ خاصا پر جوش تھا۔ اس نے بتایا کہ کل اس کا ایک دوست اس سے ملنے آئے گا۔ وہ گلوکاری بھی کرتا ہے اور ہادی کے گیتوں کا مداح ہے۔ جو خاطر تواضع یہاں ہادی کی ہو رہی تھی اس کے عوض ظہیر کے دو چار دوستوں سے ملنا کوئی بڑی مشقت نہیں تھی۔

اگلے روز ظہیر ناشتے کے فوراً بعد اپنے کام سے نکل گیا۔ اس نے ہادی سے کہا کہ ایک ڈرائیور اور گاڑی اس کے لیے تیار رہیں گے۔ وہ کہیں بھی جانا چاہے شریفاں یا مقصود کو بتا دے۔ مقصود مہمان خانے کے ملازم لڑکے کا نام تھا۔

دس بجے کے قریب ہادی نکلا ضرور لیکن گاڑی پر نہیں۔ وہ اپنی مرضی اور آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتا تھا۔ اس نے ڈیڑھ دو کلو میٹر بس کے ذریعے طے کیے پھر پیدل چلنا شروع کر دیا۔ کلائی کا زخم ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا تھا۔

بلکہ زخم کے ارد گرد کی جلد کچھ سرخ ہو گئی تھی اور گرم بھی محسوس ہوتی تھی۔ یہ انفیکشن کی نشانی تھی ہادی نے بہتر سمجھا کہ ڈاکٹر کو دکھا کر اچھی طرح پٹی کروا لے اور کھانے کے لیے بھی کوئی دوا لے لے۔ اس نے ایک دو راہگیروں سے پوچھا۔ پتا چلا کہ قریب ہی ایک کافی بڑا ہسپتال موجود ہے۔ دو تین بڑے بڑے گیٹ تھے۔ دو منزلہ بلڈنگ کافی وسیع تھی۔ وہ اندر چلا گیا۔ ایمرجنسی میں کئی مرد و زن موجود تھے۔ کچھ بوڑھے جو سیڑھیوں یا غسل خانوں وغیرہ سے گر کر آئے تھے وہیل چیئرز پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ چند افراد اسٹریچرز پر بھی تھے۔ ڈیوٹی ڈاکٹر نے آ کر ہادی کی چوٹ کا سرسری معائنہ کیا اور انتظار کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اندازہ ہوا کہ یہاں کا انتظام کچھ ایسا قابل رشک نہیں ہے۔ مریض کراہ رہے تھے۔ بلند آواز میں بڑبڑا رہے تھے۔ ڈاکٹروں کو پکار رہے تھے لیکن وہ اپنی روٹین کے مطابق کام کر رہے تھے۔ چالیس پچاس مریضوں کے لیے غالباً دو تین ڈاکٹرز ہی میسر تھے۔ ہادی بھی بیٹھ بیٹھ کر اکتا گیا۔ وہ واپس جانے کا سوچ رہا تھا جب شور سن کر چونک گیا۔ ایک پارٹیشن کی دوسری جانب بھی مریض بیٹھے تھے۔ یہ غالباً ایمرجنسی والے نہیں تھے۔ شور اسی جانب سے اٹھا تھا۔ کچھ دیگر افراد کی طرح ہادی نے بھی جا کر دیکھا۔ ایک خاتون انتظار گاہ میں بیٹھے بیٹھے صوفے پر گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ لوگ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک شخص نے اسے سہارا دے کر پانی کا گلاس اس کے منہ سے لگایا۔ اسے دیکھ کر ہادی بے طرح چونکا۔ یہ وہی نیک صورت خاتون تھیں جنہیں اس نے کل ظہیر کے گھر میں دیکھا تھا۔ ہادی کی نظر دھوکا نہیں کھا رہی تھی۔ یہ وہی تھیں۔ اتنے میں ایک تند مزاج ڈاکٹر بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس نے لوگوں کو پیچھے ہٹایا اور خاتون کا معائنہ کیا۔ انہوں نے اب آنکھیں کھول دی تھیں اور لمبے سانس لے رہی تھیں۔ ڈاکٹر انہیں سہارا دے کر اپنے ساتھ ہی کمرے میں لے گیا۔ ایک عورت انگریزی میں بڑبڑائی۔

''اتنا طویل انتظار کرواؤ گے تو پھر مریض ایسے ہی بے ہوش ہو ہو کر گریں گے۔''

تاہم ڈاکٹر نے سن لیا۔ واپس مڑ کر اس نے بڑبڑانے والی خاتون سے تلخ لہجے میں کچھ کہا۔ الفاظ ہادی کی سمجھ میں نہیں آئے۔ دو چار تند جملوں کے تبادلے کے بعد یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ادھیڑ عمر خاتون جو ہادی کی معلومات کے مطابق جلال الدین کی ساس تھی اب ڈاکٹر کے ساتھ مشورے کے کمرے میں تھی۔ ہادی انہیں یہاں دیکھ کر بے حد حیران ہوا تھا عورت کی واپسی قریباً پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ وہ اب پہلے سے بہتر نظر آتی تھی۔ چہرے کی رنگت اب بھی ہلدی تھا۔ ایک نرس اسے سہارا دے کر لائی اور صوفے پر بٹھا دیا۔

ایک بار پھر ہر کوئی اپنے اپنے کام میں مگن ہو گیا۔ ہادی عورت کے قریب جا بیٹھا۔ ''ماں جی! اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟'' وہ اردو میں بولا تو عورت نے چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں اپنائیت نمودار ہو گئی۔

''اللہ کا شکر ہے۔ اب ٹھیک ہوں۔ بس ہلکا ہلکا چکر آ رہا ہے۔ بیٹا تم کون ہو؟''

''میرا نام ہادی ہے۔ پاکستان سے ہوں۔ آپ بھی پاکستان سے ہیں؟''

''ہاں گجرات سے اور تم؟''

"میں لاہور سے ہوں۔"

"میں دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی۔تم لاہور کے ہو گے۔" وہ خوش دلی سے بولیں اور پھر لمبے سانس لینے لگیں۔ انہوں نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک نرس کو آواز دے کر بلانے کی کوشش کی لیکن وہ سنی ان سنی کرتی تیزی سے نکل گئی۔

"آپ نے کیا کہنا ہے اس سے؟"

"کچھ نہیں بیٹا! یہ میرا تھوڑا سا سامان ہے۔کوئی مدد کر کے مجھے ٹیکسی تک پہنچا دے تو......" انہوں نے ایک طرف رکھے شاپرز کی جانب اشارہ کیا۔غالباً وہ شاپنگ کرتے ہوئے اس طرف آئی تھیں۔

"میں پہنچا دیتا ہوں ماں جی! کہاں جانا ہے آپ کو؟ میرا مطلب ہے، رہائش کہاں ہے آپ کی؟"

"زیادہ دور نہیں۔یہیں "ایون ٹیمو" کے علاقے میں رہتی ہوں۔" انہوں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"چلیں میں چھوڑ آتا ہوں آپ کو۔آپ کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں۔"

"نہیں..... میں چلی جاؤں گی۔بس ٹیکسی....."

"اٹھیں..... اٹھیں..... آپ آئیں۔" ہادی نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور انہیں سہارا دے کر اٹھا لیا۔

اس مہربان چہرے والی خاتون کے لیے وہ دلی ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔ایک ہاتھ سے ان کے شاپرز اٹھا کر اس نے دوسرا بازو ان کی بغل کے نیچے رکھا اور انہیں سپورٹ دیتا ہوا ہسپتال سے باہر آ گیا۔باہر وزاؤں کی بو سے پاک تازہ ہوا تھی۔اب دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔

چند قدم چل کر خاتون ہانپ گئیں لیکن کوشش کر کے چلتی رہیں۔وہ دونوں ایک ٹیکسی تک پہنچے اور روانہ ہوئے تو خاتون نے کہا۔"ویسے تو ایک کلینک ہمارے گھر کے پاس بھی ہے لیکن میرا ہیلتھ انشورنس کا کارڈ اس ہسپتال کا بنا ہوا ہے۔اس لیے ہر تیسرے چوتھے روز یہاں آنا پڑتا ہے۔"

"مسئلہ کیا ہے آپ کا؟"

"بس بیٹا! وہی بڑھاپے کی بیماریاں، بلڈ پریشر ہے۔کبھی کبھی سانس کی تکلیف بھی ہو جاتی ہے۔"

"آج تو آپ بے ہوش ہی ہو گئی تھیں۔"

"بس چکر سا آ گیا تھا۔"

ان کی باتوں کے دوران میں ہی ٹیکسی ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی۔خاتون نے ایک سیاہ گیٹ کے سامنے ٹیکسی رکوائی۔ہارن دینے پر گیٹ کھل گیا۔ٹیکسی اندر داخل ہو گئی۔سبز گراسی لان میں سفید کرسیوں پر دو افراد بیٹھے تھے۔ایک ملازم انہیں مشروب پیش کر رہا تھا۔خاتون نے دھیمی آواز میں کہا۔"کسی کو بتانا نہیں کہ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔خوامخواہ پریشان ہوں گے۔بس کہہ دینا ذرا سانس خراب ہو گئی تھی۔اس لیے چھوڑنے آ گیا۔"

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا۔

ایک قبول صورت نوجوان تیزی سے ٹیکسی کی طرف آیا۔اس نے خاتون کی جانب والا دروازہ کھولا۔ہادی کو دیکھ کر بھی وہ قدرے حیران ہوا۔"خیریت امی جی!" اس نے چونک کر پوچھا۔

"کچھ نہیں فیصل! بس ذرا چکر سا آ گیا تھا۔اب ٹھیک ہوں۔"

"آ..... آپ کا رنگ تو بالکل پیلا ہو رہا ہے۔" نوجوان نے پریشانی سے کہا۔

"اب تم مجھے کہہ کہہ کر اور پیلا کر دو گے۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرائیں۔

فیصل نامی اس نوجوان نے سہارا دے کر والدہ کو ٹیکسی سے اُتارا۔ہادی نے شاپرز نکالے۔شاپرز میں ایک مٹھائی والا ڈبہ بھی تھا۔یہ پاکستانی ٹائپ مٹھائی تھی ہادی کرایہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر فیصل نامی نوجوان نے ایسا نہیں کرنے دیا۔خاتون کے اصرار پر ہادی بھی ان کے ساتھ ہی گراسی لان میں چلا گیا۔ملازم نے پھرتی سے دو تین کرسیاں مزید وہاں رکھ دی تھیں۔

ہم وطنی کی طرح بول چال اور لب و لہجہ بھی ایک دوسرے کو قریب لانے میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ چونکہ ہادی کی طرح یہ لوگ بھی وسطی پنجاب کے رہنے والے تھے اس لیے تھوڑی ہی دیر میں آپس میں گھل مل گئے۔ خاتون کا نام صوفیہ تھا۔ان کے تین بچے تھے۔ایک فیصل جو یہاں موجود تھا۔بڑی بیٹی اپنے میاں کے ساتھ جرمنی میں تھی۔دوسری بیٹی حجاب یہاں جلال الدین کی بیوی تھی۔کھچڑی بالوں اور عینک والا ایک کمزور سا ادھیڑ عمر شخص فیصل اور حجاب کا والد تھا۔ان کا نام بعد ازاں فیاض احمد معلوم ہوا۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ہادی کے انکار کے باوجود فیاض صاحب نے اسے روک کے رکھا اور کہا کہ وہ کھانا کھا کر جائے گا۔پروگرام لان میں ہی کھانے کا تھا مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے مطلع ابر آلود ہو گیا۔وہ لوگ اندر سجے سجائے ڈائننگ روم میں آ گئے یہ لوگ بھی کھاتے پیتے گھرانے کے لگتے تھے۔بہرحال ظہیر الدین اور جلال الدین والی دنیا اس وقت یہاں نظر نہیں آتی تھی۔ہادی نے اس بارے میں بالکل خاموشی اختیار کی کہ وہ آج کل جلال الدین کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔اپنی رہائش کے بارے میں سوال کا اس نے گول مول سا جواب دیا اور کہا کہ وہ پہلے ہوٹل میں تھا، پھر ایک قریبی دوست کے اصرار پر اس کے گھر میں شفٹ ہو گیا ہے۔اس نے اٹلی میں اپنی آمد کا مقصد سیر و سیاحت ہی بتایا۔اپنے پروفیشن کے بارے میں بھی اس نے کوئی خاص بات نہیں کی۔

کھانے کے دوران میں ہی گھنگھور گھٹا آ گئی اور دن میں رات کا سماں محسوس ہونے لگا۔روم میں ہادی کی یہ پہلی بارش تھی اور ایسی تابڑ توڑ کہ بس سماں بندھ گیا۔کھانا بھی مزیدار تھا۔اس کے مزیدار ہونے کی ایک وجہ اس کا بالکل پاکستانی طرز کا ہونا بھی تھا۔فیاض صاحب اور فیصل وغیرہ کی باتوں سے پتا چلا تھا کہ وہ لوگ پندرہ بیس سال سے یہاں مقیم ہیں۔اس کے باوجود ان لوگوں نے اپنے رہن سہن میں بھی پاکستانیت برقرار رکھی ہوئی تھی۔فیاض صاحب نے بچوں کو دینی تعلیم بھی دلائی تھی اور اپنی ثقافت سے دور نہیں ہونے دیا تھا۔

کچھ موسم کا اثر تھا، کچھ ویسے بھی یہ فیملی آج کچھ خوش نظر آ رہی تھی۔مٹھائی بھی کھائی گئی اور ہادی کو بھی کھلائی

گئی۔ غالباً ان لوگوں کے لیے یہ کوئی مسرت کا موقع تھا۔ مگر اس موقع کے بارے میں ہادی کو کچھ بتایا نہیں گیا۔ کھانے کے بعد قلمی آم رکھے گئے۔ یہ پاکستانی آم تھے۔ بالکل یہی لگا جیسے لاہور کی بارش ہے اور لاہور ہی کے آم ہیں۔ آم کھانے کے بعد ہادی ہاتھ دھونے کے لیے واش بیسن کی طرف آیا مگر کسی وجہ سے وہاں پانی نہیں آ رہا تھا۔ فیصل اسے ایک قریبی کمرے میں لے آیا۔ یہاں واش بیسن موجود تھا اور پانی بھی۔ اس کمرے کی ایک دیوار پر ایک بڑی سی تصویر لگی تھی۔ یہ دراصل ایک شاندار پنسل اسکیچ تھا۔ بالکل فوٹوگراف کی طرح محسوس ہوتا تھا اس بلیک اینڈ وائٹ اسکیچ نے فرش سے چھت تک پوری دیوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ ایک قبول صورت لڑکی تھی اس کے بال نفاست سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ پہلے تو ہادی نے سمجھا شاید یہ حجاب ہی کا پورٹریٹ ہے۔ لیکن پھر اس کی نظر نیچے لکھے ہوئے ایک فقرے پر پڑی۔ انگلش کے دلکش رسم الخط میں لکھا تھا۔ ”میں تمہیں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔“
اس فقرے کے نیچے لکھنے والی کا نام حجاب فیاض لکھا تھا۔

بس ایک نظر اس تصویر پر ڈالتا ہوا ہادی کمرے سے باہر آ گیا۔
بارش ایک بار شروع ہوئی تو پھر اس نے رُکنے کا نام نہیں لیا۔ گرج چمک بھی جاری تھی۔ موسم کی گرمی ایک نہایت خوشگوار خنکی میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ اب ہادی بے تکلفی سے فیاض صاحب کو انکل فیاض اور ان کی بیوی کو خالہ جان کہہ کر بلا رہا تھا۔ خالہ صوفیہ اب چائے بنا رہی تھیں۔ وہ دو ڈھائی گھنٹے پہلے کا وہ واقعہ قریباً بھول چکی تھیں جب انہیں ہسپتال میں چکر آیا تھا اور وہ باقاعدہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ خاصی باہمت اور بردبار خاتون تھیں وہ۔ انہوں نے بڑی پُر تکلف دودھ پتی بنائی۔ روم کی موسلا دھار بارش میں بیٹھ کر لاہور کا چونسہ کھانے اور گجرات کی دودھ پتی پینے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ باتوں سے معلوم ہوا کہ فیاض صاحب یہاں ایک کالج میں پڑھاتے رہے ہیں۔ اب ریٹائرڈ ہو چکے ہیں اور ایک قریبی آفس میں جز وقتی کام کرتے ہیں۔ بیٹا فیصل ایم بی اے کرنے کے بعد ایک معقول جاب کر رہا ہے۔ یہ گھر ان کا اپنا تھا۔ ہادی نے بھی اپنے بارے میں کافی کچھ بتایا، سوائے اس کے کہ وہ آج کل حجاب کے سسرالیوں کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔
اتنے میں فون کی بیل ہوئی۔ فیاض صاحب نے جا کر فون سنا۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو ان کا چہرہ اُترا ہوا تھا۔

”خیریت ہے نا؟“ خالہ صوفیہ نے پوچھا۔
”واجدہ کا فون تھا۔ حجاب کی طبیعت خراب ہے۔“
”ہائے میں مر گئی۔“ خالہ صوفیہ نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”کیا ہوا اسے؟“
”اُلٹی وغیرہ آ رہی ہے۔ بلڈ پریشر بہت گر گیا تھا۔ رات کو دو تین گھنٹے ہسپتال بھی رہی ہے۔“
”ہائے اللہ! اب کیسی ہے؟“
”واجدہ تو یہی کہہ رہی تھی کہ بہتر ہے۔ آگے اللہ جانے۔“
”م م..... میں فون کروں حجاب کو؟“
”نہیں...... ابھی نہ کرو۔ ہو سکتا ہے وہ کچھ دیر بعد خود ہی کر لے۔“

سب ایک دم گم صم نظر آنے لگے تھے۔ اسی دوران میں فون کی گھنٹی دوبارہ بج اُٹھی خالہ صوفیہ کے ساتھ ساتھ فیصل بھی لپک کر فون کی طرف چلا گیا۔ ہادی اور فیاض صاحب کمرے میں اکیلے رہ گئے۔ ”وہ..... پہلے سے بیمار تھی؟“ ہادی نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
فیاض صاحب بے تکلف گفتگو کرتے تھے۔ اب بھی انہوں نے واضح انداز میں بات کی۔ کہنے لگے۔ ”ہماری بیٹی کی شادی کو ڈھائی تین سال ہوئے ہیں۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ اب اللہ نے آس لگائی ہے۔ اسی سلسلے میں شاید طبیعت تھوڑی بہت خراب ہوئی ہے۔“
”اللہ بہتر کرے۔“ ہادی نے کہا۔
دوسرے کمرے میں خالہ صوفیہ فون پر بات کر رہی تھیں۔ لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ حجاب کا یا اس کے سسرالیوں کا فون نہیں ہے۔ کوئی دوسری نوعیت کی بات ہو رہی تھی۔ فیاض صاحب اپنے موبائل پر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگے۔ لیکن پھر کرتے کرتے رُک گئے۔ سامنے تپائی پر مٹھائی کا ڈبہ پڑا تھا۔ اب یہ بات ہادی کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ تھوڑی دیر پہلے کھائی جانے والی مٹھائی اسی ”خوشی“ کے سلسلے میں تھی جس کا ذکر ابھی فیاض صاحب نے کیا تھا۔

دو چار منٹ بعد خالہ صوفیہ اور فیصل کمرے میں واپس آ گئے۔ دونوں ابھی تک پریشان تھے۔ خالہ صوفیہ نے کہا۔ ”حجاب کی نند عمیرہ کا فون تھا۔ بتا رہی تھی کہ حجاب کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تھی۔ کل ساری رات ہی ہسپتال میں رہی ہے۔ بی پی بہت کم ہو گیا تھا۔“
فیاض صاحب بولے۔ ”ان لوگوں کو کم از کم بتانا تو چاہیے تھا ہمیں۔ ایک فون ہی کر دیتے جلال خود تو شہر سے باہر ہے اور واجدہ کا آپ کو پتا ہی ہے۔“ خالہ صوفیہ نے کہا۔
فیصل گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے بولا۔ ”شاید وہ ہسپتال لے کر گئے تھے۔ وہاں کے اسٹینڈرڈ کا تو پتا ہی ہے سب کو۔ میرا تو مشورہ ہے کہ باجی کو چند دن کے لیے یہاں لے آئیں۔ ڈاکٹر انکل بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں ہم سب کی طبیعت کو۔ باجی کو تو ہمیشہ آرام ہی ان سے آتا ہے۔“
”لیکن جلال کی ماں مان جائے گی۔“ فیاض صاحب بولے۔
”آ..... آپ فون کر کے دیکھ لیں۔“
”نہیں بھئی میں تو نہیں کروں گا۔ایسا نہ ہو کوئی سخت بات نہ ہو جائے اس سے یا مجھ سے۔“
”میں کر لیتا ہوں۔“ فیصل نے کہا۔
”نہیں..... تم تو بالکل نہیں کرو گے۔“ خالہ صوفیہ بولیں۔
”تو پھر کون کرے گا امی؟“
”چلیں..... میں کر کے دیکھتی ہوں۔“ خالہ صوفیہ نے کہا۔
”کیا کہو گی؟“ فیاض صاحب نے پوچھا۔

"آپ بتائیں۔" خالہ صوفیہ نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"اس سے کہو کہ دو تین دن کے لیے بھیج دیں حجاب کو عطا ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے ذرا جنرل چیک اپ کر لے گا حجاب کا۔"

"اچھا میں کرتی ہوں بات۔" خالہ صوفیہ نے کہا اور پھر ڈگمگاتی ہوئی سی فون کرنے چلی گئیں۔

ہادی بظاہر لاتعلقی سے ایک انگلش میگزین دیکھ رہا تھا مگر اس کی توجہ گفتگو کی طرف ہی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ لوگ حجاب کے سسرالیوں سے کتنے سہمے رہتے ہیں۔ ایک دن پہلے وہ اپنی آنکھوں سے بھی خالہ صوفیہ کی بے چارگی کا منظر دیکھ چکا تھا۔ گھر میں حجاب کی ساس کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد خالہ صوفیہ گھبرائی ہوئی سی گھر سے نکل گئی تھیں۔ ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد [illegible] نے وہ پھل بھی باہر پھینک دیا تھا جو وہ بڑی چاہت سے بیٹی کے لیے لے کر گئی ہوں گی۔

دوسرے کمرے میں خالہ صوفیہ، حجاب کی ساس کو فون کر رہی تھیں۔ یہاں کمرے میں فیاض صاحب اور [illegible] چہروں پر تناؤ لیے بیٹھے تھے۔ خالہ صوفیہ بڑی منمناتی ہوئی عاجزانہ آواز میں بول رہی تھیں۔ الفاظ ہادی تک نہیں [illegible] رہے تھے۔

چند منٹ بعد وہ واپس آئیں۔ ان کے چہرے پر مایوسی کا سایہ تھا۔ "کیا کہا واجدہ نے؟" فیاض صاحب نے پوچھا۔

"واجدہ سے نہیں۔ جلال سے بات ہوئی ہے۔ وہ آ گیا ہے واپس۔"

"کیا کہتا ہے؟"

"کہتا ہے۔ اب وہ ٹھیک ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں اور کہتا ہے کہ ہم بھی کوئی ایسی بات نہ کریں [illegible] سے حجاب شش و پنج میں پڑے۔"

"حجاب نے بات کی؟"

"نہیں جلال بتا رہا تھا کہ وہ سو رہی ہے۔"

"وہ تو جب بھی فون کریں، یہی بتاتے ہیں کہ سو رہی ہیں، باتھ روم میں ہیں، دس دفعہ فون کریں تو ایک دفعہ بات ہوتی ہے۔" فیصل نے بُرا سا منہ بنا کر کہا اور اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

"ہمیں جانا چاہیے؟" فیاض صاحب نے بیوی سے پوچھا۔

"جانا تو چاہیے۔ لیکن پتا نہیں وہ بُرا نہ مانیں۔ یا پھر پہلے ایک بار فون پر حجاب سے بات [illegible] جائے۔"

"چلو انتظار کر لو۔" فیاض صاحب نے کہا۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہے تھے مگر ہادی کی موجودگی کا خیال کر کے موضوع بدل دیا۔ گفتگو کا رُخ مسلسل برسنے والی بارش کی طرف مڑ گیا۔

ہادی اس گھر کی صورت حال دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا۔ یہ لوگ حجاب کے سسرالیوں کے حوالے سے

بہت دباؤ میں تھے۔ ہادی کا دھیان بار بار اس دیوار گیر تصویر کی طرف بھی جا رہا تھا جو یہاں ایک کمرے میں آویزاں تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی ایسی لڑکی کی تصویر ہے جو اب اس دنیا میں نہیں یا پھر اتنی دور ہے کہ اس سے ملاقات ممکن نہیں۔ وہ حجاب کی بہن تو ہرگز نہیں لگتی تھی۔ بہرحال ہادی نے اس سلسلے میں فیاض صاحب سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

شام کے وقت بارش میں وقفہ آیا اور ہادی ان لوگوں سے رخصت ہو کر واپس اپنی قیام گاہ پر واپس آ گیا۔ راستے میں اس نے ایک جگہ سے اپنی کلائی کی مرہم پٹی بھی کروائی اور ڈاکٹری نسخے پر دوا بھی لے لی۔

ظہیر بھی اپنے کام سے واپس آ چکا تھا۔ اس کا موڈ آج کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ بہرحال وہ دیر تک ہادی کے پاس بیٹھا رہا اور باتیں کرتا رہا۔ ہادی نے اسے بتایا کہ اس نے کلائی کی بینڈیج کروائی ہے۔ ہسپتال کی بدانتظامی کا نقشہ بھی اس نے ظہیر کے سامنے کھینچا۔ ظہیر نے اقرار کیا کہ یہاں کے کئی سرکاری ہسپتالوں کی صورتِ حال مایوس کن ہے۔

گفتگو کے دوران میں ہادی نے بار بار کوشش کی کہ کسی طرح علیزا کا کوئی کھوج ہاتھ آ سکے۔ اس گھر میں کل چھ افراد بستے تھے۔ ظہیر اس کی بیوی فوزیہ، اس کے بڑے بھائی جلال، بھابی حجاب، والدہ واجدہ بیگم اور ظہیر کی ایک سالی ارم، ارم بھی آج کل ہاسٹل میں رہ رہی تھی۔

ہادی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے ظہیر سے پوچھا۔ "آپ کی سسٹر ان لاء (ارم) آپ کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟"

"وہ اکاؤنٹنسی کر رہی ہے۔ اسے وینس کی یونیورسٹی میں داخلہ ملا تھا اس لیے وہیں رہنا پڑ رہا ہے۔"

وینس کے نام پر ہادی کا دل دھڑکا۔ کہیں علیزا دراصل ارم ہی تو نہیں تھی؟ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنا نام غلط بتایا ہو۔ ہادی نے صاف دیکھا تھا کہ جلال کے مقابلے میں اس کا چھوٹا بھائی ظہیر زیادہ کٹر ذہن کا نہیں ہے۔ وہ مذہبی معاملات پر زیادہ سخت رائے نہیں رکھتا تھا۔ اس کی بیوی فوزیہ بھی یوں تو پردہ کرتی تھی۔ مگر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جلال کی فیملی کی نسبت قدرے روشن خیال ہے۔ علیزا کو بھی ہادی نے خاصے ایڈوانس روپ میں دیکھا تھا۔ تو کیا علیزا ہی دراصل ارم ہے؟

"بڑی خوش مزاج ہے۔" ظہیر نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "سیر سپاٹے کی بھی شوقین ہے۔ دو تین بار پاکستان جا چکی ہے۔ پاکستان کے بارے میں جتنا جانتی ہے شاید ہم بھی نہیں جانتے۔ یہاں ہوتی تو آپ کو لاہور کی گلیوں کے نام بھی بتا دیتی اور یہ بھی بتا دیتی کہ کون سی گلی میں کون سی چٹخارے دار شے بکتی ہے۔"

"پھر تو ان سے ملنا چاہیے تھا۔ مجھے بھی کبھی کبھی چٹ پٹی چیزوں کا شوق چراتا ہے۔" ہادی نے بات بنائی۔

"ویسے چار پانچ دن میں اسے آنا تو ہے۔ اگر آپ تب تک ہیں تو پھر ملاقات ہو سکتی ہے۔" ظہیر نے عام سے لہجے میں کہا۔

اسی دوران میں ملازمہ شریفاں تیزی سے اندر آئی۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ اس نے ظہیر سے کہا۔ "بھائی جان، آپ کو بلا رہے ہیں۔"

ظہیر تیزی سے شریفاں کے ساتھ چلا گیا۔ دونوں تیز تیز قدم اُٹھاتے رہائشی حصے کی باڑ کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ دو تین منٹ بعد ہادی نے دیکھا کہ ایک بڑی کار تیزی سے پورچ کی طرف سے آئی اور مین گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اندھیرے میں ہادی صرف اتنا ہی دیکھ سکا کہ فرنٹ سیٹ پر ظہیر موجود تھا۔

"کہیں حجاب کی طبیعت پھر تو خراب نہیں ہو گئی۔" ہادی نے سوچا۔

اس بات کا جواب اسے قریباً پندرہ منٹ بعد ملا جب شریفاں واپس انیکسی میں آئی۔ "کیا بات تھی شریفاں؟" ہادی نے پوچھا۔

"بڑی باجی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ انہیں پھر ہسپتال لے کر گئے ہیں۔" وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"کیا ہوا ہے؟"

"کچھ پتا نہیں جی! بس دعا کریں۔ اس ویلے تو بے ہوش ہیں وہ جی۔" شریفاں نے گول مول بات کی۔ وہ باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔

یہ موقع اچھا تھا۔ ہادی، حجاب کے بارے میں اس سے مزید پوچھ سکتا تھا۔ اس نے ایک دو سوال کیے جن کے جواب میں شریفاں نے بتایا۔ "وڈی باجی بہت چنگی ہیں جی اتنی چنگی جتنا کوئی سوچ سکتا ہے۔ پر اس گھر میں ان سے سلوک چنگا نہیں ہے۔ خاص طور سے وڈے بھائی جان تو ان پر ہر ویلے بہت غصے میں رہتے ہیں۔"

"وڈے بھائی جان یعنی حجاب کے میاں؟"

"آہو جی..... دراصل......" وہ کہتے کہتے جھجک کر خاموش ہو گئی۔

"کہو کہو شریفاں! جو کہو گی صرف میرے تک ہی رہے گا۔"

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "کسی سے گل نہ کرنا جی آپ، پہلے ہی سارے کہتے ہیں شریفاں بڑا بولتی ہے۔"

ہادی نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ وہ بولی۔ "دراصل وڈے بھائی جان اور وڈی باجی میں شادی سے پہلے ہی ناچاقی ہو گئی تھی۔ وڈی باجی کمپیوٹر پڑھی ہوئی ہیں۔ کافی لائق ہیں۔ وڈے بھائی جان کاروباری ٹائپ کے ہیں۔ منگنی کے بعد وڈی باجی نے کہیں وڈے بھائی جان سے کہہ دیا کہ میرا دل چاہندا ہے کہ میں اپنے چاچا جی کے دفتر میں تین چار گھنٹے کی نوکری کر لوں۔ بس اسی گل کا بہت بڑا جھگڑا بن گیا۔ منگنی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ بعد میں وڈی باجی مان بھی گئیں کہ وہ نوکری نہیں کریں گی۔ شادی بھی ہو گئی۔ وہ اس گھر میں بھی آ گئیں۔ پر وہ نوکری والی گل وڈے بھائی جان کے دل میں ہی رہی۔ شادی کے مہینے ڈیڑھ دو مہینے بعد ہی دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے تھے۔ ساری دنیا جانتی ہے شادی کے بعد تو کڑی وچاری لاچار ہی ہو جاتی ہے۔ بندے کا پلڑا ایک دم بھارا ہو جاتا ہے۔ باجی وچاری نے جھگڑا کیا کرنا تھا۔ بھائی جان کی طرف سے ہی ہوتا تھا۔ بھائی جان ویسے بھی عمر وچ باجی سے چھ ست سال وڈے

ہیں ان کا رعب بھی کافی ہے۔ بس وہ ہر ویلے باجی کو تنگ کر رکھتے ہیں۔"

"باجی کے میکے والے کوئی عمل دخل نہیں دیتے؟" ہادی نے پوچھا۔

"نہیں جی! بڑے شریف لوگ ہیں۔ ان کے تو ہر ویلے ساہ (سانس) سوکھے رہتے ہیں۔ باجی سے ملنے بھی آتے ہیں تو ڈر ڈر کر کہ کہیں بھائی جان ناراض نہ ہو جائیں۔ باجی کی طبیعت پرسوں سے خراب تھی۔ پر ان وچاروں کی ہمت نہیں ہوئی آنے کی۔ کل رات نو بجے آئے تھے بس تھوڑی دیر کے لیے۔ کسی نے چائے تک نہیں پوچھی ان کو۔ بعد میں وڈے بھائی جان آئے تو میں نے ان سے پوچھ کر چائے بنائی۔"

شریفاں جو کچھ بتا رہی تھی۔ اس کی تصدیق ہادی کے سامنے ہو چکی تھی۔ آج انکل فیاض کے گھر میں اس نے وہ سارا تناؤ اور خوف اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جو بیٹی کے سسرال کے حوالے سے ان لوگوں کے دل میں موجود تھا۔

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سیانے کہتے ہیں، ظلم سہنا اور مسلسل سہتے رہنا بھی ظلم ہے۔ تمہاری وڈی باجی احتجاج کیوں نہیں کرتیں۔"

"وہ تو بالکل اللہ میاں کی گائے ہیں جی! اگر ان میں تھوڑی بہت ہمت تھی بھی تو اب ختم ہو چکی ہے۔ شروع شروع وچ دو چار مہینے وہ شاید وڈے بھائی جان کے سامنے بولی ہوں گی لیکن اب تو انہوں نے اپنی زبان بالکل بند کر لی ہے۔ "جی جی" کے سوا کچھ کہتی ہی نہیں۔ پھر بھی ان کی شامت آئی رہتی ہے۔ پڑھی لکھی ہیں۔ سمجھ دار ہیں۔ پر وڈے بھائی جان کے سامنے ایسے ہوتی ہیں جیسے کوئی تھر تھر کانپتی سکول کی کڑی ہو۔ خدا واسطے کی گل کی جائے تو انہوں نے اپنے بندے کے لیے خود کو بالکل مار لیا ہوا ہے۔ اپنی کوئی مرضی رکھی ہی نہیں ہے۔ وڈے بھائی جان کے کہنے پر گھر میں بھی پورا پردہ کرتی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ چھوٹے بھائی جان ظہیر وغیرہ کے سامنے بھی کم آتی ہیں۔ کسی سہیلی سے تعلق واسطہ نہیں رکھا ہوا۔ اپنا ٹیلیفون بھی بند رکھا ہوا۔ ماں پیو کے گھر آنا جانا نہ ہونے کے برابر کر دیا ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ کوئی ایسا کام نہ ہو جو وڈے بھائی جان کو بُرا لگتا ہو۔ پھر بھی پتا نہیں کیا بات ہے وڈے بھائی جان کو بولنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ مل ہی جاتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ بھائی صاحب ہاتھ وغیرہ بھی اُٹھاتے ہوں اس پر؟" ہادی نے خیال ظاہر کیا۔

"ابھی تک تو نہیں جی! لیکن جس قسم کے معاملے چل رہے ہیں۔ کسی دن یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے جی! اب دیکھیں یہ بیماری والی گل بھی بھلا کسی کے بس کی ہوتی ہے آپا خانم (جلال کی والدہ) کہتی ہیں کہ وہ بیمار اس لیے ہوئی ہیں کہ انہوں نے اپنی ماں کے گھر سے آئی ہوئی انجیریں کھائی ہیں۔ میں قسم کھا سکتی ہوں کہ وڈی باجی نے انجیر چکھی بھی نہیں تھی۔ ایسے ہی بیکار باتیں بناتے ہیں۔" ہادی کو وہ پھل یاد آیا جو باڑ سے باہر پھینک دیا گیا تھا۔

"ظہیر اور جلال صاحب کی والدہ کا سلوک کیا ہے تمہاری وڈی باجی کے ساتھ؟" ہادی نے پوچھا۔

"آپا خانم زیادہ تر بیٹے کا ساتھ ہی دیتی ہیں جی! پر وڈے بھائی جان غصے کے تیز ہیں۔ کبھی کبھار آپا خانم سے

بھی لڑ پڑتے ہیں۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے۔ ان دنوں باجی سے آپا خانم کا سلوک کچھ چنگا ہو جاتا ہے۔ پر یہ وقتی بات ہی ہوتی ہے جی۔"

"میرے خیال میں ظہیر صاحب تو تھوڑی بہت بھابی کی حمایت کرتے ہوں گے۔"

"آہو جی! ظہیر بھائی جان اور ان کی بیوی بھی سمجھتے ہیں کہ اس گھر وچ وڈی باجی کے ساتھ یہ اسلوک ہو رہا ہے۔ پر میں نے آپ کو بتایا ہے ناکہ وڈے بھائی جان کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔"

ہادی اس گھر میں علیزا کی ٹوہ لگانے آیا تھا لیکن اب اسے اس دوسرے کردار میں بھی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

شریفاں کے ساتھ گفتگو کے دوران میں ہادی نے باتوں کا رُخ ایک بار پھر اپنے من پسند موضوع کی طرف موڑ دیا۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ علیزا وہی ارم نامی لڑکی ہے جو رشتے میں ظہیر کی سالی ہے اور اکاؤنٹنسی پڑھنے کے لیے آج کل وینس میں مقیم ہے۔ کاش وہ کسی طرح ارم کی تصویر دیکھ سکتا لیکن تصویر والی شریفاں سے کرنے کی ہمت اسے نہیں ہوئی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد ہسپتال ہی سے ظہیر کا فون آیا۔ وہ تھکی آواز میں بول رہا تھا۔ اس نے ہادی سے پوچھا کہ ہادی نے کھانا وغیرہ کھا لیا ہے اور اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

ہادی نے پوچھا۔ "ظہیر بھائی! تمہاری بھابی کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

"طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔ اگلے ایک دو گھنٹے کافی اہم ہیں۔" ظہیر نے مختصر جواب دیا۔ ہادی نے بھی زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔

صبح ہادی جلدی بیدار ہو گیا۔ یہی کوئی سات ساڑھے سات کا وقت ہوگا۔ وہ کھٹ پٹ کی آوازوں سے جاگا تھا۔ اس نے دیکھا ظہیر بڑی پریشان صورت کے ساتھ کامن روم میں موجود تھا۔ وہ کسی کو فون کر رہا تھا۔ ملازم مقصود بھی فکرمندی سے تاثرات لیے اس کے پاس ہی کھڑا تھا۔ ظہیر اپنے کسی رشتے دار سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کی گفتگو سے ہادی پر یہ انکشاف ہوا کہ ظہیر کی بھابی حجاب تشویشناک حالت میں ہے۔ اس کا اپارشن ہو گیا ہے اور اپارشن کے دوران میں کوئی پیچیدہ صورت حال پیدا ہوئی ہے جس کی وجہ سے حجاب کے لیے خون کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ ظہیر اسی سلسلے میں بات کر رہا تھا۔ اس نے جب بلڈ گروپ کا نام لیا تو ہادی چونک گیا۔ یہ اے بی نیگیٹو تھا۔ یہ گروپ عام طور سے مشکل سے ملتا تھا۔ ہادی اُٹھ کر باتھ روم میں گیا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر آ گیا۔ ظہیر پریشانی کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "بلڈ بینک میں مل جاتا تو پھر اتنی بھاگ دوڑ کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ایک بوتل مقصود نے دی ہے ایک دو کی ضرورت مزید پڑ سکتی ہے۔"

ہادی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "ظہیر بھائی! میرا گروپ بھی اے بی نیگیٹو ہے۔ آپ مجھے ساتھ لے چلیں۔ اللہ نے چاہا تو میچنگ بھی ہو جائے گی۔"

ظہیر کا چہرہ کھل اُٹھا۔ وہ فون بند کرتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ بھابی اس وقت مشکل میں ہیں۔ ان کا بچہ تو نہیں بچ سکا۔ اب اللہ کرے وہ صحیح سلامت گھر آ جائیں۔"

وہ گاڑی میں بیٹھے اور روم کی سڑکوں پر فرائے بھرتے تیزی سے ناڈو ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سفید "لان سیا" گاڑی ظہیر خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ حجاب کی اپارشن کا سن کر ہادی کو دلی افسوس ہوا تھا۔ اب تک ہادی کو جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق وہ کافی تکلیفیں سہہ رہی تھیں۔ اب ایک اور بپتا اس پر آن پڑی تھی۔

ہسپتال پہنچتے ہی ہادی کے خون کا نمونہ لیا گیا۔ کراس میچنگ ہو گئی اور ہادی نے خون کا ایک بیگ دے دیا۔ جب وہ بیگ دے کر باہر نکل رہا تھا اس کی نگاہ اچانک حجاب کی والدہ اور بھائی فیصل پر پڑی۔ وہ تیزی سے آئی سی یو کی طرف جا رہے تھے ہادی ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔ اس نے خالہ صوفیہ اور فیصل وغیرہ کو ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ یہاں جلال صاحب کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اور وہ ابھی اس تعلق کو پوشیدہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ جلال آئی سی یو سے کچھ فاصلے پر برآمدے میں موجود تھا اس کے چہرے پر ویسے بھی ہر وقت گہری سنجیدگی رہتی تھی اور اب تو صورت حال بھی گمبھیر تھی خالہ صوفیہ ڈرے ڈرے انداز میں داماد کے پاس پہنچیں۔ اس سے دو چار باتیں کیں دور سے بھی ہادی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ خالہ صوفیہ اور فیصل کو سرد مہری سے جواب دیئے گئے ہیں۔ پھر جلال اپنی سیاہ داڑھی میں انگلیاں چلاتا ایک ڈاکٹر کے ساتھ ایک کوریڈور میں اوجھل ہو گیا۔

خالہ صوفیہ وہاں موجود ایک پردہ پوش خاتون سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ خاتون یقیناً ظہیر کی وائف فوزیہ ہی تھی۔ شریفاں بھی متفکر چہرے کے ساتھ یہیں موجود تھی۔

اتنے میں ہادی نے ظہیر اور جلال کی والدہ آپا خانم کو تیزی سے آتے دیکھا۔ وہ آئی سی یو کی طرف سے آ رہی تھیں۔ خالہ صوفیہ سے آپا خانم کی سلام دعا ہوئی۔ چند باتیں ہوئیں۔ پھر ایک دم نہ جانے کیا ہوا کہ سنجیدہ صورت آپا خانم بھڑک اٹھیں۔ بلند آواز سے بولیں۔ "یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ اچھی بھلی سیانی ہو تم۔ بال بچے پیدا کیے ہیں تم نے۔ تمہیں پتا نہیں تھا کہ اس حالت میں بچی کو کیا کھلانا ہے اور کیا نہیں۔"

"لل۔۔۔ لیکن واجدہ! وہ تو تمہارے سامنے ہی بتا رہی تھی کہ اس نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"لو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے میکے گھر سے کوئی چیز آئے اور وہ اسے کھائے نہ۔ وہاں سے تو سڑے ہوئے آلو بھی آ جائیں گے تو وہ انہیں تبرک سمجھے گی۔ بھجیا بنا کر پیٹ میں ٹھونس لے گی ان کو۔"

خالہ صوفیہ روہانسی آواز میں بولیں۔ "لیکن واجدہ! تم کسی بھی ڈاکٹر حکیم سے پوچھ لو۔ انجیر کا پھل تو کسی طرح بھی نقصان دہ نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔۔۔ سب سے زیادہ ڈاکٹری اور حکمت تو تمہارے ہی خاندان میں ہے۔ لوگ پوچھ پوچھ کر چلتے ہیں تم سے۔" واجدہ نے جلی کٹی آواز میں کہا۔ وہ اتنے بلند آہنگ میں بات کر رہی تھی کہ پچاس ساٹھ فٹ دور ہادی کے کانوں تک صاف پہنچ رہی تھی۔

خالہ صوفیہ نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن پھر کہتے کہتے رہ گئیں۔ تنومند واجدہ بڑبڑاتی ہوئی واپس اندرونی حصے کی طرف چلی گئی۔ ماں بیٹا وہیں کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد جلال ان کے پاس سے گزرا لیکن ان کی طرف دیکھا

تک نہیں۔ پھر فیصل نے ماں کو کندھوں سے تھاما اور اپنے ساتھ لے کر بیرونی برآمدے کے چوبی بنچوں پر جا بیٹھا۔ ہادی دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ خالہ صوفیہ، بیٹی کی اس مصیبت پر مسلسل رو رہی تھیں۔

ہادی نے ریفریشمنٹ کے بہانے ظہیر سے اجازت لی اور باہر چلا گیا۔ وہ خالہ صوفیہ اور فیصل کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔

پتا نہیں کیوں ہادی اپنے سینے میں گھٹن سی محسوس کر رہا تھا۔ اسے حجاب کی والدہ پر بے تحاشا ترس آ رہا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک باوقار اور قابلِ احترام خاتون تھیں لیکن بیٹی کے لیے خوار ہو رہی تھیں۔ خود بیٹی بھی جیسے ایک پنجرے میں پھڑپھڑا رہی تھی۔

ہادی یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ کسی فیملی کے اندرونی مسائل کے لیے دل جلانے کی خاطر نہیں۔ اب وہ یہاں سے جانا چاہتا تھا۔ بس ایک چیز اسے روکے ہوئے تھی۔ ظہیر کے بیان کے مطابق پرسوں ارم وہیں سے یہاں آ رہی تھی۔ اسے دیکھے بغیر ہادی کے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ارم کے حوالے سے اب تک معلومات حاصل ہوئی تھیں ان سے یہی شک پڑتا تھا کہ یہی وہ بیباک لڑکی ہے۔ جس نے دفتر میں اسے علیزا کے نام سے بیوقوف بنایا اور پھر گدھے کے سینگوں کی طرح غائب ہو گئی۔ اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ سوال ایک گرہ کی طرح ہادی کے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ اگر وہ اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی تو صاف کہہ دیتی۔ ہادی بھی اس کے لیے اصرار نہ کرتا۔ مگر یوں اچانک بیٹھے بٹھائے اُٹھ کر اوجھل ہو جانا بلاشبہ بد اخلاقی بلکہ سنگدلی کے زمرے میں آتا تھا۔ وہ جاتے جاتے پارکر قلم کا سیٹ بھی ہادی کو دے گئی تھی۔ وہ اسی طرح ہادی کے بیگ میں پڑا تھا۔ اس کی دید نے ہادی کے دل میں خواہ مخواہ کی کسک جگائی تھی۔

○.....❖.....○

تیسرے روز جلال کی بیوی حجاب ہسپتال سے گھر آ گئی۔ گھر کا ماحول جو پہلے ہی سنجیدہ تھا اب اور بھی سنجیدہ اور تناؤ بھرا ہو گیا تھا۔ اسی سہ پہر ظہیر اپنے ایک دوست کو ملانے لے آیا یہ وہی گلوکار تھا جسے ہادی سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ نوجوان ہی تھا مگر بال پیشانی سے اُڑے ہوئے تھے۔ وہ ہادی کے لیے کچھ کتابیں اور چاکلیٹس وغیرہ لے کر آیا تھا۔ ہادی کو ڈیڑھ دو گھنٹے اس کے پاس بیٹھنا پڑا اور "ستائش باہمی" کے دور سے گزرنا پڑا۔ امان شیروانی نامی یہ نوجوان گیا تو ظہیر نے ہادی کو بتایا کہ ارم نو بجے کی فلائٹ سے یہاں پہنچ رہی ہے۔ وہ اسے لینے کے لیے ایئرپورٹ جا رہے ہیں۔ واپسی پر ملاقات ہو گی۔

اس خبر کا ہادی صبح سے ہی منتظر تھا۔ بہر حال اس نے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا وہ بے تابی سے ظہیر کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ جو گاڑیاں گھر میں آتی تھیں وہ گارڈینیا کی باڑ کی دوسری جانب پورچ میں جا رکتی تھیں۔ لہٰذا ہادی کو امید نہیں تھی کہ وہ ارم کو فوراً دیکھ سکے گا۔ بلکہ ابھی تک اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ ارم گھر کی دیگر خواتین کی طرح مکمل پردے میں ہو گی یا نہیں۔

خدا خدا کر کے ساڑھے دس بجے اور ظہیر کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ ہادی کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔ گاڑی کو

کھڑکی کے سامنے سے گزرنا تھا۔ وہاں روشنی بھی تھی یعنی ممکن تھا کہ "گارڈن لائٹ" کی اس دودھیا روشنی میں ارم کی ایک جھلک دیکھ سکتا۔ اسے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی جھلک ہی نہیں، اس کو بڑی وضاحت سے دیکھ سکے گا اور اس کی آواز بھی سن سکے گا۔

سفید لان میں سیاہ گاڑی اندر داخل ہوئی لیکن رہائشی حصے کی طرف جانے کے بجائے انیکسی کے سامنے رک گئی۔ دراصل ظہیر یہاں اُتر کر ہادی کی طرف آنا چاہتا تھا۔ ہادی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کی نگاہیں گاڑی کے اندر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گاڑی کو ڈرائیور چلا کر لایا تھا۔ اس کے ساتھ والی نشست پر ظہیر تھا جو دروازہ کھول کر اپنے فربہ جسم کو جھلاتا ہوا باہر نکل آیا۔ پچھلی نشست پر دو خواتین موجود تھیں۔ ایک کو تو اس کی سرمئی چادر سے ہادی نے فوراً پہچان لیا۔ یہ ظہیر کی بیوی فوزیہ تھی۔ دوسری نے پردہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے سر پر فقط دوپٹہ تھا۔ ہادی کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ وہ یقیناً ارم ہی تھی جسے وہ لوگ ایئرپورٹ سے لے کر آئے تھے۔ ہادی اس کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ درمیان میں دوپٹہ حائل تھا۔ پھر صورتِ حال بدل گئی۔ دوپٹے والی لڑکی نے رُخ پھیرا، کھڑکی کھولی اور ظہیر کی طرف ہاتھ ہلا کر چہکی "جلدی آیئے گا جیجا جی" اس کا پورا چہرہ ہادی کے سامنے تھا۔

ہادی دیکھتا رہ گیا۔ یہ علیزا نہیں تھی۔ بھرے بھرے گالوں اور چھلے دار بالوں والی یہ کوئی اور لڑکی تھی۔ ہادی کے اندر جیسے کوئی تیز روشنی بجھ گئی۔ وہ گہری سانس لے کر کھڑکی کے سامنے سے ہٹ آیا۔ صوفے پر نیم دراز ہو کر سوچنے لگا۔ وہ کن چکروں میں پھنس گیا ہے۔

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور ظہیر جھومتا ہوا سا اندر آ گیا۔ "دیکھو ٹائم پر پہنچ گیا نا۔" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"کس چیز کا ٹائم؟" ہادی مسکرایا۔

"ہادی بھائی! تم نے وعدہ کیا تھا کہ ابھی کچھ شاعری Live سناؤ گے۔ میرا مطلب ہے کہ منہ زبانی۔ یار! ویسے یہ اپنا شیروانی بڑا متاثر ہوا ہے تم سے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر تم یہاں قیام کے دوران میں ایک دو گیت اس کے نئے البم کے لیے کہہ دو تو اس کا البم ہٹ ہو جائے۔ بڑا پیارا لڑکا ہے لیکن آج کل ذرا کرائسس میں آیا ہوا ہے۔"

"ظہیر بھائی! میں کچھ لکھنے لکھانے کے قابل ہوتا تو اس وقت لاہور میں بیٹھا ہوتا۔ فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بلکہ ارادے کی بھی بات نہیں ہے، مجھ سے فی الحال لکھا جا ہی نہیں سکتا۔" آخر میں ہادی کا لہجہ ذرا سا تلخ ہو گیا تھا۔

ظہیر جلدی سے بولا۔ "نہیں نہیں۔ میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی یار! یہ شاعری کا کام ہی موڈ کا ہے۔ میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"سسٹر ان لاء آ گئیں۔" ہادی نے پوچھا۔

"ہاں..... ابھی نیچے ہیں۔"

ہادی نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "اچھا ظہیر بھائی! جس دن میں نے پہلی بار آپ کو دیکھا تھا۔

وہیں ریسٹوران میں آئس کریم کھاتے ہوئے، اس دن آپ لوگوں کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھیں۔ انہوں نے نقاب نہیں کیا ہوا تھا۔ ذرا اونچی ناک تھی ان کی۔ کتابی سا چہرہ تھا۔" ہادی نے ہاتھوں کو حرکت دے کر باقاعدہ کتابی چہرے کا اشارہ دیا۔

ظہیر کی پیشانی پر دو تین سلوٹیں ابھریں۔ وہ جیسے کچھ سوچ رہا تھا، پھر چونک کر بولا۔ "ہاں...... وہ ماریہ تھی۔ بھابی حجاب کی فرینڈ ہے۔ وہ بھی وینس میں رہتی ہے بھابی سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ اس دن واپس چلی گئی تھی شام کو۔"

"اچھا...... میں حیران ہو رہا تھا کہ باقی خواتین تو باپردہ ہیں، وہ کھلے منہ تھیں۔" ہادی نے بات بنائی۔

"ہاں...... وہ فیملی سے باہر کی تھی۔ ویسے بڑی اچھی لڑکی ہے۔ بھابی کی دو تین قریبی دوستوں میں سے اب صرف وہی ہے جس سے بھابی کبھی کبھار مل لیتی ہیں۔ بھائی جان نے اس کی اجازت دی ہوئی ہے۔"

ہادی کے ذہن میں شک کا بیج پڑ چکا تھا۔ اس کے ذہن میں بار بار ایک انوکھا خیال آنے لگا۔ کہیں حجاب وہ لڑکی نہیں تھی؟

لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ یہ تو شادی شدہ تھی۔ پردے کی پابند اور غالباً نہایت سنجیدہ اطوار والی۔ ہادی نے ظہیر سے تھوڑی سی مزید گفتگو کی جس سے اسے پتا چلا کہ حجاب پچھلے ہفتے روم کے قریب دوسرے کسی شہر میں گئی ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ وینس سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

وہ سوچنے لگا کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی طرح حجاب یعنی مسز جلال کو دیکھ سکے؟ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ وہ چار دیواری سے باہر پردے میں نظر آئی تھیں ایک موقع پیدا ہو سکتا تھا انہیں دیکھنے کا، جب وہ ہسپتال میں تھیں اور ہادی نے خون دیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی اچانک وہاں حجاب کی والدہ اور بھائی کی آمد ہو گئی تھی اور ہادی کو واپس آنا پڑا تھا۔

O..... ❖ .....O

کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچ رہا ہوتا ہے اس کا ہو جانا کافی دشوار محسوس ہوتا ہے لیکن پھر وہ دشوار نہیں رہتا۔ مسز جلال یعنی حجاب کے حوالے سے بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اور ناشتے کے بعد نو بجے کے لگ بھگ ہادی اپنے کمرے کی کھڑکی کی طرف آیا۔ یہ چھٹی کا روز تھا۔ باہر مکمل خاموشی تھی مکین شاید سوئے پڑے تھے۔ ہادی کی نگاہ رہائشی حصے کی طرف گئی۔ اس نے ایک چادر پوش لڑکی کو انیکسی کی جانب آتے دیکھا۔ ہادی فوراً سمجھ گیا کہ یہ حجاب ہے۔ اس کی چادر کا رنگ کالا تھا اور اس پر تین چار چوڑی چمکیلی دھاریاں تھیں۔ یہ چادر ہادی پہلے بھی دو تین بار دیکھ چکا تھا۔ چادر کے نقاب میں سے حجاب کی فقط آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے کندھے سے شولڈر بیگ جھول رہا تھا۔ بیماری کے بعد کی نقاہت اب بھی اس کی چال سے عیاں تھی۔ وہ مین گیٹ کی طرف جا رہی تھی اور ایسا کرتے ہوئے اسے ہادی کے کمرے کی کھڑکی کے نزدیک سے گزرنا تھا۔ ابھی وہ کھڑکی کے پندرہ بیس قدم دور ہی تھی کہ ہادی کو ایک دوسری صورت نظر آئی۔ یہ سیاہ داڑھی اور سخت چہرے والا جلال تھا۔

وہ لمبے ڈگ بھرتا ہوا تیزی سے حجاب کے پیچھے آیا۔ اس نے شلوار کے اوپر ایک نائٹ گاؤن پہن رکھا تھا۔

کھڑکی سے کچھ ہی فاصلے پر اس نے آواز دے کر حجاب کو روک لیا وہ بت بنی رہ گئی۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ وہ سسکیاں لے رہی ہے۔ کمرے کے اندر چونکہ نیم تاریکی تھی اس لیے ان دونوں میں سے کوئی بھی ہادی کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جلال الدین، حجاب کے پاس پہنچا۔ اس نے تیز سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔ انداز ڈانٹنے والا ہی تھا۔

حجاب سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کا سینہ ہچکیوں سے دہل رہا تھا۔ دوسری بار جلال قدرے زور سے بولا۔ اس مرتبہ مدھم آواز ہادی کے کانوں تک بھی پہنچی۔ "یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟" جلال نے پھنکار کر کہا تھا۔

حجاب نے سہمے ہوئے انداز میں اپنی پلکیں اٹھائیں۔ کھڑکی سے ان دونوں کا فاصلہ بمشکل تین چار میٹر رہا ہوگا۔ سورج کی زرد پیلی کرنیں سیدھی حجاب کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ چہرے کا رُخ ہادی کی طرف تھا۔ مگر اس کے چہرے میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک ایک بار پھر مایوسی کی لہر ہادی کے سینے میں دوڑ گئی۔ یہ علیزا کی آنکھیں نہیں تھیں۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں ابھی تک ہادی کے حافظے پر نقش تھیں۔ حجاب کی آنکھیں ہلکی براؤن تھیں۔ اس نے اپنی اشک بار آنکھوں سے شوہر کو دیکھ کر کچھ کہا۔ یہ منمناتی ہوئی سی آواز ہادی تک نہیں پہنچ سکی۔

"چلو واپس۔ مجھے ایسے تماشے پسند نہیں۔" ایک بار پھر جلال کی تیز سرگوشی ہادی کے کانوں تک پہنچی۔ "اگر جانا ہوا تو میں خود چھوڑ کر آؤں گا تمہیں۔"

حجاب "صمٌ بکمٌ" تھی۔ اس کے جسم میں شاید اس کے آنسو ہی متحرک ہوں گے جو سرکتے ہوئے سیاہ چادر کے نقاب میں جذب ہو رہے ہوں گے۔ اس نقاب پر دو چمکیلی دھاریاں بڑی نمایاں نظر آتی تھیں۔

"چلو......" جلال نے انگلی سے واپس رہائشی حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر حجاب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی کلائی تھامی اور اسے لیتا ہوا واپس چل دیا۔ وہ جیسے اس کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔ پندرہ بیس قدم آگے جا کر اس کی ایک جوتی اس کے پاؤں سے نکل گئی لیکن جلال کو پتا نہیں چلا۔ حجاب نے بھی رکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسی طرح ذرا لنگڑاتی ہوئی سی شوہر کے ساتھ گارڈینیا کی باڑ کے پیچھے اوجھل ہو گئی۔

قریباً ایک منٹ بعد گارڈینیا کے عقب سے شریفاں نمودار ہوئی اور حجاب کی جوتی اٹھا کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔

ہادی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ ارم ہی علیزا ہو گی لیکن وہ نہیں تھی۔ پھر اس نے حجاب کے بارے میں ایسا سوچا۔ حجاب قد و قامت میں علیزا جیسی ہی تھی لیکن اب ثابت ہو رہا تھا کہ وہ بھی علیزا نہیں۔ ابھی تک شریفاں اور ظہیر وغیرہ سے ہادی کی جو گفتگو ہوئی تھی اس میں بھی علیزا نامی لڑکی کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔

وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ وہ یونہی خواہ مخواہ ایک بیکار چکر میں الجھ گیا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی، اسے نچا دے کر نکل گئی تھی۔ کوئی نام و نشان نہیں چھوڑا تھا اپنے۔ تو پھر اس کا پیچھا کرنے کا فائدہ؟

بیٹھے بیٹھے ایک بات اس کے ذہن میں آئی۔ ظہیر نے بتایا تھا کہ ماریہ نامی وہ اونچی ناک والی لڑکی حجاب کی قریبی سہیلیوں میں سے ہے۔ دوسری طرف وہی لڑکی علیزا کی قریبی دوست بھی معلوم ہوتی تھی۔ تو کیا کسی طرح حجاب سے علیزا کے بارے میں کچھ معلوم کیا جا سکتا تھا؟ مگر حجاب سے بات کرنا کیونکر ممکن تھا؟ جلال الدین اس کا

موقع ہرگز نہیں دے سکتا تھا اور عین ممکن تھا کہ حجاب خود بھی بات کرنا پسند نہ کرتی۔ تو کیا وہ ظہیر سے اس سلسلے میں مدد لے؟ مگر...... یہ بھی کسی طرح مناسب بات نہیں لگتی تھی۔ کیا وہ اس خاندان کی لڑکیوں کی ٹوہ لگانے کے لیے یہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ پرسوں اس نے شریفاں سے تھوڑی سی بات کی تھی اور باتوں باتوں میں پوچھا تھا کہ علیزا کون ہے؟

شریفاں نے اس نام سے لاعلمی کا اظہار کیا تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ ذرا چونکی بھی تھی کہ ہادی اس طرح کے سوال کیوں پوچھ رہا ہے۔ اس کا چونکنا ہادی کے لیے شرمندگی کا باعث بنا تھا۔

دوپہر تک ہادی نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ایک دن مزید یہاں ٹھہر کر ظہیر سے اجازت لے گا اور کسی ہوٹل میں جا ٹھہرے گا۔ اس کے لیے کوئی معقول حیا بہانہ بھی اس نے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اس دوران وہ تین چار گھنٹے ظہیر کے ساتھ روم میں گھومتا رہا۔ انہوں نے ایک دو علاقائی ڈشز کھائیں۔ تین چار جگہوں کی سیر کی اور معروف "پونڈ آف وشز" بھی دیکھا۔ جہاں دنیا بھر کے سیاح پانی میں سکے اچھالتے ہیں اور دل میں دبی ہوئی خواہشوں کو بڑی خاموشی سے دعاؤں کی شکل دیتے ہیں۔ پتا نہیں کہ یہاں کیا کیا دعائیں مانگی گئی ہوں گی۔ ان میں سے کئی دعائیں ایسی ہوں گی جو اگر منظرِ عام پر آجائیں تو بے شمار افراد کی خانگی زندگی میں تہلکہ مچ جائے۔ شاید ماضی میں مانگی گئی دعائیں ایسی بھی ہوں جنہیں مانگنے والے اب خود اپنی دعاؤں پر شرمندہ ہوں۔ کچھ دعائیں ناکام حسرتوں کا روپ دھار چکی ہوں۔ کچھ دعائیں زندگیوں میں بہار لا چکی ہوں اور کچھ دعائیں ابھی تک ان فضاؤں میں بھٹک رہی ہوں۔ پونڈ آف وشز کے مدار میں چکر لگا رہی ہوں۔ تالاب میں گرنے والی آبشاروں کے شور میں ان دعاؤں کی سرسراہٹ ہو۔

شام سے ذرا پہلے ظہیر کو اپنے سٹور پر جانا تھا۔ ہادی کی خواہش پر ظہیر نے اسے "کولیسئم" کے قریب ایک چوراہے پر اتار دیا۔ نہ جانے کیوں ہادی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس فیملی اور اس کے معاملات کو خیرباد کہنے سے پہلے ایک بار پھر خالہ صوفیہ اور انکل فیاض سے مل لے۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ کی طرف اس کا دل کھنچتا تھا۔ وہ مہربان چہرے والی خاتون اپنی شفیق مسکراہٹ سے اس کے دل کو چھو لیتی تھیں۔ ہادی کے اندازے کے مطابق انکل فیاض کا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔ ایک دو جگہوں سے پوچھ کر وہ منزل تک پہنچ گیا۔

گیٹ کی بیل بجانے پر مسکراتے چہرے والا نوجوان چوکیدار نمودار ہوا اور ہادی کو پہچان کر اندر لے گیا۔ ہادی پورچ میں کھڑا ہو گیا۔ ملازم نے اندر جا کر اطلاع دی۔ چند سیکنڈ بعد نوجوان فیصل باہر نکلا اور اس نے ہادی کو خوش آمدید کہا۔ ہادی فیصل کے ساتھ گھر کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ خالہ صوفیہ بھی وہیں موجود تھیں۔ انکل فیاض کسی اور کمرے میں تھے۔ پاس ہی کہیں ٹی وی چلنے کی مدھم آواز آ رہی تھی۔ خالہ صوفیہ اس سے بڑی محبت سے پیش آئیں۔ ان کے بے ہوش ہونے والا واقعہ ابھی ان دونوں تک ہی محدود تھا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ اسی دوران میں ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ "فیصل...... فیصل یہ دیکھو" پھر ایک لڑکی تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا اخبار تھا۔ وہ اچانک ہی اندر آ گئی تھی۔ ہادی اسے دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ وہ علیزا تھی۔ بے شک وہ علیزا تھی۔ علیزا نے بھی اسے دیکھ لیا اور بری طرح ٹھٹک گئی۔ اس نے جلدی سے دوپٹہ سر پر لے لیا۔ آنکھیں حیرت سے پھیلی

ہوئی تھیں۔ چہرہ قدرے زرد نظر آ رہا تھا۔ ایک دو سیکنڈ سکتہ زدہ رہنے کے بعد وہ تیزی سے مڑی اور دروازے سے نکل کر اوجھل ہو گئی۔

"یہ میری بیٹی حجاب ہے۔" خالہ صوفیہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ "آج ہی سسرال سے آئی ہے۔"

ہادی نے بمشکل خود کو سنبھالا اور بولا۔ "اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ پہلے سے کافی بہتر ہے۔ ہفتہ دس دن یہاں رہے گی تو بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"آ...... آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔ سسرال میں کتنا بھی پیار مل رہا ہو لیکن جس طرح ماں، بیٹی کی دیکھ بھال کر سکتی ہے کوئی اور نہیں۔"

"پیار بھی تو کافی ہوئی تھی۔" خالہ صوفیہ نے سرد آہ بھر کر کہا۔ (ابارشن والی بات وہ ہادی کو نہیں بتا سکتی تھیں)

اتنے میں انکل فیاض بھی آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں وہی اخبار تھا جو کچھ دیر پہلے علیزا کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔ وہ بھی اخبار اپنے بھائی فیصل کو دکھانے کے لیے اندر آئی تھی اور اچانک ہادی کے سامنے آ گئی تھی۔ وہ اخبار دیکھنے لگے۔ ہادی نے بھی سرسری سی نظر دوڑائی۔ انکل فیاض صاحب کی توجہ ایک جواں سال کلین شیو شخص کی تصویر پر تھی۔ تصویر کے نیچے ایک خبر کا متن تھا۔ یا شاید یہ کوئی آرٹیکل تھا۔ اس میں اسلامی طرز کی بینکنگ کے کچھ نکتے بیان کیے گئے تھے۔ اخبار دیکھ کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔

انکل فیاض بھی گھل مل کر ہادی سے باتیں کرتے رہے۔ ان میں سے ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہادی بطور مہمان ان کی بیٹی کے سسرال میں ٹھہرا ہوا ہے اور چند دن پہلے ان کی بیٹی کو اس نے خون بھی دیا ہے۔ اس دوران میں ہادی کو یہ بھی معلوم ہوا کہ حجاب کو گھر میں پیار سے صرف "حب" بھی کہا جاتا ہے۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد ہادی زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہر سکا۔ اس کا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ وہ یوں تو انکل فیاض اور خالہ صوفیہ وغیرہ سے باتیں کر رہا تھا مگر دھیان مسلسل اس "معمہ لڑکی" کی طرف لگا ہوا تھا جو کہیں علیزا تھی، کہیں حجاب تھی اور کہیں صرف ایک نقاب تھی۔ یہ بڑی ڈرامائی صورتحال لگتی تھی۔ ہادی قریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا۔ وہ دوبارہ نظر آئی اور نہ اس کی صورت دکھائی دی۔ گھر والوں سے رخصت ہو کر ہادی واپس اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ یہی چھوئی موئی لڑکی حجاب تھی جو علیزا بن کر وینس میں ہادی سے ملی۔ لیکن اس کی آنکھیں اور اس کے بالوں کا رنگ؟ علیزا کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور بالوں کا رنگ بھی قدرے مختلف تھا لیکن جو لڑکی ابھی ہادی نے انکل فیاض کے ڈرائنگ روم میں دیکھی۔ اس کی آنکھوں کا رنگ سیاہ نہیں تھا اور بال بھی شہد رنگ تھے۔ کسی فلم، ڈرامے کی سچویشن ہوتی تو ہادی ضرور سوچتا کہ یہ حجاب اس کی جڑواں بہن یا ہم شکل وغیرہ ہوگی لیکن یہ جیتی جاگتی زندگی تھی۔ ہادی نے ڈرائنگ روم میں اسے صرف آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے دیکھا تھا۔ وہ سو فیصد علیزا تھی۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں امڈنے والی شناسائی۔ تو پھر کیا معاملہ تھا۔

جب وہ وینس میں اس سے ملی تو شاید اس نے بالوں کو رنگ کیا ہوا تھا اور آنکھیں؟ آنکھوں پر لینز لگائے گئے

ہوں گے۔ بالوں کو رنگنا اور مختلف رنگوں کے لینز لگانا "فی زمانہ" اکثر خواتین کو بہت بھاتا ہے۔

یہاں ایک اور سوال بھی تھا۔ حجاب کو وینس میں جب ہادی نے علیزا کے روپ میں دیکھا تو وہ ایک الٹرا ماڈرن لڑکی تھی۔ اس نے پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ بال پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے مگر یہاں وہ سر تا پا چادروں اور نقابوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ ان دو روپ میں کس قدر تضاد تھا۔ کیا یہ کسی عمل کا ردِ عمل تھا؟ یا اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی۔ ہادی جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی اس کا ذہن اُلجھ رہا تھا۔ اب پتا نہیں کیا بات تھی کہ علیزا یعنی حجاب کا شادی شدہ ہونا بھی ہادی کے لیے ایک عجیب سی بے نام چبھن کا باعث بنا تھا۔

ایک بات تو طے تھی۔ علیزا یا حجاب اس کی یہاں موجودگی سے سو فیصد آگاہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ان کے گھر کی انیکسی میں بطور مہمان ٹھہرا ہوا ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں اس نے مکمل خاموشی اختیار کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ ہادی نقابوں اور چار دیواریوں کے پیچھے جھانکنے میں ناکام رہے گا اور دو چار دن میں یہاں سے چلا جائے گا اور یقیناً ہونا بھی ایسا ہی تھا۔ اگر آج اچانک علیزا کے سامنے آنے والا واقعہ نہ ہوتا تو ہادی نے اس تناؤ بھرے ماحول سے نکل جانا تھا۔

○......❀......○

وہ گھر پہنچا اب ظہیر بھی آنے ہی والا تھا۔ لیکن ہادی اس قدر "اپ سیٹ" تھا کہ کسی سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے شریفاں سے کہا کہ اس کے سر میں ہلکا درد ہے اور وہ سونے کے لیے جا رہا ہے۔ اپنے کمرے میں بند ہو کر وہ دیر تک اس "معمہ لڑکی" کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہ علیزا نہیں تھی۔ وہ حجاب تھی اور جلال جیسے سخت گیر شوہر کی بیوی تھی۔ آج صبح سویرے بھی میاں بیوی کے درمیان کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ روتی سسکتی بیوی کہیں جا رہی تھی جب جلال نے اسے روکا تھا اور سخت رویہ اختیار کر کے اسے واپس لے گیا تھا۔ یقیناً اس وقت حجاب نے اپنے ماں باپ کے گھر آنے کا ارادہ ہی کیا تھا۔ تب جلال نے کہا تھا کہ اگر اس نے جانا ہی ہے تو وہ خود اسے چھوڑ کر آئے گا۔ اب علیزا یعنی حجاب اپنے والدین کے گھر میں تھی۔ وینس میں اپنی گفتگو کے دوران میں اس نے ہادی سے عورتوں کی مجبوریوں اور ان کے مصائب کے بارے میں جو باتیں کی تھیں وہ ہادی کے ذہن میں تازہ تھیں۔ تو کیا اس کا مطلب تھا کہ وہ باتیں جگ بیتی نہیں آپ بیتی کے زمرے میں آتی تھیں۔

خبر نہیں کہ ہادی کتنی دیر ان سوچوں میں غلطاں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ آج شب روم کی فضا میں تھوڑی سی گرمی تھی۔ شریفاں نے اس کے آنے سے پہلے ہی کمرے کا اے سی آن کر دیا تھا۔ ٹھنڈک محسوس ہوئی تو ہادی نے اُٹھ کر اے سی آف کر دیا اور ہلکا سا پنکھا چلا دیا۔ اب رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ کوٹھی میں سکوت تھا مکین سو رہے تھے۔ بس کبھی کبھی چوکیدار کی وسل کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ اتنے میں ہادی کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ کوئی نامعلوم نمبر تھا۔ اٹلی کا ہی تھا۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ایک دھیمی نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو......"

"کون بول رہا ہے؟" ہادی نے پوچھا۔

"آ...... آپ ہادی ہی ہیں نا؟" دوسری طرف سے دریافت کیا گیا۔

ہادی کا دل سینے میں اُچھل کر رہ گیا۔ وہ پہچان گیا۔ یہ علیزا ہی کی آواز تھی۔ علیزا یعنی حجاب۔ وہ خود کو سنبھالتے

ہوئے بولا۔ "جی! میں ہادی ہوں اور آپ کو کیا کہوں؟"

"میں کچھ نہیں؟"

"آپ کو علیزا کہوں یا حجاب؟"

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی۔ پھر حجاب کی مدھم آواز آئی۔ آپ کیوں میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ایسی کون سی غلطی کر دی ہے؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے کیا غلطی کر دی لیکن پہلے آپ بتائیں کہ آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟"

فیصل کے سیل فون سے لیا ہے۔" دوسری طرف سے سپاٹ لہجے میں جواب ملا۔

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا کہ میں آپ کی آواز سن رہا ہوں۔"

وہ ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "دیکھیے ہادی صاحب! میں نے آپ کو ایک شریف ہم وطن سمجھا اور آپ نے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا۔ ہم اکٹھے گھومے پھرے اور پھر خوش دلی سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ میں آپ کے حوالے سے کچھ اچھے تاثرات لے کر لوٹی۔ اور میرے خیال میں آپ کی کیفیت بھی یہی ہونی چاہیے تھی۔ یہ ایک بڑا اچھا اختتام تھا۔ مجھے آپ سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی......"

"کیسی توقع؟"

"یہی جو آپ کر رہے ہیں۔" اس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ "میری ٹوہ لگاتے ہوئے آپ میرے گھر پہنچے اور پھر یہاں اسی کے گھر بھی پہنچ گئے۔ م...... میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ کیا چاہ رہے ہیں۔" اس کی آواز میں خوف کی لرزش بھی شامل ہو گئی۔

"یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا ہے۔ شاید آپ نے دیکھا ہی ہو گا۔ میں وہاں آئس کریم بار میں گیا تھا۔ وہاں آپ کے ظہیر صاحب نے مجھے پہچان لیا۔ انہوں نے ایک دن پہلے اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی۔ وہ اٹھ کر میری میز پر آئے اور بعد میں زبردستی اپنے گھر بھی لے آئے۔"

"میں یہ بات نہیں مان سکتی۔"

"کون سی بات؟"

"یہی کہ آپ اتفاقاً اس آئس کریم شاپ پر آ گئے تھے۔ آپ یقیناً پہلے سے میرے پیچھے تھے۔" وینس میں اس کی آواز بھرائی ہوئی رہی تھی لیکن اب بالکل صاف اور کھنک دار تھی۔

ہادی چند سیکنڈ کے لیے خاموش ہو گیا۔ وہ بات ٹھیک ہی کہہ رہی تھی وہ اتفاقاً آئس کریم بار میں نہیں گھسا تھا۔ اس نے پہلے اونچی ناک والی ماریہ کو دیکھا تھا اور پھر بار میں انٹری دی تھی۔

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں؟" وہ سنبھل کر بولا۔

"آپ کو یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پلیز میری چھوٹی سی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس کا نتیجہ میرے لیے کتنا بُرا نکل سکتا ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔ میرے گھر والوں کو پتا چل

گیا تو قیامت برپا ہو جائے گی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"علیزہ! میرا مطلب ہے حجاب! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ میری وجہ سے آپ کے لیے کوئی مشکل کھڑی ہو۔ مجھے تو صرف یہ تجسس تھا کہ آپ وینس کے اس ریستوران میں بیٹھے بٹھائے اچانک کہاں چلی گئیں۔ کہیں خدانخواستہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ میں سوچتا تھا کہ اگر آپ خود گئی ہیں تو اس طرح اچانک کیوں گئی ہیں؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی جس کی وجہ سے آپ ناراض ہوئیں۔ یا پھر ایسی ہی کوئی اور وجہ؟"

"کوئی وجہ نہیں تھی ہادی صاحب! کچھ بھی نہیں تھا۔ بس مجھے لگا کہ ہمیں اب الگ ہو جانا چاہیے اور میں آ گئی۔"

"آپ نے یہ بھی نہ سوچا کہ میں وہاں آپ کا انتظار کرتا رہوں گا اور دیوانوں کی طرح منہ اٹھا کر گھومتا رہوں گا۔ دکانوں میں جھانکوں گا، راہگیروں سے پوچھوں گا۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ اتنی سی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ پلیز آپ چلے جائیں یہاں سے۔ ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔"

ہادی مسکرایا اور ہلکے پھلکے لہجے میں بولا" اور ان سوالوں کا کیا ہوگا جو میرے ذہن میں پیدا ہو گئے ہیں۔ کچھ وہاں وینس میں اور کچھ یہاں روم میں آپ کے گھر کو اور وہاں کے ماحول کو دیکھ کر۔"

وہ ترشناک آواز میں بولی۔ "ضروری نہیں ہوتا کہ ہر سوال کا جواب ڈھونڈا جائے اور مل بھی جائے اور یہاں کوئی ایسا اہم سوال ہے بھی نہیں۔ میں ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ شادی شدہ زندگی کے جو تھوڑے بہت مسائل ہوتے ہیں وہ میرے ساتھ بھی ہیں۔ ہر کسی کے ساتھ ہوتے ہیں۔ یہاں کچھ بھی ایسا نہیں ہے ہادی صاحب! جس کی آپ جستجو کر سکیں اور جس میں آپ کی دلچسپی کا کوئی سامان ہو۔"

ہادی نے کہا۔ "ٹھیک ہے حجاب صاحبہ! میں مانتا ہوں کہ آپ ایک سیدھی سادی گھریلو لڑکی ہیں۔ شادی شدہ اور باپردہ ہیں۔ لیکن اس لڑکی کو میں نے وینس میں ایک اور ہی چنچل روپ میں دیکھا ہے۔ جین اور جوگر کے ساتھ بھاگتے دوڑتے جھولے جھولتے اور پیڈل بوٹ چلاتے۔ اس لڑکی میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"بس...... بس سمجھیں کہ وہ ایک ڈرامہ تھا۔ جو مجھے کسی مجبوری کی وجہ سے کرنا پڑا، کسی کی خاطر۔ آپ اس کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔" وہ پھر روہانسی ہو گئی۔

اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ بات کو لپیٹ رہی ہے۔ سچائی کے قریب بھی جانا نہیں چاہتی۔ ہادی بھی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ وہ ایک تخلیق کار تھا۔ انسانی نفسیات کی گتھیوں کو سمجھنا اور سلجھانا اسے پسند تھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا چل رہا ہے۔ وہ کیا خوف ہے جس نے اسے اور اس کے ماں باپ کو اتنی بُری طرح جکڑ رکھا ہے۔ لڑکی والوں کا لڑکے والوں سے دب کر رہنا کوئی انوکھی بات نہیں ہوتی لیکن یہاں یہ صورت حال کچھ زیادہ گھمبیر تھی۔ بلکہ اسے ترسناک کہنا مناسب تھا۔

پھر ہادی کے ذہن میں وہ تصویر والی بات آئی۔ وہاں حجاب کے میکے میں ایک کمرے کے اندر ایک لڑکی کی

دیوار گیر تصویر لگی تھی۔ اس کے نیچے غالباً حجاب کے ہاتھ سے لکھا گیا تھا۔ "میں تمہیں کبھی بھول نہ پاؤں گی۔"

حجاب فیاض!

وہ کون لڑکی تھی؟ کیا اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ چکا تھا یا وہ کسی وجہ سے علیزہ یعنی حجاب سے جدا ہو گئی تھی۔

بہت سے سوال ہادی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

"آپ کی ایک چیز میرے پاس پڑی ہے۔ وہ میں آپ کو واپس دینا چاہتا ہوں۔" ہادی نے بات بنائی۔

"آپ پارکر پین سیٹ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ آپ کا...... حق بنتا تھا۔ آپ نے زبردستی کر کے ہر جگہ اپنا پرس کھولا تھا۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا۔ آپ ویسے تو ہرگز پیسے نہ لیتے۔ میں نے قلم آپ کے بیگ میں رکھ دیئے۔"

"اگر آپ نے اتنی ہی باریکی سے حساب کتاب کرنا تھا تو پھر پورا کر لیتیں۔ میرے پاس سب لکھا ہوا ہے۔ ڈائری میں حساب لکھنا میری Habit ہے۔"

"کیا...... کچھ اور نکلتے ہیں میری طرف سے؟"

"نہیں آپ کے نکلتے ہیں...... کم از کم 60 یورو۔"

"نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ رکی لہجے میں بولی۔ "آپ نے کچھ اور بھی تو کیا ہے میرے لیے۔ مجھے پتا ہے جب میں ہسپتال میں تھی تو آپ نے مجھے خون دیا۔ اس کی قیمت تو میں چکا ہی نہیں سکتی۔ بس آپ کے احسان کا شکریہ ادا کر سکتی ہوں۔"

"تو پھر آپ نے مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع کیوں نہیں دیا؟"

"چلیں غلطی ہو گئی۔ اب اس کے لیے بھی مجھے معاف کر دیں اور پھر صرف ایک درخواست ہے پلیز آپ چلے جائیں۔ ایک اچھے دوست کی حیثیت سے میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔" اس کے لہجے میں عجلت اور بیگانگی تھی۔

یہ عجلت اور بیگانگی ہادی کو بُری لگ رہی تھی۔ وہ اس سے کم از کم ایک بار تو ضرور ملنا چاہتا تھا اور وہ اس پوزیشن میں تھا بھی کہ علیزہ کو اس کے لیے مجبور کر سکتا۔ ویسے بھی وہ آٹھ دس دن کے لیے میکے آئی ہوئی تھی۔ تھوڑا بہت وقت نکال سکتی تھی۔

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے علیزہ! میرا مطلب ہے حجاب صاحبہ! آپ کہتی ہیں تو میں چلا جاتا ہوں بلکہ شاید دو چار دن میں اٹلی سے ہی چلا جاؤں۔ لیکن ایک چھوٹی سی بے ضرر شرط ہے۔ امید ہے آپ قبول کریں گی۔"

"کیا؟" وہ ڈری ڈری آواز میں بولی۔

"آپ نے مجھے دوست کہا ہے اور میں حقیقتاً ایک مخلص دوست ہی ہوں۔ کم از کم ایک بار مجھ سے کہیں مل لیں۔ بس تھوڑی دیر کے لیے۔ ہم ایک دوسرے کو اچھے طریقے سے خدا حافظ کہہ دیں گے۔"

وہ چپ رہی۔ ہادی نے سمجھا شاید سوچ رہی ہے لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مزید بیگانہ ہو چکا تھا۔ "معاف کیجئے ہادی صاحب! یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔"

''لیکن میں تو آپ کی بات مان رہا ہوں۔''

''تو اس کا کیا مطلب ہے؟ میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے بلیک میل کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''یہ کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟''

''وہی جو آپ سمجھا رہے ہیں مجھے۔'' اس کا لہجہ مزید تلخ ہو گیا۔ ''افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔ ہم نے ایک بڑے اچھے موڑ پر بات ختم کی تھی، لیکن آپ پھر دندناتے ہوئے آ گئے ہیں میرے گھر تک۔ آپ...... آپ وہی کچھ کر رہے ہیں جو آپ جیسے مرد کرتے ہیں۔ آپ میں اور ان مردوں میں شاید کوئی فرق نہیں جو عورت کو بس ایک ہی روپ میں دیکھتے ہیں ان کو بس گھیرنا چاہتے ہیں۔'' اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

''یہ کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟''

''پلیز شٹ اپ...... پلیز شٹ اپ......'' وہ چنگھاڑ اٹھی۔ ''مجھے نہیں بلیک میل ہونا ہے آپ سے۔ میں نہیں مل سکتی۔ نہیں مل سکتی۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں نے آپ کو دوست کہا۔ آپ کے ساتھ وقت گزارا۔ مجھے شرم آ رہی ہے۔'' اس کی آواز غصے سے بھرا گئی۔

''آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔''

لیکن دوسری طرف سے رابطہ کٹ چکا تھا۔ ہادی نے کچھ دیر فون کان سے لگائے رکھا پھر مرے مرے انداز میں نیچے رکھ دیا۔ اسے حجاب سے اتنے شدید ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

اسے غلطی کا احساس ہونے لگا۔ شاید اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یہاں سے جانے کے لیے اس سے ملنے کی شرط نہیں رکھنی چاہیے تھی۔ یقیناً اس نے محسوس کیا تھا کہ ہادی اس پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ اپنے حالات کی وجہ سے وہ پہلے ہی ڈپریشن میں تھی۔ اب مزید ڈپریسڈ ہو گئی تھی۔

ہادی کو افسوس ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر بعد اسی نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ خاموش ہو چکا تھا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اس نمبر پر کال کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اب نمبر تو آن ہو گیا تھا لیکن کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ وہ قریباً ایک گھنٹے تک وقفے وقفے سے کوشش کرتا رہا۔ آخر ایک جوابی ایس ایم ایس آیا۔ یہ اس نمبر سے تھا۔ حجاب نے بس اتنا لکھا تھا۔ ''پلیز پلیز پلیز میرے حال پر رحم کریں۔''

حجاب کی شکل ہادی کی نگاہوں میں گھوم گئی۔ وہی تابندہ پیشانی، وہی جاذب نقوش، جن میں معصومیت کا عنصر نمایاں تھا۔ اس کے ساتھ ہی خالہ صوفیہ کا مہربان چہرہ بھی نگاہوں میں گھوما۔ یہ ماں بیٹی مشکلات کا شکار تھیں بلکہ پورا گھرانا ہی شکار تھا۔ ہادی ان کی مشکلات میں اضافے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر گم صم رہنے کے بعد اس نے موبائل فون اٹھایا اور ایس ایم ایس لکھ دیا۔ ''او کے حجاب! میں وہی کروں گا جو آپ چاہتی ہیں۔ گڈ بائے۔''

ایس ایم ایس لکھ کر جیسے اس کے سینے سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ وہ کچھ دیر تک حجاب کے کسی جوابی میسج کا انتظار کرتا رہا۔ جب نہیں آیا تو وہ تھوڑی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد سو گیا۔

اگلے روز ہادی صبح اٹھا تو طبیعت میں کچھ بھاری پن تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ شریفاں کو آواز دے اور بیڈ ٹی کے لیے کہے لیکن پھر اسے اندازہ ہوا کہ وہ انیکسی میں نہیں ہے۔ اگر ہوتی تو کہیں نہ کہیں سے کھٹ پٹ کی آوازیں ضرور آ رہی ہوتیں۔ وہ شاید رہائشی حصے کی طرف گئی ہوئی تھی۔ وہ یونہی لیٹا رہا۔ رات والی فون کال کی ساری تفصیل ذہن میں تازہ ہونے لگی۔ اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ آج سہ پہر تک یہاں سے چلا جائے گا۔

کچھ دیر بعد شریفاں خود ہی کمرے میں نمودار ہو گئی۔ ''سلاماں لیکم صاحب جی!'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

''کہاں چلی گئی تھیں؟'' ہادی نے پوچھا۔

وہ ذرا منہ بنا کر بولی۔ ''وہی بی بی ارم کے لیے نیبو والا قہوہ بنانے کے لیے۔ وہ صبح سویرے پیتی ہیں۔ کافی نخرے شخرے ہیں ان کے۔ بس اب آ گئی ہیں نا میری جان کو مصیبت پڑی رہے گی۔''

''کیوں تمہیں ان کا آنا اچھا نہیں لگا۔''

''کسی کو بھی نہیں لگتا جی! بلکہ میرا تو اندازہ ہے کہ خود فوزیہ باجی کو بھی چنگا نہیں لگتا۔ پر وہ پھر بھی آ جاتی ہیں اب تو...... سنا ہے کہ پکا ہی آ گئی ہیں۔ ان کا داخلہ یہاں کے ایک کالج وچ ہو گیا ہے۔ اب ادھر ہی رہیں گی۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔'' شریفاں نے بیزاری سے سر ہلایا۔

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسے زیادہ پسند نہیں کرتی۔

اتنے میں ظہیر بھی آ گیا۔ ہادی نے کل رات ہی ظہیر کو ذہنی طور پر تیار کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ وہ اب ذرا چینج چاہ رہا ہے۔ اس کے دوست نے یہاں کے ایک ہوٹل واسکوڈے میں قیام کیا تھا۔ اب وہ بھی دو چار روز وہاں رہنا چاہتا ہے ورنہ اسے روم کی سیر ادھوری لگے گی۔

ظہیر نے ہادی کو روکنے کی کوشش تو کی تھی لیکن زیادہ جوش سے نہیں۔ ہادی کو اندازہ ہوا تھا کہ شاید ظہیر کے بھائی جان جلال، یہاں مہمان خانے میں ہادی کے طویل قیام کو زیادہ پسند نہیں کر رہے۔ پچھلے سات آٹھ روز میں وہ صرف ایک بار یہاں آ کر ہادی سے ملے تھے اور وہ بھی کھڑے کھڑے (اس دوران میں بھی جناب کا فون مسلسل بجتا رہا تھا۔)

ظہیر کے آتے ہی شریفاں باہر چلی گئی۔ ظہیر نے مایوس لہجے میں کہا۔ ''یار! اب تو تمہارے ساتھ دل لگنا شروع ہوا تھا۔ اب تم اڑن چھو ہو رہے ہو۔ ابھی تو ارم بھی ہوٹل میں تمہیں ڈنر دینا چاہ رہی تھی۔''

''اس سے کہہ دیا ظہیر بھائی تو مجھے یاد آ گیا۔ میری بہن سے میری طرف سے معذرت کر دینا۔''

''یہ معذرت تو تمہیں خود ہی کرنا پڑے گی۔ ابھی بھائی جلال جاتے ہیں تو وہ تم سے ملنے آتی ہے۔''

ظہیر کے فقرے سے ہی ظاہر تھا کہ اس گھر میں کوئی بھی کام کرنے سے پہلے جلال الدین کی خوشی یا ناراضی کا سوچا جاتا ہے۔ جن کاموں میں اس کی ناراضی کا ڈر ہو وہ اس کی غیر موجودگی میں کیے جاتے ہیں۔ مثلاً ارم اس سے ملنا چاہ رہی تھی لیکن ابھی تک نہیں مل تھی۔

سہ پہر تک ہادی جانے کے لیے سامان پیک کر چکا تھا۔ ان چند دنوں میں شریفاں کے ساتھ اس کی کافی بے تکلفی ہو چکی تھی۔ وہ آزردہ نظر آ رہی تھی۔ اپنی گلابی اردو میں بولی۔ "اچھے تے سب ہی ٹھیٹ اردو میں گل کرتے ہیں۔ میری تو زبان کو ول پے گیا ہے اردو بول بول کے۔ آپ نے اک دو واری میرے نال پنجابی چے گل کیتی ہے تو مجھے اپنے پنڈ کے کھیتوں اور باغوں کی خوشبو آئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں شریفاں! میں تمہیں کبھی کبھی فون کیا کروں گا۔" ہادی نے کہا۔

اس دوران میں ارم بھی آ گئی۔ اس نے چادر کا رسمی سا نقاب کر رکھا تھا اس نقاب نے صرف اس کے ہونٹ اور ناک کا مختصر سا حصہ چھپایا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ پردے کی عادی نہیں مگر یہاں جلال الدین کی مرضی پر چلنا پڑتا تھا۔ ارم قبول صورت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ عمر میں حجاب سے کچھ چھوٹی ہو لیکن اپنے خدوخال کی وجہ سے حجاب کی ہم عمر ہی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور ایک خاص طرح کی ہوشیاری تھی۔ اس نے ہادی کو بھائی جان کہہ کر مخاطب کیا اور کہا کہ وہ ہادی کو بطور گیت نگار جانتی ہے اور ٹی وی سے نشر ہونے والے اس کے ایک دو گیت اسے بہت اچھے لگے ہیں۔ اس نے چار پانچ منٹ ہادی سے بات کی۔ وہ گفتگو کا فن جانتی تھی اور ان لوگوں میں سے تھی جو بات چیت کے دوران میں اپنے بارے میں کم بتاتے ہیں اور دوسرے کے متعلق زیادہ سے زیادہ جان لیتے ہیں۔

ظہیر نے اطلاع دیتے ہوئے بتایا۔ "بھائی جلال کی کوشش سے ارم کو یہاں روم کی ہی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے۔ اب اسے وینس کی دال روٹی نہیں کھانا پڑے گی۔"

وہ شوخی سے بولی۔ "جیجا جی! دال روٹی تو خیر میں وہاں بھی نہیں کھاتی تھی۔ بہترین Cook بن گئی ہوں ان چار مہینوں میں۔ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ آپ مجھے مستقل کام پر لگا دیں گے تو آپ کو اپنی کوکنگ کے ایک دو نمونے ضرور دکھاتی۔"

"بہت دور کی سوچتی ہو بھئی تم۔ تمہیں تو اقوام متحدہ کے پلاننگ سیکشن میں ہونا چاہیے۔" ظہیر نے کہا اور ہنسنے لگا۔ ہنستے ہوئے اس کی توند علیحدہ سے ہنستی تھی۔

شریفاں بُرا سا منہ بناتے ہوئے باہر چلی گئی تھی۔ ہادی کو ارم کا کردار کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس گھر میں اس کی موجودگی کو اس کی سگی بہن بھی کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی۔ پھر بھی وہ یہاں موجود تھی۔

شام سات بجے کے لگ بھگ ہادی اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ یوں تو وہ ظہیر، شریفاں اور ارم وغیرہ سے کہہ کر آیا تھا کہ ان سے فون پر رابطہ رکھے گا۔ تاہم وہ اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس نے حجاب سے جو کمٹمنٹ کی ہے اس پر پورا اترے اور اب ان لوگوں کی زندگی میں کسی طرح کا کوئی دخل نہ دے۔ خاک ڈال دے سارے معاملے پر۔ غالباً حجاب نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ان دونوں کے اس بے ضرر تعلق کے بارے میں کسی کو بھی پتا چل گیا تو قیامت آ جائے گی۔ وہ اس گھر کا گھٹن سے پُر ماحول دیکھ چکا تھا اور خاص طور سے جلال الدین کا رویہ بھی ملاحظہ کر چکا تھا۔ اسے معلوم تھا جلال جیسے لوگ ایسے معاملوں میں بے حد "تنگ" اور جذباتی ہوتے ہیں۔"

○......◆......○

اگلے پانچ چھ روز ہادی نے روم میں گھومتے ہوئے ہی گزارے۔ اسے تاریخ میں بہت دلچسپی تو نہیں تھی لیکن وہ جن جگہوں کی سیاحت کرنا چاہ رہا تھا ان کے بارے میں اس نے کچھ نہ کچھ پڑھا تھا۔ روم میں جو چند جگہیں اسے لازمی دیکھنا تھیں۔ ان میں پونڈ آف وشز یعنی خواہشوں کا تالاب۔ کولیسیئم یعنی وہ قدیم جنگی اکھاڑا جہاں انسان بھوکے شیر سے لڑتے تھے۔ گلیڈی ایٹر سکول جہاں سیاحوں کو بتایا جاتا ہے کہ گلیڈی ایٹر کیسے بنا جاتا ہے۔ اور پھر روم سے ذرا آگے پومپائی کے کھنڈرات جہاں انسان لاوے میں منجمد ہیں اور روم کی بڑی مسجد جو یورپ کی سب سے بڑی مسجد بھی ہے اور "ویٹی کن" یعنی عیسائیوں کا مقدس شہر وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے پونڈ آف وشز وہ دیکھ چکا تھا باقی اتنی تعداد جگہیں ابھی دیکھنے والی تھیں۔ وہ صبح سویرے نکل جاتا اور شام کو تھکن سے چُور ہو کر واپس آ جاتا۔ یہ مصروفیت اس کے لیے ایک طرح سے سود مند بھی تھی۔ وہ علیزا یعنی حجاب کی طرف سے اپنی توجہ ہٹانے میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کی تابندہ پیشانی، اس کے جاذب نقوش اور نقوش کے پیچھے چھپے ہوئے مسائل دھیرے دھیرے اس کی سوچ میں دھندلانے لگے۔ اٹلی کے پیزے کے بارے میں اس نے بہت سنا تھا۔ بلکہ اسے معلوم ہوا تھا کہ پیزا ایجاد ہی اٹلی سے ہوا تھا۔ یہاں اسے بیسیوں قسم کے پیزے دیکھنے کو ملے۔ کھانے کے وقت جہاں کوئی اچھی پیزا شاپ نظر آتی وہ اس میں گھس جاتا۔ اس نے مقامی دوستوں میں سے صرف دو بندوں کو بتایا تھا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا ہے اور ساتھ ہی ان کو تاکید بھی کر دی تھی کہ وہ اس قیام کو راز میں رکھیں۔ وہ کاغذ اور قلم سے دور ہونے کے لیے یہاں آیا تھا لیکن یہ دوست احباب اسے پھر ان چیزوں کی طرف گھسیٹ لاتے تھے۔ وہ چند ہفتے آزادی کے چاہتا تھا۔ مکمل آزادی کے۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ اسے اپنے اردگرد کوئی شناسا چہرہ نظر ہی نہ آئے۔ بس وہ اجنبی لوگوں کے درمیان، اجنبی جگہوں پر گھومتا رہے اور اس کے کانوں میں اجنبی ناقابلِ فہم الفاظ ہی پڑتے رہیں۔ اگلے تین چار دن میں دو بار ظہیر کا فون آیا۔ ہادی نے اس سے بھی مختصر بات ہی کی۔ اس کے دل میں کوئی کھد بد پیدا ہو چکی تھی۔ وہ اس کھد بد کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ کسی ایسی کیفیت کا اسے پہلے کبھی کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا کہ اس کے سینے میں کوئی پتھریلی جگہ اچانک نرم گداز شکل اختیار کر گئی ہے۔ رات کو جب وہ بستر پر لیٹتا تو اس کی سماعت کو وہی الفاظ مجروح کرنے لگتے جو اپنی فون کال میں حجاب نے کہے تھے۔

"آپ سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ عورت کو بس ایک ہی روپ میں دیکھتے ہیں۔ اس کو کسی طرح گھیرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ وقت گزارا۔"

چند دن تو ان جملوں کی تلخی کافی شدید رہی، پھر ان کی کاٹ کا اثر کم ہونے لگا۔ بالکل جیسے حادثات اور ناپسندیدہ واقعات کے بُرے اثرات بتدریج معدوم ہونے لگتے ہیں۔ لیکن سینے کے اندر کا وہ بے نام گداز جوں کا توں رہا۔

یہ نویں دسویں روز کا واقعہ ہے۔ ہادی اپنے ہوٹل کی بالکونی میں بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ یہ بالکونی یہاں کی اکثر بالکونیوں کی طرح پھولوں سے لدی ہوئی تھی۔ یہ ہوٹل کا سیکنڈ فلور تھا اور یہاں سے نیچے سڑک کا منظر واضح نظر آتا تھا۔ ٹریفک رواں دواں تھی۔ اس ٹریفک میں کھلی چھت کی تفریحی کاریں اور ہر طرح کے سکوٹر بھی نظر آتے

تھے۔ شام کا جھٹپٹا دھیرے دھیرے رات کی سیاہی میں ڈھل رہا تھا اور روم کی ہزار ہا روشنیاں نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ سڑک کی دوسری جانب ایک کشادہ گلی میں ایک کار پارک تھی۔ اس میں ایک مخمور جوڑا رومانی موڈ میں موجود تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں لیا ہوا تھا۔ لپٹ رہے تھے، چوم رہے تھے اور اس طرح کی دیگر حرکات میں مصروف تھے۔ ہادی کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ چھوٹی سی کار اب اس بھرے ہوئے جوڑے کے لیے ناکافی ہے اور اب وہ کہیں اور جانا چاہیں گے۔ شاید کسی ہوٹل میں یا پھر کسی گھر کے بیڈروم میں اور پھر یہی ہوا۔ کار وہاں سے روانہ ہوگئی۔ ہادی نے اپنی توجہ دیگر مناظر کی طرف مبذول کر دی۔ مناظر کی یہاں کوئی کمی نہیں تھی۔ ہر مزاج کے شخص کے لیے ہر طرح کا سنجیدہ اور غیر سنجیدہ منظر یہاں موجود تھا۔

اچانک ہادی کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے سکرین دیکھی۔ مقامی نمبر تھا وہ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر ایک دم اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہوگئی۔ اس نمبر سے ایک بار حجاب نے اسے فون کیا تھا۔ تو کیا یہ حجاب تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس نے لرزتی انگلیوں سے کال ریسیو کی۔

دو سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کھنک دار نسوانی آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"ہیلو کون؟" ہادی نے جانتے بوجھتے سوال کیا۔

"میں حجاب بول رہی ہوں۔ کیسے ہیں آپ؟"

"بس ٹھیک ہوں۔" ہادی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

"کہاں پر ہیں اس وقت؟"

"یہیں روم سنٹرم میں واسکوڈے ہوٹل ہے۔ آپ نے کیسے یاد کیا؟"

"بس یونہی دل چاہ رہا تھا بات کرنے کو۔ آپ اس وقت مصروف تو نہیں؟"

"نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"یہ ہوٹل واسکوڈے یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میٹرو ٹرین کے ذریعے دس منٹ کا راستہ ہے۔ آپ کا روم نمبر کیا ہے؟"

ہادی کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ "118 سیکنڈ فلور۔ لیکن کیا آپ آنا چاہ رہی ہیں۔"

"شاید۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"مجھے آپ ناراض لگ رہے ہیں۔ ہماری جو آخری بات چیت ہوئی وہ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مجھے آپ سے اس طرح نہیں بولنا چاہیے تھا۔"

ہادی کو ڈر محسوس ہوا کہ وہ کہیں فون پر ہی معافی تلافی نہ کر لے۔ وہ ذرا زور سے بولا۔ "آپ کی آواز صاف نہیں آ رہی۔ شور آ گیا ہے لائن میں......"

"اچھا چلیں.... میں آتی ہوں آپ کے پاس۔" وہ بھی ذرا زور سے بولی۔ "تقریباً آدھ گھنٹہ لگے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ہوٹل میں ہی ہوں۔" ہادی نے بلند آواز میں کہا۔

فون بند کر کے وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔ سیل فون اس کی ٹھوڑی کو چھو رہا تھا۔ یہ کیسی کایا کلپ ہوئی تھی۔ ہادی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس طرح حجاب کا فون آئے گا۔ نہ صرف فون آئے گا بلکہ وہ خود بھی ہوٹل آنے کو تیار ہوگی۔

اس نے جلدی جلدی کمرے میں بکھری ہوئی اشیاء سمیٹیں۔ بیڈ شیٹ درست کی لباس چینج کیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ ٹھیک آدھ گھنٹے بعد وہ وہاں پہنچ گئی۔ وہ چمکیلی دھاریوں والی اسی سیاہ چادر میں تھی جس میں پہلے بھی یہاں نظر آتی رہی تھی۔ نقاب میں سے بس اس کی دلکش آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔ کندھے سے بیگ جھول رہا تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے چادر میں لگی ہوئی Pins کھولیں اور اسے اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اسٹائلش شلوار قمیص میں تھی۔ یہ ہاف سلیو قمیص تھی جو اس کے چکیلے بازوؤں کو نمایاں کر رہی تھی اور متناسب جسم پر بہت جچ رہی تھی۔

"آپ کیا پئیں گی؟"

"کچھ نہیں۔ بس بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"پھر بھی کچھ تو ہونا چاہیے۔"

"پھر گرین ٹی منگوا لیجیے۔" اس نے کہا۔

اس میں آج پھر اسی علیزا کی جھلک نظر آ رہی تھی جس سے وینس میں ملاقات ہوئی تھی۔ تاہم وہ کچھ افسردہ بھی دکھائی دیتی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں دیکھ کر ہادی کو احساس ہوا کہ ان پلکوں کے پیچھے کوئی گمبھیر غم کروٹیں لے رہا ہے اور شاید چند گھنٹے پہلے تک وہ روتی بھی رہی ہے۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"یہی کہ آپ کی آنکھوں کا یہ رنگ اصلی ہے یا وہ اصلی تھا جو وینس میں دیکھا تھا۔"

"اُس وقت میں نے لینز لگا رکھے تھے اور بال بھی ڈائی کیے ہوئے تھے۔ اصلی وہی ہے جو آپ کو اس وقت نظر آ رہا ہے۔" وہ پھر مسکرائی اور اس کی پیشانی کا چاند چمک اُٹھا۔

"آپ نے کہا تھا کہ کوئی مجبوری تھی اس وقت...... جس کے سبب آپ کو وہ رنگ روپ اختیار کرنا پڑا۔"

"مجبوری ہی کہہ لیں لیکن کیا آپ کو صرف پرانی باتیں ہی کرتے رہنا ہے۔ کوئی نئی بات کریں بھئی۔ کیا کر رہے ہیں؟ کہاں کہاں گھوم رہے ہیں؟ اور آج کل موڈ کیا ہے آپ کا وغیرہ وغیرہ؟ کہیں مجھے آپ کے کان کے پاس پھر تو کوئی غبارہ نہیں پھوڑنا پڑے گا۔" اس نے کہا اور خود ہی ہنس دی۔

"صورت حال تو آپ نے کچھ ایسی ہی بنائی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ سنبھال لیا خود کو۔" ہادی نے بوجھل آواز میں کہا۔

وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں میں دبا رکھا تھا۔ یہ بڑا پیارا انداز تھا اس کا۔ چند سیکنڈ بعد بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ سے اس طرح کا رویہ اختیار کیا۔ میں واقعی معافی چاہتی

ہوں آپ سے۔ دیکھیے چل کر آپ کے پاس آ گئی ہوں۔ گھر آنے والے جانی دشمن کو بھی معاف کر دیا جاتا ہے۔"

"چلیں...... آپ کو احساس ہو گیا۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ یقیناً مجھ سے بھی بیوقوفی ہوئی کہ میں نے آپ پر دباؤ ڈال کر آپ سے ملاقات کرنا چاہی اس کے لیے میں بھی بہت معذرت چاہتا ہوں۔"

"نو ٹینشن ہادی صاحب! اِٹ اِز او کے۔ اب بتایئے کیا پروگرام ہے آپ کا؟"

"وہی جو آپ نے حکم دیا تھا۔ کل سویرے جا رہا ہوں اٹلی سے۔ آسٹریا کا پروگرام ہے۔" ہادی نے عجیب صورت بنا کر کہا۔

"لگتا ہے کہ واقعی آپ کے کان کے پاس کوئی بڑا سا غبارہ پھوڑنا پڑے گا۔"

ہادی ہنسنے لگا۔ وہ بھی ہنس دی۔ لوگ دانتوں کو موتیوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ وہ واقعی موتی تھے اور ان کی چمک پیشانی سے ہم آہنگ ہو کر اس کی مسکراہٹ کو ایک بے مثال دلکشی دے دیتی تھی۔

ہادی نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "مذاق کر رہا تھا۔ فی الحال تو کہیں نہیں جا رہا اور جی تو یہی چاہتا ہے کہ دن یہاں روم میں ہوں، آپ میرے ساتھ گھومیں پھریں لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ آپ کے لیے ناممکن ہے۔ آپ کے گھر والے خاص طور سے سسرال والے تو کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتے۔"

وہ عجیب نظروں سے ہادی کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ "اگر آپ چاہتے ہیں کہ ایسا ہو اور میرے ایسا کرنے سے آپ تہہ دل سے میری معذرت قبول کر سکتے ہیں تو میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

اب ایک بار پھر ہادی کے لیے شدید حیرت کا موقع تھا۔ وہ روم میں اس کے ساتھ کیسے گھوم پھر سکتی تھی۔ جلال جیسا شخص یہ کیونکر برداشت کر سکتا تھا۔ وہ تو شاید خون پی جاتا اس کا۔ ہادی کی اب تک کی معلومات کے مطابق وہ دولت مند ہی نہیں کافی با اثر شخص بھی تھا مقامی انتظامیہ میں بھی اس کے رابطے تھے۔ میلانو جیسے شہر میں شاپنگ کرنا کوئی معمولی کام تو نہیں تھا۔ غرض وہ ہر لحاظ سے ایک دبنگ بندہ تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟" وہ ادا سے بولی۔

"یہی کہ آپ مذاق کر رہی ہیں۔ یا واقعی ایسا کر سکتی ہیں۔"

"میں کر سکتی ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ۔"

"وہ کیا؟"

"میں چادر میں رہوں گی۔"

ایک دم بات ہادی کی سمجھ میں آ گئی۔ بڑا سادہ اور آسان حل تھا۔ اگر وہ حسب معمول پردے میں ہوتی اور اس کے ساتھ گھومتی پھرتی تو اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو نہ دیکھ پاتا۔ یہ تو سلیمانی ٹوپی جیسا معاملہ تھا۔ ٹوپی پہنی اور منظر سے غائب۔ صرف آنکھوں کو دیکھ کر تو اس کے گھر والے بھی اسے نہیں پہچان سکتے تھے (اسے صرف ایک نئی چادر اور نئی جوتی کی ضرورت ہوتی)

"زبردست۔" ہادی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ یہ حجاب کا وہی

صوفہ ہے جو وینس میں نظر آیا تھا۔

دروازے پر شائستہ دستک ہوئی اور روم سروس والا چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آ گیا۔ حجاب خود ہی کھڑی ہو کر چائے بنانے لگی۔ ہادی نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔ وہ ٹرالی پر جھکی ہوئی تھی۔ شہد رنگ بالوں کی دو لٹیں چہرے پر جھول رہی تھیں۔ کمان کی طرح خم کھایا ہوا جسم دلکش نظر آتا تھا۔ اس کا حسین سراپا کسی بھی دیدہ ور کو اس کے عشق میں مبتلا کر سکتا تھا اور جلال نے اس کی ناقدری کی انتہا کر رکھی تھی۔ ہادی نے سوچا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو چیزیں حاصل ہو جائیں وہ اپنی قدر کھو دیتی ہیں۔

انہوں نے بڑے اچھے موڈ میں چائے پی۔ ہادی نے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا صرف چوبیس پچیس دن پہلے وہ ہسپتال میں تھی لیکن اب بیماری کے آثار اس پر نہ ہونے کے برابر تھے۔ غالباً وہ سخت جان بھی تھی۔ کسی ایسے ساز کے تار کی طرح جو رات بھر بجتا رہتا ہے لیکن صبح پھر تنا ہوا نظر آتا ہے۔ ہادی نے اس سے انکل فیاض اور خالہ صوفیہ کا حال احوال پوچھا۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ کا۔ ان کا ہسپتال میں بے ہوش ہو جانا اور پھر گھر والوں سے بات چھپانا ابھی تک ہادی کے ذہن میں تازہ تھا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ پھر اگلے روز دس بجے آنے کا وعدہ کر کے وہ چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی ہادی ہکا بکا رہا۔ وہ کیا شے تھی؟ اس کی کوئی بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ نہ جانے کیوں ہادی کو لگ رہا تھا کہ وہاں حجاب کے میکے یا سسرال میں کوئی ایسی بات ہوئی ہے جس کے ردعمل میں اس کے مزاج میں یہ اچانک تبدیلی آئی ہے۔

وہ کل سے شریفاں کو فون کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بڑے اصرار کے ساتھ کہا تھا کہ وہ اس سے گاہے بگاہے بات کرتا رہے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ اس وقت وہ انیکسی میں ہی ہوتی تھی۔ ہادی نے نمبر ملایا۔ چند ہی لمحوں بعد شریفاں کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔

"ہیلو کون بول رہا ہے؟" وہ پنجابی میں بولی۔

"تمہارا لاہوری بھائی ہادی۔"

"او ہو لہوری بھائی جان! تسی تے کمال کر دتا۔ بڑی لمبی حیاتی ہے آپ کی۔ یقین کرو میں آپ کے بارے وچ ای سوچ رہی تھی۔ کیسے ہیں آپ؟ کہاں ہیں؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ مجھے تو فکر پڑی ہوئی ہے کہ آپ کو بازاری کھانے کھانے پڑ رہے ہوں گے۔ کتنا چنگا ہوتا کہ آپ یہاں سے جاتے ہی نہ۔ کیا آپ واپس نہیں آ سکدے؟" وہ اوپر تلے سوال کرتی چلی گئی۔

ہادی نے اس کے سوالوں کے جواب دیئے۔ ہنسی کی باتیں کیں۔ حال چال پوچھا۔ پھر باتوں ہی باتوں میں دریافت کیا۔ "تمہاری وڈی باجی میکے سے آ گئی ہیں کہ نہیں؟"

وڈی باجی یعنی حجاب کے ذکر پر وہ ایک دم اُداس ہو گئی۔ سنجیدہ لہجے میں بولی۔ "وہ تو وچاری حکم کی بندی ہیں جی جب جب وڈے بھائی جان کا آرڈر ہو گا وہ آ جائیں گی۔ کتنی بھی دکھی ہوں گی بس دوڑی چلی آئیں گی۔ وہ بڑے

مصروف ہیں۔ خود تو لینے کم ہی جاتے ہیں۔ بس چھوٹے بھائی جان ظہیر کو بھیج دیتے ہیں یا ڈرائیور وغیرہ کو۔"

"وڈی باجی کے دکھی ہونے کی بات کیوں کی تم نے؟ کیا کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

"کوئی اک مسئلہ ہو تو پھر ہے نا جی! یہاں تو مسئلے ہی مسئلے ہیں سب سے وڈا مسئلہ تو......بس...... کچھ نہ پچھیں جی......" وہ کہتے کہتے بات بدل گئی۔

"شریفاں! تم بات بھی کرتی ہو اور ڈرتی بھی رہتی ہو۔ اچھی بہن ہو تم؟ میں نے تم سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ تم اگر کچھ کہو گی تو وہ صرف اور صرف میرے تک رہے گا۔ یا تو بات شروع نہ کیا کرو یا پھر پوری کر دیا کرو۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ "حبیب جی! آج کل سب سے وڈا مسئلہ تو یہ بی بی ارم ہی بنی ہوئی ہے۔ پتا نہیں کہ اس نے کیا چن چڑھانا ہے۔ چنگی بھلی چلی گئی تھی وہ بے شہر میں۔ اب پھر آ گئی ہے۔ پہلے وڈے بھائی جان کہتے تھے کہ آٹھ دس دن اتھے رہے گی پھر ہوسٹل شوسٹل میں چلی جائے گی۔ پر اب اتھے ای ٹک گئی ہے۔ اس کا سامان شامان بھی آ گیا ہے گھر وچ۔"

"اس سے کیا ہو گا؟" ہادی نے پوچھا۔

"سب نوں پتا ہے جی کہ باجی حجاب اس ارم بی بی سے چڑ کھاتی ہیں۔ وہ بڑی چاپلوسیاں کرتی ہے وڈے بھائی جان کی۔ آگے پیچھے گھومتی رہتی ہے۔ اس کو یہاں کی یونیورسٹی وچ داخل کروانے والے بھی وڈے بھائی جان ہی ہیں۔ یوں لگدا ہے کہ وہ ہولی ہولی اس گھر وچ اپنا رستہ بنا رہی ہے۔ اندر وڑ رہی ہے اس گھر کے۔ اب پرسوں سے ایک ہور کم شروع ہو گیا ہے۔ پتا نہیں کہ باجی حجاب کو اس کا پتا چلا ہے کہ نہیں۔ اج نہیں تو کل چل جائے گا۔ ان کو بڑا دکھ ہونا ہے اس کا۔ وہ ابھی ابھی تو بستر سے اٹھی ہیں وچاری۔"

"کون سا کام شروع ہوا ہے؟" ہادی نے عام سے انداز میں پوچھا۔

"اب جناب وڈے بھائی جان اپنی کار وچ بی بی ارم کو یونیورسٹی چھڈ کے آتے ہیں۔ یونیورسٹی، سٹور کے رستے میں آتی ہے۔ سٹور جانے کے لیے نکلتے ہیں تو اس بی بی کو بھی اپنے نال بٹھا لیتے ہیں۔ اب تو صاف پتا چلنے لگا ہے جی کہ یہ بی بی ڈورے ڈال رہی ہے وڈے بھائی جان پر بلکہ شاید ڈال ہی چکی ہے۔ اس گھر وچ بڑی مصیبتیں سہی ہیں باجی حجاب نے اب پتا نہیں یہ آخری کسر رہ گئی تھی۔" ذرا توقف سے شریفاں بولی۔ "عورت بہت کچھ سہہ لیتی ہے صیب جی! پر یہ جو آخری ظلم ہوتا ہے نا اس ظلم پر چپ رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ بڑا مشکل۔" شریفاں کی آواز رندھ گئی۔ کچھ آہٹ سنائی دی۔ شریفاں جلدی سے بولی۔ "اچھا مجھے لگدا ہے کہ بی بی ارم آوازیں دے رہی ہیں مجھے۔ شاید کوئی کم ہو گا۔ میں چلتی ہوں۔ ہم فیر گل کریں گے۔ آپ ٹیلیفون ضرور کرنا۔"

"ٹھیک ہے شریفاں۔" ہادی نے کہا اور فون بند ہو گیا۔

یہ عجیب انکشاف ہو رہا تھا ہادی پر۔ اس کے دماغ میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ شریفاں کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس گھر میں بڑی مصیبتیں سہی ہیں باجی حجاب نے پتا نہیں یہ آخری کسر رہ گئی تھی۔ وہ لکڑی کے فرش پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس کی اب تک کی معلومات کے مطابق حجاب نے واقعی اپنے شوہر کے گھر میں بہت کچھ سہا تھا۔ اسے ایک سخت گیر ساس اور سخت گیر شوہر ملا تھا۔ پچھلے ڈھائی تین سال میں یقیناً بے شمار موقعوں پر اس کی اور اس کے والدین کی سخت توہین ہوئی تھی۔ توہین کا ایک واقعہ تو تازہ تازہ تھا اور ہادی کی یہاں موجودگی میں ہی ہوا تھا۔ حجاب کا ڈیڑھ دو ماہ کا حمل ضائع ہو گیا تھا۔ اس کا الزام بھی حجاب کی والدہ پر لگایا جا رہا تھا کہ اس نے بیٹی کو انجیریں کھلا دیں جس سے یہ نقصان ہو گیا۔ یہ بالکل بے وزن سی بات تھی لیکن جلال کی والدہ اس پر مصر تھیں۔

جلال نے حجاب کو ایک باندی کی طرح اپنے حکم کی زنجیروں سے باندھ رکھا تھا اور وہ شاید ماں باپ کی عزت کے لیے بندھ بھی چکی تھی لیکن وہ پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ اپنی حاکمیت مسلط کرنے کے لیے بہانے ڈھونڈتا رہتا تھا اور وہ یہ سب کچھ برداشت کرتی تھی۔ مگر اب اس گھر میں کچھ ایسا ہو رہا تھا جو ایک بیوی کی حیثیت سے حجاب کو قبول نہیں تھا۔ تو کیا یہی وہ عمل تھا جس کے ردعمل میں وہ اپنا جھکا ہوا سر اٹھا رہی تھی۔ جیسے پُرسکون سمندروں کی تہہ میں چھپا ہوا کوئی طوفان دھیرے دھیرے سطح آب کی طرف بڑھ رہا ہو۔ جیسے کوئی قیدی اپنی زنجیروں کو ہلا رہا ہو۔ انہیں جھنجوڑنے اور توڑنے کا سوچ رہا ہو۔ مدتوں سے زنداں کے اندھیروں میں رہنے والا شخص زنداں کی سلاخوں سے ٹکرانے کا ارادہ کر رہا تھا شاید ہاں یہاں کچھ انوکھا ہو رہا تھا اور اگر انوکھا ہو رہا تھا تو اس کا کوئی طویل پس منظر تھا۔ ہادی ابھی اس پس منظر سے آگاہ نہیں تھا لیکن اس کی سنگینی کو محسوس کر سکتا تھا۔ اگر یہ پس منظر سنگین نہ ہوتا تو حجاب جیسی ناتواں لڑکی میں اتنی جرأت کیسے پیدا ہوتی۔

ہادی ہوٹل واسکوڈے کے کمرے میں ٹہل رہا تھا اور کھڑکیوں سے باہر روم کی ہزارہا روشنیاں جیسے اس کے اضطراب کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ ان روشنیوں کے علاوہ بھی یہاں کچھ موجود تھا۔ یہ ایک سایہ تھا۔ یہ سایہ ہادی کے کمرے سے باہر کوریڈور میں موجود تھا۔ وہ کوریڈور میں دھیرے دھیرے چلتا کمروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ جیسے کچھ تلاش کر رہا تھا۔

○...☆...○

ارم اپنے کمرے میں موجود تھی۔ جلال کی کوشش سے اسے روم ہی کی ایک یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ وہ وہ خوش تھی کہ اسے بھرے روم میں اور خاص طور سے اسی گھر میں رہنے کا موقع مل رہا ہے۔ وہ قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے اپنے بھرے بھرے جسم پر قمیص کو کھینچ کر نیچے کیا۔ بالوں کو کندھوں کے پیچھے پھینک کر ڈھیلے ڈھالے جوڑے کی صورت میں باندھا اور دوپٹہ ایک خاص انداز سے سر پر اور سینے پر پھیلا کر دیکھنے لگی۔ وہ دوپٹہ وغیرہ کم ہی استعمال کیا کرتی تھی مگر جب سے اس گھر میں زیادہ آنا جانا ہوا تھا اسے دوپٹہ اور کبھی کبھی اوڑھنی بھی استعمال کرنا پڑ رہی تھی۔ اس گھر میں کچھ بھی جلال کی مرضی کے بغیر نہیں ہوتا تھا اور جلال کی مرضی ارم کو بھی عزیز تھی۔

وہ جانتی تھی جلال بہت آہستہ آہستہ لیکن مسلسل اس کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ رفتار بہت سست تھی لیکن نہ ہونے سے تو بہتر تھی۔ جلال کے یوں اس کی طرف متوجہ ہونے میں کچھ عمل دخل میاں بیوی یعنی جلال اور حجاب کی باہمی چپقلش کا بھی تھا۔ اس چپقلش میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور یہ صورتِ حال ارم کے لیے خوش آئند تھی۔ وہ کسی کی مصیبت پر بغلیں بجانے والی تو نہیں تھی لیکن بے وقوف بھی نہیں تھی۔ زندگی میں اسے جو بھی موقع ملتا تھا وہ اسے

حاصل کرنا چاہتی تھی اور یہ تو ایسا موقع تھا کہ اگر حاصل ہو جاتا تو زندگی ہی بدل کر رہ جاتی۔ جلال جیسے باحیثیت اور بلند اقبال شخص کا التفات حاصل ہو جانا اور پھر اس کی زندگی میں آ جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ اور اپنی باجی فوزیہ، چچی ظہیرہ اور دیگر لوگوں کی پروا کیے بغیر وہ دلجمعی سے اس کام میں لگی ہوئی تھی۔

جو کچھ بھی تھا، وہ جانتی تھی کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ حجاب پچھلے ڈھائی تین سال سے اس گھر میں تھی۔ اس گھر میں اس کی جڑیں تھیں اور کسی حد تک جلال کے دل میں بھی۔ ان جڑوں کا آناً فاناً ختم ہو جانا ممکن نہیں تھا۔ ارم کی بڑی بہن فوزیہ، چچی ظہیرہ اور گھر کے نوکر حجاب کا دم بھرتے تھے۔ اب ابارشن والے واقعے کے بعد سے حجاب میکے میں تھی۔ ارم کے لیے یہ صورتحال فائدہ مند تھی۔ وہ آج کل یونیورسٹی بھی جلال کے ساتھ اس کی گاڑی میں ہی جا رہی تھی۔

وہ سوچوں سے چونک گئی۔ جلال کی والدہ ”آپا خانم“ کی آواز آئی۔ ”ارم بیٹا! ذرا شریفاں کو دیکھ کہاں مر گئی ہے۔ بیٹھے ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ جلال کی شیروانی پریس ہونے والی ہے۔ اس نے گیارہ بجے فنکشن میں پہنچنا ہے۔“

”اچھا امی جی۔“ ارم نے شہد بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں دیکھتی ہوں اسے۔“

اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی وہ باہر نکلی اور گارڈنیا کی باڑ پار کر کے انیکسی کی طرف آ گئی۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے آواز دی۔ ”شریفاں...... او...... شریفاں۔“

اس کی دوسری تیسری آواز پر شریفاں بوکھلائی ہوئی سی انیکسی کے برآمدے میں آ گئی۔ ”جی بی بی جی۔“

ارم کو اندازہ ہوا کہ وہ کسی کو فون کر رہی تھی۔

”کہاں دفع ہو جاتی ہے تو بیٹھے بیٹھے۔ کس کو فون کر رہی تھی۔“

”وہ جی...... جی وہ...... اپنی وڈی بہن کو گجرات میں۔ وہ نانی بنی ہے نا پچھلے اتوار کو۔“

”بس ٹھیک ہے۔ جب تک وہ پڑنانی نہ بن جائے اس کو فون کرتی جا اور ہم وہاں بیٹھے تیری جان کو روتے رہیں گے۔ کچھ ہم پر بھی نظر کرم فرما لیا کر۔“

”آپ حکم کریں بی بی جی۔“

ارم اسے لے کر گھر میں آئی اور اسے بتایا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس کے بعد کیا کرنا ہے۔

وہ خود اپنے کمرے میں آ گئی اور نیل پالش کے لیے کوئی مناسب سا شیڈ منتخب کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ابھی وہ اس انتخاب میں مصروف تھی کہ اس کی نگاہ کھڑکی سے باہر مین گیٹ کی طرف اٹھ گئی۔ چوکیدار بٹن دبا کر آٹو میٹک گیٹ کھول رہا تھا اور جلال کی شاندار ”ہمر“ جیپ اندر داخل ہو رہی تھی۔ غیر متوقع طور پر جلال وقت سے پہلے آ گیا تھا ارم نے جلدی جلدی ڈریسنگ کی درازیں بند کیں۔ آئینے میں خود کو دیکھا۔ بال درست کیے۔ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں شریفاں جلال کی شیروانی پریس کر رہی تھی۔

اس نے تنقیدی نظروں سے شریفاں کے کام کو دیکھا اور بولی۔ ”دیکھو کالر کا ستیاناس نہ کر دینا۔ اچھا تم جاؤ ادھر کچن میں کلثوم کو دیکھو۔ میں یہ کر لیتی ہوں۔“

شریفاں ”جی بی بی“ کہتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ بڑے انہماک سے شیروانی پریس کرنے میں لگ گئی۔ پریس کرتے ہوئے اس کا دوپٹہ ڈھلک گیا۔ اس نے اسے ڈھلکا ہی رہنے دیا۔ گریبان سے اس کا چمکیلا جسم جھانک رہا تھا۔ بالوں کی دو لٹیں پیشانی پر آ گئی تھیں جلال کے قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ مگر وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ جب اسے اندازہ ہو گیا کہ جلال اندر آ گیا ہے تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور جیسے گڑبڑا کر سر پر دوپٹہ درست کر لیا۔ ”اسلام علیکم! آپ جلدی آ گئے۔“

”ہاں...... ذرا جلدی نکلنا ہے۔“ جلال نے بھاری آواز میں کہا۔ اس کے سراپے کی طرح اس کی آواز میں بھی رعب تھا۔

”بس...... یہ دو چار منٹ کا کام رہ گیا ہے۔“ ارم نے توجہ سے شیروانی کی سلوٹیں نکالتے ہوئے کہا۔

”کسی ملازمہ سے کہہ دیا تھا۔“

”کیوں کہہ دیتی۔ مجھے آپ کا کام کرنا اچھا لگتا ہے۔“ وہ اس کی طرف دیکھے بغیر ادا سے بولی۔

جلال گہری سانس لیتے ہوئے آگے نکل گیا۔

وہ جتنی جلدی آیا تھا۔ اتنی ہی جلدی روانہ بھی ہو گیا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ارم اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے کھڑکیاں چیک کیں اور پردے بھی برابر کر دیے۔ بستر پر نیم دراز ہو کر اس نے اپنے تکیے کے نیچے سے سیل فون نکالا اور ایک نمبر ملایا۔

کال مل گئی۔ دوسری طرف سے باریک سی مردانہ ہیلو سنائی دی۔ ارم غصے سے بولی۔ ”کیا بات ہے گلزار۔ کیوں بار بار فون کر رہے تھے؟“

”گلزار جب بار بار فون کرتا ہے تو اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔“

”مقصد یہی ہوتا ہے۔ کسی لڑکی کو پھنسانا۔ اس کے ساتھ چکر چلانا۔ چند دن اس کے ساتھ گھومنا پھرنا اور پھر اس کے پیچھے پڑ جانا۔ ہاتھ دھو کر۔“

وہ ہنسا۔ ”یہ سب کچھ دوسروں کے لیے ہے۔ تم تو اپنی سسٹر ہو ارم! اور ہمیشہ رہو گی۔ اللہ نے تمہیں بڑی خوبیاں دی ہیں۔ بس تھوڑی سی کنجوس ہو تم۔“

”میں تھوڑی سی کنجوس ہوں اور تم کافی سارے کمینے ہو۔ اچھا بکواس بند کرو۔ فون کیوں کیا تھا تم نے؟“

”ایک خوشخبری ہے سسٹر! تھوڑا سا گھر اہاتھ آیا ہے تمہارے دشمن جان کا۔“

”اچھا اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ ورنہ وقت برباد مت کرو۔“

”وقت برباد نہیں ہوگا۔ گارنٹی دیتا ہوں لیکن سسٹر! تمہیں بھی تھوڑی سی مٹھی ڈھیلی کرنی ہوگی۔ سچ کہتا ہوں ایک دم لڑکی چل رہی ہے۔“

ارم اسے ڈانٹنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن پھر اس کے لہجے میں اسے کچھ ایسی ہلچل محسوس ہوئی کہ وہ ڈانٹ نہ سکی۔ شاید واقعی اس کے پاس کوئی خبر تھی۔ وہ اپنا لہجہ بدل کر بولی۔

''کہا ہے نا تم ایک نمبر کے کمینے ہو گلزاری۔ میرا خیال ہے کہ پیدا ہوتے ہی تم نے سب سے پہلے اپنی دائی سے پیسے طلب کیے ہوں گے۔ پیدا ہونے کے بدلے میں۔ اچھا بکواس کرو۔ کوئی کام کی بات ہوگی تو دوں گی ہڈی تمہارے منہ میں۔''

''مسٹر! ہڈی نہیں۔ اس بار تو گوشت ہونا چاہیے اور مجھے پتا ہے تم دو گی بھی۔ تمہیں مزہ آتا ہے میری بات کا۔''

''اچھا کچھ پھوٹو منہ سے۔''

''حجاب کا پیچھا کیا ہے میں نے۔ وہ بڑے مشکوک انداز میں گھر سے نکلی ہے اور ہوٹل واسکوڈے میں کسی سے ملنے گئی ہے۔''

''مشکوک انداز کیوں کہہ رہے ہو تم۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی سہیلی یا عزیز وغیرہ سے ملنے گئی ہو۔''

''مسٹر! آپ کا یہ بھائی اُڑتی چڑیا کے پر گنتا ہے اور یہ بھی بتا دیتا ہے کہ اس کے پیٹ میں انڈہ ہے یا نہیں۔''

''کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''آپ کو پتا ہی ہے کہ یوں تو وہ گھر سے نکلتی ہی نہیں۔ اگر نکلے تو اس کا وہ لمبو بھائی ساتھ ہوتا ہے یا والدہ بھی ہے۔ وہ گاڑی پر نکلتے ہیں۔ پر کل یہ حجاب بی بی میٹرو پر نکلی تھی۔ چادر میں لپٹی لپٹائی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی میٹرو میں چڑھا۔ مین اسکوائر سے اگلے سٹاپ پر وہ اُتر گئی۔ وہ فٹ پاتھ پر سیدھی جا رہی تھی پھر ایک دم ہوٹل واسکوڈے میں چلی گئی۔ میں اس وقت سڑک کی دوسری طرف تھا۔ سگنل لال تھا مجھے سڑک پار کرتے تھوڑی سی دیر ہوئی۔ پھر بھی مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ وہ سیڑھیوں سے سیکنڈ فلور پر گئی ہے۔ میں بھاگم بھاگ سیکنڈ فلور تک پہنچا تو وہ غائب تھی۔ یہاں اس فلور پر چالیس پچاس رہائشی کمرے اور ہیں فیملیاں یہاں کم ہی ہوتی ہیں زیادہ تر ٹورسٹ ہوتے ہیں یا پھر کاروباری لوگ۔ میں اسے ڈھونڈتا رہا لیکن وہ نہ ملی وہ کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ کسی کمرے میں رہی ہے۔''

''جب تم کہہ رہے ہو کہ وہ ملی ہی نہیں تو پھر یہ کیسے پتا چلا کہ وہ ڈیڑھ گھنٹہ کمرے میں رہی۔''

''قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میں نے ایک بالکونی سے نیچے دیکھا تو وہ مین انٹرنس سے باہر نکل رہی تھی۔ اسی طرح لپٹی لپٹائی۔ میں پھر پیچھے لگ گیا۔ بہرحال اس دفعہ وہ سیدھی گھر گئی۔''

ارم نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''خیر ...... یہ خبر تو تم نے کارآمد ہی سنائی ہے لیکن آدھی خبر ہے۔ پتا ہونا چاہیے کہ وہ ملی کس سے اور کیوں؟ اور کیا اس نے جلال صاحب سے کہیں جانے کی اجازت لی تھی۔''

''اجازت لینے یا نہ لینے کی بات کا پتا تو تم خود کرو نا مسٹر! میں یہ پتا کروں گا کہ وہ ملی کس سے ہے؟''

''کس طرح کرو گے؟''

''پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن کے اندر ہی جائے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ جیسے ہی کچھ پتا چلے مجھے بتاؤ۔ اور تمہیں ہزار دفعہ کہا ہے کہ فون کرنے سے پہلے میسج کیا کرو۔ مجھے کسی خوامخواہ کی مصیبت میں نہ ڈالنا۔''

''ٹھیک ہے مسٹر! لیکن کب تک ہو جائے گا؟''

''کیا کب تک ہو جائے گا۔''

''تم مسٹر! میں سچ کہہ رہا ہوں۔ بڑی سخت ضرورت ہے۔ فلیٹ خالی کرنا پڑ جائے گا یا پھر لینڈ لارڈ مکا مار کر میری ناک کی ہڈی کڑک کر دے گا۔''

''تمہاری ہڈی کڑک ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ تم بہت ہی کمینے ہو گلزاری! آدھی خبر دے کر پیسوں کے لیے بھاڑ جیسا منہ کھول رہے ہو۔''

''چلو آدھی خبر ہے تو آدھے پیسے ہی دے دیں۔ یعنی کوئی 500 یورو۔''

''مجھ سے کچھ سنانا نہ۔'' ارم نے دبے لہجے میں غصے سے کہا۔ ''کل 200 یورو ٹرانسفر کر دوں گی اکاؤنٹ میں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

گلزاری کالج میں اس کا کلاس فیلو رہا تھا۔ قد بمشکل پانچ فٹ چار انچ تھا لیکن جسم خوب گٹھا ہوا تھا۔ ایک نمبر کا ٹھرکی اور لالچی تھا۔ لڑکیوں میں مکڑی کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے گرد اپنی باتوں کا ایسا تانا بانا بنتا تھا کہ وہ جانتے بوجھتے بھی اس میں پھنس کر رہ جاتی تھیں۔ اس میں ہوشیاری اور عیاری کی صفت کو ارم نے بڑی گہرائی سے محسوس کیا تھا۔ وہ ہوشیار لوگوں کو پسند کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود گلزاری اس کے قریب تھا۔ وہ بڑی روانی سے اسے مسٹر کہتا تھا۔ وہ بھی اسے ایک کارآمد دوست سمجھتی تھی۔

گلزاری کو یہاں جلال اور ارم کے درمیان چلنے والے معاملے کا پتا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ارم یہاں اپنا مقصد حاصل کرے (تاکہ اس کے ثمرات اس تک بھی پہنچیں) ایک اچھا اتفاق یہ ہوا تھا کہ آج کل گلزاری جس بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں مقیم تھا وہ اسی سڑک پر تھی جہاں حجاب کے والدین رہائش پذیر تھے۔ فاصلہ بھی زیادہ نہیں تھا اپارٹمنٹ میں سے اس کوٹھی کے لان اور برآمدے کا کچھ حصہ بھی نظر آتا تھا۔ ارم نے دو تین مہینے سے گلزاری کو یہ کام سونپ رکھا تھا کہ جب جب (حجاب) اپنے میکے آئے تو وہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کی کوشش کرے۔ آج کافی دنوں بعد گلزاری نے اس حوالے سے کوئی توجہ طلب خبر دی تھی۔ وہ بیٹھی رہی اور اس بارے میں سوچتی رہی۔

○......❖......○

ہادی ہوٹل واسکوڈے کے سیکنڈ فلور پر اپنے آرام دہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ وال کلاک کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ حجاب آج پھر اس سے ملنے آ رہی تھی۔ انہیں روم میں گھومنے پھرنے کے لیے نکلنا تھا۔ دو دن پہلے تک ہادی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہوگا لیکن ایسا ہو چکا تھا۔ وہ سیلانی لڑکی یہ سب کر کے دکھا رہی تھی۔ اس نے دوپہر بارہ بجے کا وعدہ کیا تھا اور ہادی اب جان چکا تھا کہ وہ وقت کی پابند ہے۔ اس نے ہوٹل کی بالکونی سے دیکھا۔ ٹھیک بارہ بجے وہ سڑک کراس کر کے ہوٹل کے مین گیٹ کی طرف آتی دکھائی دی۔ اسی طرح ایک براؤن چادر میں لپٹی ہوئی چہرہ مکمل طور پر نقاب میں تھا۔ فقط آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ ہادی نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ آج اس کا شولڈر بیگ نیا تھا۔ اور غالباً سینڈل بھی نئی ہی تھی۔ چادر سے باہر بس دو چیزیں ہی دکھائی دیتی تھیں اور یہ

دونوں اس نے بدل دی تھیں۔ (براؤن چادر بھی آج پہلی دفعہ ہی اس کے جسم پر نظر آرہی تھی)

پروگرام کے مطابق حجاب کو نیچے ہوٹل کی لابی میں ہی رُکنا تھا۔ ہادی نے لفٹ کا انتظار نہیں کیا اور تیزی سے سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے آگیا۔ وہ آج اپنے بہترین لباس میں تھا۔ وہ اس جذبے کو کیا نام دے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا لیکن یہ جذبہ اپنی جگہ موجود تھا حجاب کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی تھیں۔ اسے اپنے قریب پاکر اس کی رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو جاتی تھی۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے ہوٹل واسکوڈے سے نکلے اور فٹ پاتھ پر پیدل ہی چلتے ہوئے میٹرو ٹرین کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ روم میں یہ ایک چمکیلا دن تھا ٹھنڈی ہوا نے موسم کو خوشگوار بنا رکھا تھا۔ "کیا خیال ہے۔ تو لیسیم چلیں؟" ہادی نے پوچھا۔

"نہیں..... آج سمندر دیکھنے کا موڈ ہو رہا ہے۔" وہ چنچل انداز میں بولی۔

"تو پھر ویسٹ روم۔"

"یس..... ویسٹ روم۔"

وہ دونوں دو منزلہ سیڑھیاں اُتر کر میٹرو ٹرین میں بیٹھے اور پھر شہر کے روم کے نیچے ہی نیچے طوفانی رفتار سے سفر کرتے مغربی روم میں پہنچ گئے۔ انہوں نے پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا اور ٹیسل پلو کو جیسے گنجان علاقوں کے نیچے سے گزرے یہ سفر وہ سڑک کے ذریعے کرتے تو شاید گھنٹوں لگ جاتے۔

اور اب سمندر ان کے سامنے تھا۔ بحیرہ روم کا لہریں لیتا ہوا نیلگوں پانی جس پر سینکڑوں تفریحی کشتیاں رواں تھیں اور جس کے ساحل پر دلفریب نظارے تاحدِ نگاہ پھیلے ہوئے تھے۔ قلقاریاں مارتے ہوئے بچے، جوانوں کے جھرمٹ، چلتی پھرتی دکانیں اور رنگ برنگی چھتریاں جن کے نیچے نیم عریاں مرد و زن ایک دوسرے کو تلاش کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دونوں اس گہما گہمی سے ذرا ہٹ کر لکڑی کے ایک میز بنچ پر بیٹھ گئے۔ حجاب محویت سے سمندر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں کسی بچے کی سی خواہش مچل رہی تھی۔ وہ جیسے چادر اُتار کر اور سینڈل پھینک کر ان کپڑوں سمیت سمندر میں کود جانا چاہتی تھی اس کے پانیوں سے کھیلنا چاہتی تھی، اس کی لہروں سے بغل گیر ہونا چاہتی تھی۔

"گھر میں کیا بتایا آپ نے؟" ہادی نے پوچھا۔

"بس کالج کی ایک دوست یہاں روما آئی ہوئی ہے۔ اس کے ہاں جا رہی ہوں۔ ویسے امی ابو مجھ سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کرتے۔ انہیں معلوم ہے ان کی بیٹی کس مزاج کی ہے۔"

"یعنی میں اس وقت آپ کے کالج کی دوست ہوں۔" ہادی نے کہا۔

حجاب کی آنکھوں سے پتا چلا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ یقیناً اس کی پیشانی پر چاند چمک اُٹھا تھا اور سچے موتیوں سے دانت بہار دکھا رہے تھے۔ لیکن یہ سب کچھ براؤن چادر کے نقاب کے پیچھے اوجھل تھا۔

وہ بولی۔ "ہاں جی..... دوست کی حد تک تو بات صحیح ہے لیکن آپ کالج کے نہیں ہیں بلکہ کالج کی نہیں ہیں۔ جناب آپ مجھ سے سوال پوچھتے جا رہے ہیں۔ مجھے کچھ نہیں بتاتے۔ آپ مجھ تک پہنچے کیسے؟ لیکن پہلے والی سٹوری نہیں

چاہیے گا۔"

ہادی نے گہری سانس لی۔ "تین چار دن تو میں روم سنٹرم میں گھومتا رہا۔ پھر سوچا کہ اگر گھومنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ وہاں گھوما جائے جہاں آپ جناب کے ملنے کا امکان ہو۔ لہٰذا کاسیا کے علاقے میں آوارہ گردی شروع کر دی۔ وہاں سے بھی مایوس ہونے والا تھا جب آئس کریم بار میں آپ کی دوست ماریہ پر نظر پڑ گئی۔ باقی کا کام آپ کے ابو صاحب نے آسان فرما دیا۔ وہ میرے گیتوں کے پرستار نکل آئے اور آپ کے گھر لے گئے۔"

"لیکن آپ ڈھونڈ کیوں رہے تھے مجھے؟" حجاب نے اچانک سوال کیا اور ہادی گڑبڑا گیا۔

ذرا سنبھل کر بولا۔ "اس لیے ڈھونڈ رہا تھا کہ دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ ہمیں یہاں سمندر کے کنارے بیٹھ کر مکئی کے دانے کھانے تھے اور ضرور کھانے تھے۔ اس لیے میں آپ کو ڈھونڈتا رہا۔"

"مکئی کے دانے؟ یہ کہاں سے آگئے جی۔"

"وہ سامنے سے۔" ہادی نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ ایک جین شرٹ والا اسمارٹ سا خوانچہ فروش گلے میں اپنی دکان لٹکائے ان کی طرف آرہا تھا۔ وہ بھُنے اور اُبلے ہوئے بھٹے بیچ رہا تھا۔ ساتھ میں دو تین طرح کی چٹنی تھی۔ انہوں نے بھٹے لیے اور کھانے لگے۔ ہادی کو یہ اچھا لگا۔ کیونکہ بھٹا کھانے کے لیے حجاب کو اپنا نقاب تھوڑا سا نیچے کرنا پڑا۔ اس کے ہونٹوں کے پیچھے اس کے خوشنما دانتوں کی تھوڑی سی جھلک نظر آنے لگی۔

وہ بھٹا کھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اپنے پاؤں کو حرکت دے رہی تھی۔ یہ ایک چنچل انداز تھا۔ اس کی عمر کے بارے میں ابھی ہادی درست اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ تاہم وہ بیس بائیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ جلال اپنے ڈیل ڈول کی وجہ سے بھی قد سے بڑا نظر آتا تھا۔ یوں میاں بیوی کی عمروں میں فرق مزید نمایاں ہو جاتا تھا۔

حجاب کی نگاہ سامنے سے گزرتے ہوئے ایک جوڑے پر پڑی۔ یہ اپنے لباس اور حلیے سے خلیجی علاقے کا جوڑا تھا۔ شاید کویتی یا اماراتی۔ مرد درمیانی شکل و صورت کا تھا لیکن لڑکی خوبصورت تھی۔ حجاب کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ "ہادی صاحب سنا ہے یہاں لوگ اکثر دو تین شادیاں کر لیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اپنی بیویوں سے انصاف کر لیتے ہیں؟"

"میں سمجھا نہیں۔"

"دیکھیں نا اپنی تین بیویوں کو ایک جیسے فریج یا ایل سی ڈی لے دینا ایک جیسے کپڑے سلوا دینا یا ایک جتنے نوکر رکھ دینا یہ تو انصاف یا مساوی سلوک نہیں کہلا سکتا نا۔ بلکہ....." وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

ہادی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ توقف سے بولی۔ "بلکہ ہادی صاحب اگر ایک شوہر ان تین بیویوں کو برابر وقت بھی دیتا ہو یعنی ایک ایک ہفتہ ہر بیوی کے پاس رہتا ہو تو بھی یہ مساوی سلوک تو نہیں کہلا سکتا نا۔ عورت، فریج، ایل سی ڈی یا ہفتہ تو نہیں مانگتی نا۔ وہ تو محبت مانگتی ہے اور محبت دل کے اندر سے نکلتی ہے۔ جیب میں سے نہیں نکل سکتی سونے کی صندوقچی میں سے نکل سکتی ہے چاہے وہ کتنا بھاری ہو۔ ہمارا اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟"

"اسلام یہی کہتا ہے حجاب کہ مرد تب ہی ایک سے زائد شادیاں کرے جب وہ بیویوں کے ساتھ مساوی سلوک کر سکے۔"

"اور ہم نے مساوی سلوک سے مراد فریج کار اور ایل سی ڈی وغیرہ لے رکھے ہیں۔ اس حکم کی اصل روح تو محبت اور چاہت میں پوشیدہ ہے۔ جس کو ہم یکسر فراموش کر دیتے ہیں اور اپنے لیے آسانیاں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ کام اللہ نے اتنا آسان نہیں بنایا ہے۔"

وہ باتیں کر رہی تھی اور ہادی اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں ہادی کی سمجھ میں آ رہی تھیں اور وہ وجہ بھی سمجھ میں آ رہی تھی جس کے سبب وہ یہ باتیں کر رہی تھی شریفاں نے جو کچھ فون پر ہادی کو بتایا تھا وہ ظاہر ہے کہ حجاب کے علم میں بھی تھا اور اس نے حجاب کی ہستی کو اندر سے درہم برہم کر رکھا تھا۔ اس نے اس گھر میں بہت کچھ سہا تھا لیکن اب ایک سوکن کا عذاب سہنے کے لیے وہ خود کو تیار نہیں کر پا رہی تھی وہ جوان تھی، خوبصورت تھی۔ اس کے دل میں ایک باوفا شوہر اور ایک پھولوں بھرے آنگن کی خواہشیں تھیں۔ ان خواہشوں کو روندا جا رہا تھا۔ شادی کے صرف ڈھائی تین سال بعد اس سے اس کی نصف ازدواجی زندگی چھیننے کے پروگرام بن رہے تھے۔ کیا کوئی ناقابلِ معافی غلطی کر دی تھی اس نے؟

وہ باتیں کرتی رہی۔ ہادی نے بھی کہیں کہیں جواب دیا۔ وہ زیادہ سنتا ہی رہا۔ پھر لاہور سے شیخو جی کی کال آ گئی۔ ہادی سننے لگا۔ فون پر بات کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں حجاب کی طرف ہی تھیں۔ وہ سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ سمندر میں تلاطم تھا۔ موجیں اُٹھ رہی تھیں۔ بلند ہو رہی تھیں اور ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔ شاید ایسا ہی کچھ حجاب کے اندر بھی تھا۔

فون پر بات کرتے ہوئے اور شیخو جی سے گیتوں کے لیے چند دنوں کی مزید مہلت مانگتے ہوئے ہادی کی نگاہ حجاب کے عقب میں ایک سرخ چھتری کی طرف اُٹھ گئی۔ گہرے سرخ رنگ کی یہ چھ سات فٹ اونچی چھتری تھی۔ اس کے قریب جو درمیانے قد کا بندہ کھڑا تھا اسے ہادی دوسری تیسری بار دیکھ رہا تھا۔ ہادی نے پہلی بار اسے ڈیڑھ گھنٹہ پہلے میٹرو ٹرین میں دیکھا۔ پھر جب وہ خوانچا فروش سے بھٹے لے رہے تھے، یہی شخص ان کے سامنے سے گزر کر پانی کی طرف گیا تھا۔ اب وہ چھتری کے قریب موجود تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ شخص ہادی کو مشکوک لگا۔ وہ مسلسل ان کے آس پاس تھا کیا وہ کسی چکر میں تھا؟ کوئی جیب کترا، اٹھائی گیرا، یا کوئی مزید خطرناک شخص۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں بھی وہ شخص ہادی اور حجاب کے آس پاس ہی رہا۔ ہادی کو یقین ہونے لگا کہ وہ کسی چکر میں ہے۔ بہرحال اس بارے میں ہادی نے حجاب کو کچھ نہیں بتایا۔ وہ خوفزدہ ہو جاتی اور یہ تفریحی "ٹرپ" شاید اسی جگہ ختم ہو جاتا۔

تھوڑی دیر بعد ہادی کولڈ ڈرنک لینے کے بہانے اس سرخ چھتری کی طرف گیا۔ چھتری کے ساتھ ہی ایک سائبان کے نیچے کولڈ ڈرنکس اور اسنیکس وغیرہ کا سٹال تھا۔ ہادی نے کچھ چپس لیے اور چار ٹن پیک ڈرنکس۔ درمیانے قد کا دھاری دار شرٹ والا شخص اس سے فقط دس بارہ فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ اس کا جسم کسی گینڈے کی طرح مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ بظاہر بڑے انہماک کے ساتھ ایک اطالین خاتون سے اطالوی میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخی اور ہوشیاری کی چمک تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں کچھ اور بھی ظاہر کرتی تھیں۔ نہ جانے کیوں ان آنکھوں کو دیکھ کر ہادی کو لگا کہ یہ ناٹے قد کا شخص عورتوں کا زبردست رسیا ہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے ہادی کی نظریں اس سے چار ہوئی تھیں۔ ہادی کو اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے اور ایک طرح کی بھوک دکھائی دی تھی۔ اطالین خاتون قد میں اس سے تھوڑی سی لمبی ہی ہوگی۔ وہ غالباً اس کے لباس اور اس کی خوبصورتی کی تعریف کرنے میں مصروف تھا۔ خاتون ہنستی جا رہی تھی۔

ہادی اشیائے خورد و نوش لے کر واپس آ گیا۔ دونوں ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ حجاب بڑے لائٹ موڈ میں تھی۔ وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اپنے بچپن کی، لڑکپن کی، کالج کے دور کی۔ اس نے روم ہی کی ایک یونیورسٹی سے اے سی ایس کیا تھا۔ ماسٹرز کرنا چاہتی تھی اور بہ آسانی کر بھی سکتی تھی لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا کیونکہ اس کی منگنی ہو چکی تھی اور سسرال والوں کو شادی کی جلدی تھی...... حجاب کی باتوں سے ہرگز اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کی ازدواجی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ اس نے ہادی کے سامنے جلال کو ایک اچھا اور دیکھ بھال کرنے والا شوہر قرار دیا۔ باتوں باتوں میں ہادی کو اچانک ایک بات یاد آئی۔ اس نے حجاب سے پوچھا۔ "آپ کے گھر کے ایک کمرے میں غالباً آپ کی کسی فرینڈ کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ نیچے لکھا ہوا ہے...... میں تمہیں بھول نہ پاؤں گی۔"

ہادی نے دیکھا۔ حجاب کی آنکھوں میں ایک دم ایک سایہ سا لہرا گیا۔ وہ جیسے ٹھٹک سی گئی تھی۔ شاید کوئی کہانی تھی اس تصویر کے پیچھے...... یقیناً ایسا ہی تھا۔

حجاب نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ہاں...... بڑی پیاری دوست تھی میری۔ اب جا چکی ہے۔"

"کہاں؟"

"جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔" اس کی آواز میں درد لہریں لینے لگا۔

"اوہ...... آئی ایم سوری، کیا ہوا تھا انہیں؟"

"بس...... ایک حادثہ، جس میں جان چلی گئی اس کی۔ اپنے گھر کی سیڑھیوں سے گری تھی۔ سر پر گہری چوٹیں لگیں۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔"

"ویری سیڈ، شادی شدہ تھی؟"

"ہاں۔" حجاب نے مختصر جواب دیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی۔ ہادی بھی اس کا موڈ برباد کرنا نہیں چاہتا تھا۔

دو تین منٹ بعد ہادی نے بڑی صفائی سے موضوع بدل دیا۔ وہ دونوں پاکستان کی باتیں کرنے لگے۔ حجاب اپنے والدین کے ساتھ بہت چھوٹی عمر میں اٹلی آئی تھی لیکن اس کی مٹی کو پاکستان سے نسبت تھی۔ اسے پاکستان کے بارے میں جاننا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ کئی بار وہاں جا بھی چکی تھی۔ ہادی نے اسے پاکستان میں اپنی مصروفیات اور والدہ اور بھائی کے بارے میں بتایا۔

اس گفتگو کے دوران میں اس کا دھیان دھاری دار شرٹ والے شخص کی طرف بھی رہا۔ وہ مسلسل ان کے آس پاس نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے ایسے کاموں کا کافی تجربہ ہے۔ ہادی کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو شاید اس کی سرگرمی

سے آگاہ نہ ہو سکتا۔

حجاب نے کہا۔ "چلیں..... اب کولیسیم (قدیم اسٹیڈیم) کی سیر ہو جائے۔"

کوئی اور موقع ہوتا تو ہادی اس پیشکش کو سر آنکھوں پر رکھتا لیکن اس وقت دھاری دار شرٹ والے کی وجہ سے صورتِ حال مختلف تھی۔ اس نے کہا۔ "کیوں نہ کل چلیں..... تازہ دم ہو کر۔"

"لیکن..... کل تو میں نہیں آسکوں گی..... بلکہ..... شاید دوبارہ آ ہی نہ سکوں۔"

ہادی کے سینے میں مایوسی کی لہر سی دوڑ گئی۔ "یہ تو پھر کوئی بات نہ ہوئی۔" وہ بولا۔

"کیا اتنا کافی نہیں ہے؟" اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

"آپ نے جتنا ستایا ہے، اس لحاظ سے تو آپ کو کم از کم چھ سات دن مجھے کمپنی دینی چاہیے۔" ہادی نے مزید کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ "اچھا تو پھر کل آ رہی ہیں نا آپ۔" ہادی نے یاددہانی کے لیے پوچھا۔

"جتنا قصور کیا ہے۔ اتنی ہی سزا دیجیے۔"

"یعنی یہ آپ سزا بھگت رہی ہیں۔"

وہ ہنس ہنس کر سرخ ہونے لگی۔ لیکن یہ سرخی ہادی کو نقاب کی وجہ سے نظر نہیں آ رہی تھی اور نہ ہی وہ پیشانی جو حجاب کے ہنستے ہی تمتماتی تھی اور چاندنی بن جاتی تھی۔ "مذاق کر رہی تھی یقین کریں۔ آپ کے ساتھ گھومنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ بیماری کے بعد کوئی ٹانک سا مل گیا ہے۔ ایک دو ہفتے تو سخت ڈپریشن میں رہی ہوں۔"

"ٹانک جب شروع کریں تو اسے چند دن تو استعمال کرنا چاہیے۔" اس نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! لیکن اگلی ڈوز اگر پرسوں ہو جائے تو کوئی حرج تو نہیں؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔" ہادی نے کہا۔

اسی دوران میں حجاب کو ساحل کی ریت پر قلقاریاں مارتا ایک جاپانی بچہ نظر آیا اس نے اسے گود میں اٹھا کر چوما۔ وہ اس کی بانہوں میں کھیلنے لگا۔ اس کی جاپانی ماں اور والد خوش ہونے لگے۔ کچھ دیر بعد ہادی اور حجاب ایک ساحلی ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔ یہاں انہوں نے کھانا کھایا۔ کولڈ کافی پی اور باتیں کرتے ہوئے واپس روانہ ہو گئے۔

میٹرو ٹرین میں بیٹھنے تک دھاری دار شرٹ والا شخص ہادی کو کہیں نظر نہیں آیا لیکن جب وہ ہوٹل واسکوڈے کے قریب ٹرین سے اتر رہے تھے اس نے دوبارہ اپنی منحوس جھلک دکھا دی۔ ابھی تک حجاب کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ حجاب کو یہاں سے دوسری ٹرین پکڑنا تھی۔ جب تک حجاب ٹرین میں سوار نہیں ہو گئی۔ ہادی وہیں کھڑا رہا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر دھاری دار شرٹ والا حجاب کے پیچھے گیا تو وہ خود بھی ٹرین میں سوار ہو جائے گا اور اسے بحفاظت گھر تک چھوڑ کر آئے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ شخص وہیں پلیٹ فارم کے ایک گوشے میں موجود رہا۔ ہادی پیدل اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ شخص آس پاس موجود ہے۔ اس کی موجودگی ہادی کے اندر طیش اور پریشانی کی لہر ابھار رہی تھی۔

O.....◆.....O

حجاب گھر کے باغیچے میں ٹہل رہی تھی۔ پھر وہ آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ امی، فیصل کے ساتھ اپنے "چیک اپ" کے لیے ہسپتال گئی ہوئی تھیں۔ ابو کمرے میں سو رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی وعدے کے مطابق کل اسے ہادی کی طرف جانا تھا۔ ان کا پروگرام حسبِ سابق روم میں گھومنے پھرنے کا تھا۔ وہ تا حال تذبذب میں تھی، جانے کہ نہ جائے۔ جانے کیوں ہادی اس کو بہت اپنا سا لگا تھا۔ جیسے وہ اسے بہت پہلے سے جانتی ہو۔ اس کی ہر ادا پہچانتی ہو۔ لہجے کی شائستگی سیدھی حجاب کے دل میں اترتی تھی۔ بہر حال اس جذبے میں کسی طرح کی رومانیت کو دخل نہیں تھا۔ یہ ویسی ہی اپنائیت تھی جیسی کسی قریبی عزیز یا گہری سہیلی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ لیکن حجاب نے بارہا یہ بھی سن رکھا تھا کہ مرد اور عورت کے درمیان دوستی نام کی چیز تادیر برقرار نہیں رہتی۔ یہ گھٹتے گھٹتے ختم ہو جاتی ہے یا بڑھتے بڑھتے محبت بن جاتی ہے۔ بہر حال حجاب اس بات کی قائل نہیں تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ انسان اندر سے مضبوط ہو تو وہ ہر قسم کی صورتِ حال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ ہر طرح کی روایتی اور معاشرتی پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کر سکتا ہے۔

ویسے ایک بات غور طلب تھی اور یہ خود حجاب کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ بے شمار زنجیروں میں بندھی ہوئی لڑکی تھی۔ ابھی تو نہیں سکتی تھی۔ پھر وہ نہیں کیوں جا رہی تھی۔ اس نے اپنے سسرال میں بہت سی مصیبتیں جھیلی تھیں۔ کئی کڑی آزمائشوں سے گزری تھی۔ شادی کے چند دن بعد ہی اس کے والدین کی بے وجہ توہین شروع ہو گئی تھی۔ شادی کے دو مہینے بعد ہی جلال نے اسے برا بھلا کہنا اور دھکے دینے شروع کر دیے تھے۔ اس کی ناراضگی کی جڑیں حجاب کی اس جرأت کے اندر تھیں جو حجاب نے شادی سے پہلے کی تھی۔ اس نے جاب کرنے کی بات کی تھی۔ بے شک بعد میں اس نے جاب کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ جلال سے معافی بھی مانگ لی تھی لیکن جلال کے دل میں یہ بات اٹک کر رہ گئی تھی کہ شادی سے پہلے حجاب نے اپنے جاب کرنے کو ایک شرط کے طور پر پیش کیا تھا۔

ساس آپا خانم کا رویہ پہلے روز سے ہی حجاب کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔ حجاب کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ خراب سے خراب تر ہی ہوا تھا۔ وہ حجاب کے خلاف جلال کو بھڑکانے میں اکثر کامیاب رہتی تھیں۔ یہ بات حجاب کے سوا حجاب کے سسرال اور میکے میں کسی کو معلوم نہیں تھی کہ جلال اس پر ہاتھ بھی اٹھاتا تھا۔ یہ سلسلہ شادی کے ایک سال بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ اب تو حجاب ان تھپڑوں کی تعداد بھی بھول چکی تھی جو اس نے گاہے بگاہے کھائے تھے۔

ہاں پہلا تھپڑ اسے آج تک نہیں بھولا تھا۔ حجاب کے ایک خالہ زاد کی شادی تھی۔ جلال نے اسے وہاں جانے سے منع کر دیا تھا کیونکہ مردوں اور عورتوں کے لیے بیٹھنے کا علیحدہ انتظام نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں بیہودگی ہو گی۔ اس کے علاوہ ڈھولک، مہندی کے گیت اور اس طرح کی دیگر رسوم بھی جلال کو بالکل پسند نہیں تھیں۔ وہ ایسی شادیوں پر جانے سے گریز کرتا تھا۔ حجاب نے بہت کہا کہ وہ پردے میں رہے گی، کسی کونے میں بیٹھی رہے گی لیکن وہ نہیں مانا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عورت جب کسی شادی بیاہ میں جانے کے لیے کپڑے بنواتی ہے۔ تیار ہوتی ہے تو پھر وہ اپنا آپ دکھائے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔ کسی نہ کسی طور وہ خودنمائی کا کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہے۔ حجاب کا جرم یہ نہیں تھا کہ وہ خدانخواستہ پھر بھی شادی پر گئی تھی۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ نہ جانے کی وجہ سے چپ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں رونے کے سبب لالی تھی۔ جلال نے اس روز کہا تھا کہ باہر کھانا کھائیں گے۔ عشاء کی نماز کے فوراً بعد حجاب تیار بھی ہو گئی تھی۔ جانے سے ذرا پہلے جلال کی نگاہ حجاب کے چہرے پر پڑ گئی اور اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔

"تم کھانے پر جا رہی ہو یا کسی کے سوگ پر؟"

"کیا ہوا جلال؟" وہ لرز کر بولی۔

"کون مر گیا ہے تمہارا جو ایسی صورت بنائی ہوئی ہے۔" وہ مزید بھڑک کر بولا۔ وہ سکتے میں رہ گئی۔ "جلال! میں نے کیا کیا ہے۔ آپ کیوں بولتے ہیں اس طرح۔ ایسے تو لوگ نوکرانیوں سے بھی....."

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ جلال کا تھپڑ اس کے رخسار پر پڑا تھا۔ وہ جیسے چکرا کر بستر پر گری۔ جلال کار کی چابی فرش پر پٹختا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ ہاں اس کے بعد بھی بند کمرے میں کئی تھپڑ حجاب کے حصے میں آئے لیکن یہ تھپڑ آج بھی اسے یاد تھا۔

حجاب نے سب کچھ سہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ سسرال والوں کے دل جیتنے کی بھرپور کوشش بھی کی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو جلال کی مرضی میں فنا کر لیا تھا۔ وہ دن کو رات کہتا تھا تو وہ بھی بڑے خلوص سے اسے رات کہنے لگی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیا بات تھی۔ جلال کی چاہت کو حجاب کی خود سپردگیوں اور عاجزیوں سے ہمیشہ بیر رہا تھا۔ بہرحال حجاب کو کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اگر وہ کچھ جھیل رہی تھی تو اپنے گھر کے لیے جھیل رہی تھی۔ یہ اس کا آنگن تھا۔ اسے سنوارنے کے لیے وہ ہر آزمائش سے گزر سکتی تھی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کے دل میں عجیب اندیشے سر اٹھانے لگے تھے۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے آنگن میں کسی اور کے قدم بھی پڑنا شروع ہو گئے ہیں۔ یہ قدم بہت آہستہ آہستہ لیکن بتدریج آگے بڑھ رہے تھے۔ پہلے پہل ارم صرف پندرہ بیس روز کے لیے ان کے گھر ٹھہری تھی۔ ان دنوں وہ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے کوشش کر رہی تھی۔ بعد ازاں اس نے اپنا قیام بڑھا دیا اور گھر کا اپنے لیے ایک الگ پورشن کھلوا لیا۔ اپنی بڑی بہن فوزیہ کی مخالفت کے باوجود وہ اس گھر میں رہ رہی تھی اور روز بروز جلال کے ساتھ بے تکلف بھی ہو رہی تھی۔ ان دنوں جلال نے حجاب کو طفل تسلیاں دی تھیں اور کہا تھا کہ وہ یہاں

دو چار ہفتوں کی مہمان ہے لیکن اس مہمان کے سائے دھیرے دھیرے اس گھر پر بڑھتے ہی گئے تھے۔ آخر ایک موقع پر حجاب نے جلال سے اس ضمن میں پُرزور احتجاج کیا تھا۔ وہ کئی دن روتی رہی اور اس نے کھانا بھی شاذ و نادر ہی کھایا۔ تب جلال نے اسے تسلی دی تھی کہ ارم کا داخلہ وینس کی یونیورسٹی میں ہو گیا ہے اور وہ یہاں سے جا رہی ہے۔

یہ چند دن حجاب کے لیے قدرے سکھ کے تھے لیکن تب ایک بار پھر اندیشوں کے دیو چنگھاڑتے ہوئے اس کے دل و دماغ میں گھس آئے تھے۔ وہ دن حجاب کے لیے بڑا اندوہناک تھا اور آج بھی اسے یاد تھا۔ گھر گرہستی کی ہزار ہا تکلیفیں ایک طرف اور یہ جانکاہ انکشاف ایک طرف۔ اس رات اس نے جلال کو فون پر ارم سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ پوری کوشش کر رہا ہے۔ امید ہے کہ چند روز تک روم کی یونیورسٹی میں اس کا داخلہ ہو جائے گا۔ تب حجاب پر یہ انکشاف بھی ہوا تھا کہ ارم اس لیے وینس نہیں گئی تھی کہ جلال نے اپنی شریکِ حیات کے آنسوؤں کا خیال کرتے ہوئے اس کو وینس جانے کی صلاح دی تھی۔ بلکہ وہ اس لیے گئی تھی کہ اسے کوشش کے باوجود روم کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہیں مل رہا تھا۔ وینس والا انتظام عارضی تھا۔

اور یہ وہی رات تھی جب حجاب کے سینے میں پہلی بار ایک عجیب سی بے باکی کی چنگاری چمکی تھی۔ اس چنگاری کو بغاوت تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس کو اپنے ماحول سے شدید بیزاری کا نام ضرور دیا جا سکتا ہے۔ اگلے روز جلال اپنے کام سے نیاگو چلا گیا تھا اور حجاب اس کی اجازت سے اپنی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے وینس چلی گئی تھی اور پھر وینس میں ہی اس کے قدم ایک شب اس گلی میں پڑے تھے جہاں ایک راہزن ہادی کا بیگ اٹھا کر بھاگا تھا اور حجاب نے اسے روکنے کے لیے اس کے راستے میں ایک چھتری گرائی تھی۔ حجاب کے لیے وہ عجیب اتھل پتھل کے دن تھے اس نے اپنے مزاج سے بالکل ہٹ کر کام کیا تھا۔ خود کو سیر سپاٹے اور موج مستی میں گم کرنے کی کوشش کی تھی۔

حجاب کو دوسرا بڑا جھٹکا کب لگا تھا۔ اسے دوسرا بڑا جھٹکا صرف تین چار دن پہلے لگا تھا۔ حجاب نے جلال کی امی ([illegible]) کو فون کر کے ان کی خیر خیریت پوچھنا چاہی تھی۔ وہ تو سو رہی تھیں (یا شاید ویسے ہی بات کرنا نہیں چاہتی تھیں) حجاب کی بات شریفاں سے ہو گئی تھی۔ شریفاں کی زبانی یہ اطلاع حجاب تک پہنچی تھی کہ ارم نے پیش قدمی کرتے ہوئے ایک اور بڑا قدم آگے بڑھایا ہے اور اب وہ سویرے جلال کے ساتھ اس کی کار میں یونیورسٹی جاتی ہے۔ حجاب بچی نہیں تھی۔ وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ ہوا کا رُخ کس طرف ہے۔ جلال کے راسخ خاندان میں مردوں کے اندر دوسری شادی کا رجحان پایا جاتا تھا۔ یہ رجحان بہت زیادہ تو نہیں تھا بہرحال موجود تھا۔ اس روز شریفاں سے بات کرنے کے بعد حجاب کے اندر دوسری چنگاری چمکی تھی۔ اس بار اس چنگاری کی چمک پہلے سے زیادہ تھی اور اس کی تپش بھی۔ پھر اس روز نہ جانے کیوں حجاب نے ہادی سے فون پر بات کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ اپنے سابقہ رویے پر معذرت چاہتی ہے۔ وہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے جائے گی۔ بے شک ہادی سے اس کی بات ایک مخلص دوست کی حیثیت سے ہوئی تھی پھر بھی پتا نہیں حجاب میں یہ جرأت کہاں سے آئی تھی کہ اس نے فون اٹھایا اور ایسی بات کر پائی۔ اسے خود اپنی سمجھ بھی نہیں آ رہی تھی کہ اس نے کیا کیا ہے۔ کل کئی گھنٹے تک وہ ہادی کے ساتھ رہی تھی اور انہوں نے سمندر دیکھا تھا اور اب وہ پھر سوچ رہی تھی۔ گہرے تذبذب میں تھی۔ پتا نہیں

کیوں اس کی چھٹی حس اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ بے شک حجاب اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ ایک بے ضرر مصروفیت ہے اور ہادی ہر طرح سے ایک شریف النفس شخص ہے لیکن پھر بھی دل کے اندر خوف کے سائے لہرا رہے تھے۔

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے نیم وا آنکھوں سے سوچتی رہی۔ اس دوران میں اطالوی ملازمہ ڈورتھی نے صفائی کرتے ہوئے کامن روم کے ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اندر بلب کی دودھیا روشنی تھی۔ حجاب کی نظر سب سے پہلے دیوار گیر تصویر پر پڑی۔ یہ اس کی عزیز ترین دوست بینش کی تصویر تھی۔ شدید تذبذب کے ان لمحوں میں یہ تصویر عجیب سا تاثر لے کر آئی۔ حجاب کو لگا کہ یہ تصویر فیصلہ کرنے میں اس کی مدد کرنے کو آئی ہے۔

حجاب کی رگوں میں سنسناہٹ سی پھیل گئی۔ اس تصویر نے جیسے خاموشی کی زبان میں کہا۔ "حب کیا مجھے بھول گئی؟ میرے انجام کو بھول گئی۔ یہ مردوں کی دنیا ہے میری پیاری حب! یہاں ہماری چھوٹی سی جرأت کو بھی کچل دیا جاتا ہے۔ ایک ذرا سی مرضی کو بغاوت کہہ کر قابل سزا ٹھہرایا جاتا ہے۔ نہیں حب! یہ ٹھیک نہیں۔ کیا تم بھی میری طرح ایک چھوٹے سے پنجرے میں پھڑ پھڑاتے ہوئے جان دینا چاہتی ہو؟"

حجاب کو ایک جھرجھری سی آئی۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر ٹہلنے لگی۔ امی ابو اور بھائی کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومے۔ وہ ایک نہیں ان گنت زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اپنی چھوٹی سی خوشی پر ایک معمولی سی مرضی پر بھی اس کا اختیار نہیں تھا اور شاید اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ اس صورتِ حال کی مزاحمت کر سکتی۔ وہ والدین کی پریشانیوں میں اضافے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دو سال پہلے والدہ کی بیماری پر بہت زیادہ اخراجات اُٹھے تھے۔ ان اخراجات نے اس فیملی کو قرضے کے بھاری بوجھ تلے دبا رکھا تھا۔ یہ گھر بھی جس میں اس کے والدین رہتے تھے۔ ایک طرح سے رہن تھا۔ کسی بھی وقت چھت ان کے سروں پر سے سرک سکتی تھی۔ کچھ قرضہ بھائی فیصل کی وجہ سے بھی سر چڑھا تھا۔ فیصل نے اپنے کسی ڈاکٹر دوست کے ساتھ مل کر گفٹ شاپ کھولی تھی۔ وہاں ڈکیتی کی واردات ہو گئی اور بہت زیادہ نقصان ہوا۔ شکر تھا کہ اللہ نے جانی نقصان سے بچا لیا۔

اپنے حالات اور مجبوریوں کا سوچ کر ایک عجیب سی ناتوانی حجاب کے رگ و پے میں اُتر گئی۔ وہ جو ہادی کو کال کرنے کا سوچ رہی تھی۔ ارادہ بدل کر کمرے میں چلی گئی۔ اسے لگا اس کے اردگرد دیواریں اونچی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کا دم گھٹ رہا ہے، گھٹتا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بعد نقاہت کے سبب اسے نیند سی آنے لگی۔

یکایک فون کی بیل ہوئی۔ وہ ٹھٹک گئی۔ کہیں ہادی ہی کی کال نہ ہو۔ اس نے سکرین دیکھی اور اطمینان کی سانس لی۔ یہ اس کی سسرال کی ملازمہ شریفاں کا فون تھا۔

"ہیلو وڈی باجی! میں شریفاں بول رہی آں۔"

"ہاں شریفاں! کیا حال چال ہے تیرا؟" حجاب نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں باجی! تسی سناؤ، کی کر رہے ہو؟"

"۔۔۔ چھ نہیں لیٹی ہوئی تھی۔"

شریفاں کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ "باجی! آپ گھر واپس کیوں نہیں آ جاتیں۔ دل بڑا اداس ہے۔"

"خیریت تو ہے شریفاں۔"

"باجی! یہاں پر چنگا نہیں ہو رہا۔ سچ پچھو تو میرا دل رو رہا ہے اس ویلے۔۔۔" وہ جیسے بے ساختہ کہہ گئی۔

"کیا ارم بی بی کی طرف سے کوئی بات ہوئی ہے؟ کوئی جھگڑا کیا ہے اس نے تم سے؟"

"مجھ سے کرتی تو کوئی گل نہیں تھی۔ وہ تو آپ سے کر رہی ہے۔ پورا ویر لے رہی ہے تہاڈے سے۔"

حجاب کا دل زور سے دھڑکا۔ "شریفاں کھل کر بتاؤ۔"

وہ گھبری آواز میں بولی۔ "وہ اوپر والے کمرے وچ چلی گئی ہے جی۔ وڈے بھائی جان کے نال والے کمرے وچ۔ کہتی ہے کہ تھلے (نیچے) والا کمرہ ہوادار نہیں ہے۔ میں نوں چنگی طرح پتا ہے کہ اس کو کس طرح کی ہوا چاہیے۔ میں سارا کچھ سمجھ رہی ہوں وڈی باجی۔"

"تو زیب نے کچھ نہیں کہا اسے؟"

"وہ کسی کی سنتی ہی کب ہے جی۔ وہ کیا کہتے ہیں جی ساری خدائی ایک پاسے میرا ڈھولن ماہی ایک پاسے۔ اسے آج کل وڈے بھائی جان کے سوا کسی کی پروا نہیں ہے جی۔" شریفاں کی آواز میں دکھ لہریں لے رہا تھا۔

حجاب کے دل پر بھی اس خبر نے غیر معمولی اثر کیا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ اس اوپر والے کمرے میں ارم نے ایک بار پہلے بھی آنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت حجاب نے ایسا نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے جلال سے کہا تھا کہ ان کی پرائیویسی متاثر ہو گی۔ جلال کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی لیکن اب ارم نے پھر وہ کمرہ منتخب کیا اور جلال نے اس کی اجازت دے کر حجاب کو بتایا تھا کہ بات کتنی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یقیناً ارم کا ۔۔۔ میں آپا خانم کا بھی عمل دخل تھا۔

وہ سب کچھ سہنے کو تیار تھی۔ جلال سے ہر طرح کی جسمانی اور ذہنی توہین برداشت کر کے بھی اس کے آگے پیچھے پھر سکتی تھی۔ ۔۔۔ جی کر مر سکتی تھی لیکن دوسری عورت سے بچنے کے لیے کسی کے سامنے کسی طرح کی عاجزی یا مستعدی کا اظہار اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ ایسا کرے گی تو عورت کے درجے سے نیچے گر جائے گی۔ ایک مفاد پرست منافق مخلوق بن جائے گی۔ کوئی ایسی جنس جو دانے پانی اور زندگی کی دیگر سہولتوں کی خاطر عورت اور بیوی کا روپ دھارے گی۔

شریفاں سے بات کر کے وہ دیر تک بستر پر لیٹی رہی۔ سینے میں کچھ جدا سی ہلچل تھی۔ چنگاری پر ایک چنگاری۔۔۔ زیادہ روشن۔۔۔ زیادہ حرارت والی۔

ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ اس کا جواب نہیں تھا لیکن ایسا ہو رہا تھا۔ اداسی کے سائے مختصر ہونے کے بعد پھر بڑھنا شروع ہو گئے تھے۔ شام دبے پاؤں روم کے در و دیوار پر اتر رہی تھی۔ نیلے آسمان پر جہازوں کی چھوڑی ہوئی لاتعداد سفید لکیریں تھیں اور ان لکیروں سے نیچے پرندے محوِ پرواز تھے۔ ایک گہری سانس لے کر حجاب نے فون اٹھایا۔ ہادی

کا نمبر پریس کیا۔

''ہیلو کون؟'' دوسری طرف سے ہادی کی شائستہ آواز اُبھری۔

''حجاب بول رہی ہوں۔''

''جی جی بولیے۔ کب سے آپ کے بولنے کا منتظر تھا۔''

''تو کیا پروگرام ہے کل کا؟''

''وہی جو آپ نے کہا تھا۔ ٹھیک دس بجے ہوٹل کی لابی میں۔ اگر اس میں کوئی رد و بدل ہوا تو میں آپ کو بتاؤں گا۔''

''رد و بدل کا امکان بھی ہے؟'' اس نے کہا اور نچلا ہونٹ آہستہ سے دانتوں تلے دبایا۔

''نہیں...... ویسے ہی بات کر رہا تھا۔'' ہادی نے گھبرا کر کہا۔

وہ مسکرائی۔ ''اگر رد و بدل کا امکان ہے تو میں بھی شاپنگ وغیرہ کی شکل میں کوئی سیکنڈ آپشن رکھ لوں لیے۔''

''خدا کے لیے مجھے معاف کر دیجیے۔ میں کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

وہ ہنسنے لگی چند رسمی باتوں کے بعد یہ ٹیلیفونک گفتگو اختتام پذیر ہو گئی۔

O......❖......O

حجاب کے فون کے بعد ہادی بے چینی سے ہوٹل کے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پروگرام کے مطابق حجاب کو کل ساڑھے دس بجے آنا تھا اور یہاں صورت حال یہ تھی کہ وہ منحوس شخص ابھی تک ہادی کے اردگرد منڈلا رہا تھا۔ سیکنڈ فلور کی لابی میں موجود تھا اور صوفے پر آرام سے بیٹھا سہ پہر کا اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ کون تھا؟ کیا چاہتا تھا؟ ہادی کے ذہن میں ان گنت سوال منڈلا رہے تھے۔ ابھی ڈھائی تین گھنٹے پہلے ہادی نے لاہور میں اپنے پروفیسر شیخو صاحب سے بات کی تھی اور صورت حال سے تھوڑا بہت آگاہ کیا تھا۔ شیخو صاحب نے تین نمبرز لکھوائے تھے۔ ان میں سے ایک نمبر بڑا کارآمد تھا۔ یہ نمبر ایک ایسے پاکستانی نژاد اطالوی کا تھا جو روم کی پولیس میں حاضر سروس ڈپٹی انسپکٹر تھا۔ اس کا نام شیخو صاحب نے ہاشم ایرک بتایا تھا۔ ایرک کی سمجھ تو ہادی کو نہیں آئی تھی لیکن ہاشم کی اچھی طرح آ گئی تھی۔ اب یہ ہاشم ایرک تھوڑی دیر میں ہوٹل پہنچنے والا تھا۔ پروگرام کے مطابق وہ سادہ لباس میں تھا اس نے سرخ شرٹ پہن رکھی تھی ہادی نے بھی اسے اپنے لباس کا رنگ بتا دیا تھا اور سیل نمبر بھی دے دیا تھا۔

پروگرام کے مطابق ٹھیک پانچ بجے ہادی اٹھا اور ٹہلتا ہوا لابی میں پہنچ گیا۔ ایل سی ڈی پر ایک رومانٹک کامیڈی فلم چل رہی تھی۔ آٹھ دس مرد و زن محو تماشا تھے۔ ان میں ہی وہ دھاری دار شرٹ والا ناٹا شخص بھی تھا لیکن وہ فلم نہیں دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔

ہادی نے دیکھا گہری سرخ شرٹ والا دراز قد پولیس آفیسر لابی میں پہنچ چکا تھا اور اب سگریٹ سلگا کر فلم دیکھنے میں مصروف تھا۔ دو لمحے کے لیے اس کے ساتھ ہادی کی نگاہیں ملیں اور آنکھوں آنکھوں میں علیک سلیک ہو گئی۔ ہادی پولیس آفیسر ہاشم ایرک کے پاس سے گزرتا ہوا سیدھا ناٹے قد والے کے پاس پہنچ گیا۔

''ہیلو...... اسلام علیکم۔'' ہادی نے اس کے پاس جھک کر کہا۔

اس نے ہادی کو دیکھا اور اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جلدی سے سنبھل کر بولا۔ ''وعلیکم سلام۔''

''آپ پاکستانی ہیں؟'' ہادی نے پوچھا۔

''نن...... نہیں لیکن اردو بول سکتا ہوں۔ آپ فرمائیں کیا بات ہے؟''

''یہاں زبان کا بہت مسئلہ ہے۔ ہم زبان سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ میرا نام ہادی ہے۔ میں یہاں کمرہ نمبر 118 میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ویسے آپ اطالوی پڑھ لیتے ہیں؟''

''کوئی حد تک...... آپ فرمایئے۔''

''میرے کمرے میں دیوار پر روم کا ایک نقشہ لگا ہے لیکن جگہوں اور راستوں کے نام وغیرہ اطالوی میں ہیں۔ کیا آپ اس کو سمجھنے میں میری مدد کر سکتے ہیں؟''

وہ جیسے چند لمحوں کے لیے تذبذب میں رہا۔ پھر بولا۔ ''چلیے...... میں دیکھ لیتا ہوں۔''

دونوں لابی سے اُٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ ہادی نے دروازہ بند کر دیا لیکن لاک نہیں کیا۔ دیوار پر قریباً تین فٹ مربع چار فٹ کا ایک اسٹائلش نقشہ موجود تھا۔ اسے دیکھ کر وہ شخص مسکرانے لگا۔ ''جی ہاں یہ نقشہ تو اطالوی میں ہے لیکن اس کو انگلش اور عربی وغیرہ میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ دیکھیے۔''

اس نے نقشے کو ہاتھ سے حرکت دی وہ سلائیڈ کر کے ایک طرف چلا گیا۔ اس کے نیچے ویسا ہی ایک دوسرا نقشہ موجود تھا۔ یہ انگلش میں تھا۔ ''اوہو تو یہ بات ہے۔'' ہادی نے ہونٹ سکوڑے۔

وہ صرف اداکاری کر رہا تھا۔ ورنہ اسے بھی معلوم تھا کہ نقشے کے نیچے دو تین اور نقشے بھی موجود ہیں۔

''کہاں گھومنا چاہتے ہیں آپ؟'' نوجوان شخص نے قدرے باریک آواز میں پوچھا۔ مضبوط جسم کے مقابلے میں یہ آواز ایک طرح کا تضاد پیش کرتی تھی۔

''روم سنٹرم۔'' ہادی نے جواب دیا۔

وہ دونوں نقشے پر جھک گئے۔ وہ شخص ہادی کو انگلی کی مدد سے بتانے لگا کہ فلاں رستہ کہاں سے نکلتا ہے اور کدھر کو جاتا ہے اور میٹرو ٹرین یا بس کہاں سے بہ آسانی مل سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے ہادی اس کے بالکل قریب آ گیا تھا۔ ہادی نے جان بوجھ کر اپنی بائیں کہنی کو اس کے جسم سے قریب تر کر دیا اور یوں اس کا شک یقین میں بدل گیا اس کی کہنی اس نامعقول شخص کی بیلٹ سے مَس ہوئی۔ یہاں ہادی کو کسی اُبھری ہوئی سخت چیز کا احساس ہوا یہ یقیناً پسٹل یا ریوالور وغیرہ کا دستہ ہی تھا۔ ہادی کے جسم میں دوڑتی ہوئی سنسناہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔

اب وہ ہادی کو اندرونی گلیوں کے کچھ شارٹ کٹس بتا رہا تھا۔ یقیناً وہ اس شہر کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کی طرح جانتا تھا۔ ہادی نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اچھا یہ بتائیں کہ اگر کوئی بندہ یہاں میٹرو کے اس اسٹیشن سے آپ

کے پیچھے لگ جاتا ہے اور آپ اس سے بچ بچا کر یہاں اس ساحل تک جانا چاہتے ہیں تو آپ کو کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔"

اس نے ذرا چونک کر ہادی کو دیکھا۔ "میں سمجھا نہیں۔"

ہادی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ روم ہے۔ یہاں ہر طرح کے بُرے بھلے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اگر کوئی کسی غلط نیت سے آپ کے پیچھے لگ جائے تو پھر کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

وہ اب ہادی کے لب و لہجے سے ٹھٹک گیا تھا۔ ذرا سنبھل کر بولا۔ "کیوں جناب! کہیں آپ کو کوئی بُرا تجربہ ہے؟"

"ایسا ہی سمجھ لیجیے۔" ہادی نے کہا۔ اسی دوران میں وہ چپکے سے اپنے سیل فون کا بٹن پش کر چکا تھا۔ اس بٹن کے پش ہوتے ہی ڈپٹی ہاشم ایرک کو کال چلی گئی تھی۔ یہ کال اس بات کا اشارہ تھی کہ اب وہ دھڑلے سے چل کر کمرے کے اندر آ جائے۔ بمشکل آٹھ دس سیکنڈ بعد لمبا چوڑا ہاشم ایرک کمرے کے اندر تھا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور سوالیہ نظروں سے ہادی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ شخص اب بُری طرح ٹھٹکا ہوا تھا۔ اسے گڑبڑ کا احساس ہو چکا یا بس ہونے ہی والا تھا۔ ہادی نے جھک کر اس کے پستول نما ہتھیار کو شرٹ کے اوپر سے ہی دبوچ لیا۔ ہاشم بھی لپکا۔ چند سیکنڈ بعد یہ ہتھیار اس شخص کی شرٹ کے نیچے سے نکل کر ہاشم کے چوڑے چکلے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ یہ چھوٹے سائز کا ایک بریٹا پستول تھا۔ ہاشم نے دھکا دے کر اس شخص کو صوفے پر گرا دیا۔

"کون ہو تم؟ ایسا کیوں کر رہے ہو؟" نوجوان شخص لرزاں آواز میں بولا۔ اس کے چہرے پر رنگ آ جا رہے تھے۔

ہاشم نے اپنا آئی ڈی کارڈ نکال کر اس کے سامنے کر دیا۔ "پولیس ڈپٹی انسپکٹر ہاشم ایرک" اس نے کہا۔ اس شخص کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ دو سیکنڈ کے لیے لگا کہ وہ اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرے گا مگر پھر جہاں تہاں پڑا رہ گیا۔ "کھڑے ہو جاؤ اور دیوار کی طرف منہ کرو۔" ہاشم انگلش میں پھنکار کر بولا۔

"میرا جرم کیا ہے؟" وہ ہکلایا۔

ہاشم کے تھپڑ کی گونج پورے کمرے میں سنائی دی۔ "اٹھو اور دیوار کی طرف منہ کرو۔" ہاشم نے سرسراتی آواز میں کہا۔

اس شخص کے ہونٹوں سے اب خون رس رہا تھا۔ چار و ناچار وہ اٹھا اور اس نے منہ پھیر کر دونوں ہاتھ دیوار پر ٹیک دیے۔ ہاشم نے اچھی طرح اس کی تلاشی لی اور اس کی جیبوں میں موجود ساری اشیاء نکال کر میز پر ڈھیر کر دیں۔ ان میں سیل فون اور پرس وغیرہ بھی شامل تھے۔ "چلو اب سامنے اس کرسی پر بیٹھو۔" ہاشم نے تحکم سے کہا۔

وہ ٹشو پیپر سے اپنے ہونٹ کا خون پونچھتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کوئی چالاکی دکھائی تو بُری طرح پچھتانا پڑے گا۔" ہاشم نے کہا۔ "مجھے یقین ہے تمہارے پاس پستول کا لائسنس بھی نہیں ہوگا۔ ناجائز اسلحے کے چارج میں ڈھائی تین سال کی جیل تو کہیں بھی نہیں گئی تمہارے لیے۔"

وہ شخص کرسی پر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے ہاشم اور ہادی کو دیکھنے لگا۔ ہاشم نے اس کی جیبوں سے نکلنے والی اشیاء دیکھیں۔ ان میں اس شخص کا کوئی شناختی کاغذ موجود نہیں تھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" ہاشم نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"گلزار... گلزار احمد۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"ذوب یونیورسٹی سے اکاؤنٹنگ کورس کیا ہے۔ اب جاب ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"رہائش کہاں ہے؟"

اس گلزار نامی شخص نے اپنا ایڈریس آفیسر کو لکھوا دیا۔

"مسٹر ہادی کا پیچھا کیوں کر رہے ہو مسلسل؟" ہاشم نے پولیس والوں کے انداز میں اچانک سوال کیا۔

اس کا رنگ کچھ اور پھیکا پڑ گیا۔ "یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم مسٹر ہادی کا پیچھا کیوں کر رہے ہو پچھلے دو دن سے؟ یہ جہاں جاتے ہیں تم ان کے پیچھے جاتے ہو۔"

"اگر ایسا ہے تو میرے لیے حیران کن بات ہے۔ یہ ایک اتفاق ہی ہوگا۔"

"لیکن اگر تمہیں دوسرا تھپڑ رسید کروں گا تو یہ بھی اتفاق ہی ہوگا۔ اور پھر میں اتفاقاً ہی تمہیں تھانے لے جا کر اتفاقاً ہی تمہیں آڑے ہاتھوں لوں گا۔ دیکھو مسٹر گلزار! تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ جو کچھ بھی ہے صاف صاف بتا دو۔ فرض کرو تمہارے خلاف کچھ اور نہ بھی سامنے آیا تو یہ پستول ہی تمہیں جیل بھیجنے کے لیے کافی ہے۔"

"میں قسم کھاتا ہوں کہ......"

ابھی اس کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ہاشم کا ایک اور زوردار تھپڑ گلزار کے منہ پر پڑا۔ وہ کرسی سمیت اُلٹتے اُلٹتے بچا۔ ہاشم نے اس کے بال مٹھی میں جکڑے اور دانت پیس کر کہا۔ "آسانی سے نہیں بتاؤ گے تو سخت مشکل میں پڑو گے۔ تمہارے خلاف ثبوت ہیں۔"

کھینچا تانی میں گلزار کی دھاری دار شرٹ کندھے پر سے پھٹ گئی تھی۔ وہاں ایک عورت کا نازیبا ٹیٹو بنا ہوا تھا۔ نیچے انگریزی میں ایک فقرہ لکھا تھا۔ "مجھے ایک اچھا بستر اور ایک اچھی عورت دے دو۔ اس کے بعد مجھے کچھ نہیں چاہیے۔" (یہ دراصل ایک یورپی دانشور کے معروف قول کی نقل تھی۔ اس نے کہا تھا۔ مجھے ایک اچھا بستر اور ایک اچھی کتاب دے دو اس کے بعد مجھے کچھ نہیں چاہیے)

گلزار ہکلایا۔ "م...... میں اپنے وکیل سے بات کرنا چاہوں گا۔"

"لیکن پھر اس سے پہلے تمہارے خلاف ایف آئی آر درج ہو گی۔" ہاشم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

وہ ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ ہاشم نے اس کی جیب میں سے نکلنے والی چیزوں کی جانچ شروع کی۔ اس کے پرس میں سے 270 یورو نکلے۔ کچھ رسیدیں تھیں۔ ایک نیم عریاں اطالوی حسینہ کی تصویر تھی۔ ایک رسید سے اندازہ ہوا کہ اس

نے اپنا ایڈریس درست بتایا ہے۔ وہ ایون نینو کے علاقے میں ایک بلڈنگ کے اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھا۔ تقریباً چار گھنٹے پہلے اس نے ایک اے ٹی ایم مشین سے کیش نکلوایا تھا۔ اے ٹی ایم کی رسید پر اسی کے اکاؤنٹ کی تفصیل درج تھی۔ ہاشم نے اس کا سیل فون چیک کیا۔ اس فون سے آخری تین کالیں گلزار نے آئی ایم نامی کسی فرد کو کی تھیں۔ آئی ایم کی اور کئی کالیں بھی فون کی کال ہسٹری میں موجود تھیں۔ ''یہ آئی ایم کون ہے؟'' ہاشم نے پوچھا۔

''میرا دوست ہے، اور میں آپ سے پھر گزارش کرتا ہوں کہ آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔''

''اگر یہ غلط فہمی ہے بھی تو ہم اس کو ابھی دور کر لیتے ہیں۔'' ہاشم نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

سیل فون پر ایک نمبر پر ٹیپ کرتا ہوا ہاشم کمرے کے ایک کونے میں چلا گیا۔ وہاں ایک کرسی پر بیٹھ کر وہ اطالوی میں کسی ساتھی افسر سے باتیں کرنے لگا۔ دو چار منٹ بعد اس نے ایک اور نمبر ملایا اور وہاں بھی اطالوی میں بات کی۔ اس گفتگو میں اس نے گلزار کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیل بھی دوسرے شخص کو بتائی۔ باہر کے ملکوں میں شہریوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا نظام کتنا منظم ہے اور اس تک رسائی کتنی تیزی سے ہوتی ہے اس کا اندازہ اگلے چند منٹ میں ہوا۔

قریباً دس منٹ بعد ہاشم ایرک اپنے فون کی سکرین پر کچھ تلاش کرتا ہوا ہادی کی طرف آیا اور پھر فون سے نگاہیں ہٹا کر بولا۔ ''مسٹر ہادی! یہ مس ارم چودھری کون ہیں؟''

ہادی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ظہیر کی سالی ارم چودھری کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوما۔ ''کیوں کیا بات ہے ہاشم صاحب!'' ہادی نے پوچھا۔

''یہ جو آئی ایم لکھا ہوا ہے اس سے مراد مس ارم ہے۔ اس فون سے مس ارم کے ساتھ بار بار رابطہ کیا گیا ہے۔ اور آپ کی اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ مس ارم کے اکاؤنٹ سے گاہے بگاہے رقم بھی گلزار کے اکاؤنٹ میں منتقل ہوتی ہے۔ آخری ٹرانزیکشن صرف دو دن پہلے ہوئی ہے۔''

ہادی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ارم ہی وہ لڑکی تھی جو حجاب کے گھر میں تیزی سے اپنا رستہ بنا رہی تھی۔ حجاب اور اس کے شوہر جلال میں دوریاں پیدا کرنے کے حوالے سے ارم کا اہم کردار تھا اور اب ثابت ہو رہا تھا کہ یہی ارم اس گلزار نامی شخص کے ساتھ مستقل رابطے میں ہے۔ اسے کسی نامعلوم مد میں رقم دے رہی ہے اور یہ گلزار ہادی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ یا شاید حجاب کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اگر وہ حجاب کے پیچھے لگا ہوا تھا تو یقیناً جان چکا تھا کہ ہادی اور حجاب روم میں اکٹھے گھوم پھر رہے ہیں۔ یہ خطرناک صورت حال تھی۔ حجاب جو پہلے ہی مشکلات کا شکار تھی شدید ترین مشکلات میں پھنس سکتی تھی۔ ہادی کی ہتھیلیوں پر پسینہ آ گیا۔ وہ ہاشم کو ایک طرف گوشے میں لے گیا اور سرگوشیوں میں اس سے بات کرنے لگا۔ اس نے ہاشم کو بتایا کہ اس بندے سے کچھ نہ کچھ اگلوانا ضروری ہے۔ ورنہ یہ اس کی دوست کو بہت نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس گفتگو کے دوران میں ان دونوں نے اپنی نگاہ گلزار کی طرف ہی رکھی تھی کہ وہ کہیں کوئی چالاکی نہ دکھا جائے۔

ہاشم نے کہا۔ ''آپ گھبرائیں مت یہ ضرور بکے گا۔ میں نے اس کا ریکارڈ ڈھونڈ لیا ہے۔ اس پر پہلے ہی نا جائز طور رکھنے کے الزام میں کیس چل چکا ہے۔ تب یہ ناکافی ثبوت کی بنا پر صرف بیس دن جیل میں رہ کر باہر آ گیا تھا۔ اب بڑا پکا کیس بن سکتا ہے اس پر لیکن یہ مس ارم کون ہے؟''

''یہی لڑکی سارا چکر چلا رہی ہے۔ یہ میری دوست کو سخت نقصان پہنچانا چاہ رہی ہے اور اس میں اس کا مفاد چھپا ہوا ہے۔''

ہادی نے مختصر الفاظ میں ہاشم ایرک کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اسے بتایا کہ اس کی دوست کا نام حجاب ہے اور وہ صرف مخلص دوست کی حیثیت سے ملتے جلتے ہیں۔ حجاب کے بارے میں اس سے پہلے بھی وہ ہاشم کو تھوڑا بہت بتا چکا تھا۔ (شیخو صاحب نے ہادی کو بتایا تھا کہ ہاشم ایرک پر ہر طرح کا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔)

ہاشم نے گلزار کے پاس جا کر دوٹوک لہجے میں بات کی اور اسے بتایا کہ اسے پولیس اسٹیشن چلنا ہوگا اور اس کے خلاف کیس رجسٹرڈ ہوگا۔ اس کے علاوہ اس نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ بہت سخت طریقے سے پھنسنے والا ہے۔

گلزار اب بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ وہ ہاشم کی سخت مزاجی سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا اور جو تھپڑ کھانے کے خوف سے سہما ہوا تھا۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے دس پندرہ منٹ کے اندر اندر ہاشم ایرک نے گلزار کو گھٹنوں پر کر دیا۔ وہ وکیل ویل والی ساری باتیں بھول کر منت سماجت پر اتر آیا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس کے پاس اس بے نام پسٹل کا لائسنس نہیں ہے اور یہ پسٹل اس نے کسی اٹھائی گیرے سے 300 یورو میں خریدا تھا۔ تاہم ارم کے حوالے سے وہ کسی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس یہی کہہ رہا تھا کہ وہ اس کی کلاس فیلو رہی ہے اور ان کا آپس میں لین دین چلتا رہتا ہے۔

بہرحال ہاشم نے اس پر اپنا دباؤ برقرار رکھا۔ بلکہ اسے بڑھاتا چلا گیا۔ وہ اسے ہتھکڑی لگا کر پولیس اسٹیشن لے جانا چاہ رہا تھا۔ ہتھکڑی منگوانے اور اپنے معاون اہل کار کو بلانے کے لیے اس نے اپنا واکی ٹاکی ہاتھ میں لیا تو گلزار کی رہی سہی برداشت بھی ختم ہو گئی۔ اس نے ڈپٹی انسپکٹر ہاشم کے واکی ٹاکی پر ہاتھ رکھ دیا اور سخت سماجت کرنے لگا۔

اس موقع پر ہادی نے مداخلت کی اور ہاشم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''آفیسر اگر یہ تعاون کر رہا ہے تو پھر اسے ہتھکڑی نہ لگائی جائے اور کیا اس کے وکیل سے اس کی بات کرانا بھی ہمارے لیے ممکن ہوگا؟''

ہاشم ایرک نے ہادی کو گھورا۔ ''مسٹر ہادی! کیا آپ مجھے سکھائیں گے کہ مجھے اپنا کام کس طرح کرنا چاہیے؟''

''نہیں... میرا مطلب تھا کہ اگر...''

''پلیز مسٹر ہادی! آپ خاموش رہیں۔ یہ بہت سیریس کیس ہو گیا ہے اور جناب! مجھے بھی اپنے بڑوں کو جواب دینا ہے۔''

وہ یہ کہتے ہوئے تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ہادی جانتا تھا کہ وہ یہ سب دکھاوے کے لیے کر رہا ہے۔ اس کا مقصد گلزار پر دباؤ بڑھانا تھا۔ اگر یہ بندہ پولیس اسٹیشن چلا جاتا تو پھر ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ رہتا اور یہ سلسلہ حجاب اور اس کے اہلِ خانہ کی رسوائی کی طرف چل نکلتا۔ ہادی نے آواز دے کر ہاشم کو روک لیا اور پھر کمرے کے ایک گوشے میں جا کر دوبارہ اس سے کھسر پھسر شروع کر دی۔ کسی حد تک ہادی بھی جان چکا تھا کہ اب گلزار عرف

گلزاری بے طرح پھنس چکا ہے اور اسے چند سال کی جیل آنکھوں کے سامنے نظر آ رہی ہے۔ اس موقع پر اس سے بلیک میلنگ کی جا سکتی تھی۔ اب اس سے کوئی ایسا خطرہ بھی نہیں تھا اس کی مکمل تلاشی ہو چکی تھی اور اس کا ناجائز پستول ہاشم کے قبضے میں تھا۔

ہادی نے یہی تاثر دیا جیسے اس نے سمجھا بجھا کر کسی طرح ہاشم کو وقتی طور پر کمرے سے باہر بھیج دیا ہے۔

گلزار کے ہونٹ سے گاہے بگاہے خون رسنے لگا تھا۔ ہادی نے اسے جراثیم کش ٹشو پیپر دیا تا کہ وہ ہونٹ پونچھ سکے۔ ایک کولڈ ڈرنک کھول کر اس کے پاس شیشے کی تپائی پر رکھا اور اس سے قدرے نرم لہجے میں باتیں کرنے لگا۔ اس نے گلزار کو باور کرایا کہ وہ بری طرح پھنس چکا ہے لیکن اگر وہ تعاون کرے تو ہاشم اسے کسی سخت ایکشن سے بچا سکتا ہے۔

اس نے گلزار سے کہا۔ "دیکھو نوے فیصد معلومات تو تمہارے بتائے بغیر ہی ہمیں مل چکی ہیں باقی دس فیصد دے دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں قانونی کارروائی والی مصیبت سے بچا لوں گا بلکہ ہو سکتا ہے ہمارے درمیان کوئی ایسا لنک بھی بن جائے جس سے تم مالی فائدہ حاصل کر سکو۔"

"دیکھیں میرے پاس بتانے کو زیادہ کچھ نہیں ہے اور اگر میں آپ کو بتا بھی دوں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ مکر نہیں جائیں گے اور ڈپٹی کو منا لیں گے؟" وہ دونوں اردو میں بات کر رہے تھے۔

ہادی نے ذرا روکھے لہجے میں کہا۔ "تمہارے پاس سودے بازی کے لیے کچھ نہیں ہے گلزار! میں بس تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں کہ ارم چودھری نے جلال کی وائف حجاب کو مشکل میں ڈالنے کے لیے تمہیں اس کے پیچھے لگا رکھا ہے اور تم اس کے کہے پر عمل کر رہے ہو۔"

گلزار کچھ دیر سوچتا رہا۔ اس کے گورے چٹے چہرے پر تذبذب کے گہرے سائے تھے پھٹی ہوئی شرٹ سے بیہودہ ٹیٹو کا کچھ حصہ جھانک رہا تھا۔ آخر طویل سانس لے کر بولا۔ "بے شک ایسا ہوا ہے لیکن مجھے کسی اندر کی کہانی کا پتا نہیں۔ ارم نے بس اتنا کہا تھا کہ حجاب اس کی فیملی ممبر ہے اور میں اس کے آنے جانے پر ذرا نظر رکھوں۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ شاید مسز حجاب کو کسی کی طرف سے کوئی خطرہ ہے جس کی وجہ سے ارم یہ بات مجھ سے کہہ رہی ہے اور دیکھیں یہ بات بھی غلط ہے کہ میں ارم سے رقم لے کر یہ کام کر رہا ہوں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے ہمارے درمیان۔"

گلزار کی آنکھوں میں عیاری تھی۔ اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا اور ہادی کو پورا بھروسہ تھا کہ وہ آدھا سچ بول رہا ہے بلکہ شاید چوتھائی سچ۔ وہ حجاب کو پھنسانے میں ارم کا ساتھی بنا ہوا تھا اور کرائے کے کارندے والا کردار ادا کر رہا تھا۔ بہر حال ہادی اس حوالے سے گلزار کے ساتھ کسی لفظی بحث میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا اولین مقصد یہی تھا کہ گلزار اپنا منہ بند رکھے اور حجاب کے خلاف کوئی ایسی ویسی بات ارم کے کانوں تک نہ پہنچائے۔ اس نے سافٹ ڈرنک کے دو گلاس بھرے ایک گلزار عرف گلزاری کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے بولا۔

"دیکھو میں تم سے سچ بولنے کی توقع کر رہا ہوں۔ کیونکہ تمہارا سچ ہی ہمارے تعلق کو آگے بڑھائے گا۔ جھوٹ بولو گے تو وہ چھپا نہیں رہے گا اور تم اس مصیبت سے نکل نہیں سکو گے۔ میں تم سے یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اب تک تم ارم چودھری کو کیا بتا چکے ہو؟"

"کس بارے میں؟"

"میرے اور حجاب کے بارے میں۔" ہادی نے صاف سیدھے الفاظ میں کہا۔

وہ ڈرنک کا گھونٹ لے کر بولا۔ "ابھی تک تو کچھ نہیں کیونکہ ابھی مجھے آپ کے پورے کوائف نہیں ملے تھے۔ لیکن آج رات کسی وقت میں نے اسے فون کرنا تھا۔"

ہادی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور اسے اندازہ ہوا کہ اس بار گلزار شاید سچ بول رہا ہے۔ اس نے گلزار سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کوائف سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

وہ بولا۔ "آپ کا نام تو مجھے معلوم ہو گیا تھا اور یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ آپ پاکستانی ہیں لیکن مجھے مزید تفصیل چاہیے تھی۔ ممکن ہے کہ جس طرح آپ نے لابی میں آ کر مجھ سے بات کی، میں بھی کوئی ایسی ہی کوشش کرتا۔"

ہادی نے اس سے دو چار سوالات مزید کیے اور اسے اندازہ ہوا کہ ابھی تک گلزار نے واقعی ارم کو اپنی کارکردگی سے آگاہ نہیں کیا۔ یہ خوش آئند تھا۔ گلزاری سے سودے بازی ہو سکتی تھی۔ اور ہادی سودے بازی کی بہترین پوزیشن میں بھی تھا۔ گلزار اچھی طرح جانتا تھا کہ ڈپٹی ہاشم ایک کمرے سے باہر موجود ہے اور ہادی کے ایک اشارے پر دوبارہ کمرے میں آ جائے گا۔ اس کے بعد وہی ہتھکڑی کی کھڑکھڑاہٹ اور پولیس کار کا پُرخطر سائرن.....

اگلے بیس پچیس منٹ میں ہادی اور گلزار کے درمیان کافی کچھ طے ہو گیا۔ گلزار نے ہادی کو یقین دلایا کہ وہ حجاب اور ہادی کے میل ملاقات کے سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھے گا۔ دوسری طرف ہادی نے گلزار کو گارنٹی دی کہ ڈپٹی ہاشم اس کی جان چھوڑ کر چلا جائے گا اور پولیس کارروائی کو یہیں پر روک دے گا۔ اس کے علاوہ ہادی نے گلزار کو یہ بھی یقین دلایا کہ ارم کو یہاں اس ہوٹل والے واقعے کے بارے میں اور یہاں ہونے والی ڈیل کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا۔ گلزار اپنا پستول واپس حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن جب ہادی نے فون پر ہاشم سے رابطہ کیا تو اس نے سختی سے منع کر دیا۔ گلزار کو پستول کے حوالے سے کڑوا گھونٹ بھرنا پڑا۔

ہادی اب تک یہ بات بڑی اچھی طرح جان چکا تھا کہ گلزار ہر لحاظ سے ایک حریص اور مطلب پرست شخص ہے۔ کرائے کا ایک ایسا ٹٹو جو رقم کے لیے کسی کے پیچھے بھی دُم ہلا سکتا ہے۔ یقیناً وہ ایک عورت باز شخص تھا اور اپنی دلپسند ضروریات کے لیے اسے وافر رقم کی ضرورت رہتی تھی۔ ہادی نے اس کی اس دُکھتی رگ پر بھی ہاتھ رکھا۔ اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "گلزاری! میں یار دل کا یار ہوں۔ دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو فائدے میں رہو گے۔"

وہ مری ہوئی آواز میں بولا۔ "ابھی تک تو نقصان ہی نظر آ رہا ہے ہادی صاحب۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! اگر پستول نہیں تو وہ میرا فون اور کیش ہی ہاشم صاحب سے واپس لے دیں۔" وہ اپنے ان 270 یورو کی

بات کر رہا تھا جو تلاشی کے دوران میں شہادت اور ثبوت کے طور پر ڈپٹی ہاشم کے پاس گئے تھے۔

ہادی نے کہا۔ "موبائل فون تمہیں واپس کر دیتا ہوں لیکن ان 270 یوروز پر خاک ڈالو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے دراز سے چند ٹریولز چیک نکالے اور ان پر سائن کر کے گلزار کے حوالے کر دیئے۔ اس نے ٹریول چیکس دیکھے اور اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ یہ تقریباً 1500 یورو کے تھے۔

"لیکن ہادی صاحب......"

"لیکن کچھ نہیں یار! رکھو انہیں ... ملتے رہو گے تو جیب فل گرم ہو جائے گی تمہاری۔"

گلزار کے چہرے پر تشکر کے جذبات اُبھرے لیکن اس تشکر میں ایک طرح کا کمینہ پن بھی شامل تھا۔ اس نے بس تھوڑا سا تذبذب دکھانے کے بعد چیکس اپنی جیب میں رکھ لیے۔ ان کے درمیان فون نمبرز کا تبادلہ ہو گیا۔ ہادی نے اسے بتایا کہ وہ اس ہوٹل میں مزید آٹھ دس دن قیام کا ارادہ رکھتا ہے۔

بھاری رقم نے گلزار کی بولتی بند کر دی تھی۔ وہ ہادی کی باتوں کے جواب میں بس جی جی کہتا جا رہا تھا۔ ایک مرعوب نظر آ رہا تھا۔ اس ملاقات کا اختتام ہادی کی مرضی کے عین مطابق ہوا۔

○......❖......○

ارم بہت بے چین ہو رہی تھی۔ وعدے کے مطابق آج رات گلزار اسے بہت خاص اطلاع دینے والا تھا۔ اس نے پرسوں بتایا تھا کہ حجاب ہوٹل واسکوڈے میں گئی تھی اور کافی دیر وہاں رہی تھی۔ پھر کل بھی گلزاری کی مختصری کال آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ کارروائی خاصی آگے بڑھی ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے میں تفصیلی اطلاع دے گا۔ اس کی آواز میں دبا دبا جوش تھا۔ وہ بڑا لالچی تھا۔ اگر واقعی کوئی اہم اطلاع تھی تو اس نے اطلاع سے پہلے اپنی فیس وصول کرنا تھی۔ بہر حال کوئی اچھی اطلاع ارم کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہو سکتی تھی۔ شام ہی سے ارم بہت ایکسائیٹڈ تھی وہ پہلے فلور پر جلال کے ساتھ والے کمرے میں شفٹ ہوئی تھی۔ ایسا کر کے اسے گونا گوں اطمینان ہوا تھا۔ اس اطمینان میں کسی حد تک جیت کا احساس بھی شامل تھا۔ اسے پتا تھا کہ حجاب کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا ہوگا تو اس کو شدید کڑھن ہوئی ہوگی۔ یہی کڑھن ارم کے اطمینان کا باعث تھی۔ اب یہ اطمینان ایک پائیدار خوشی میں ڈھل سکتا تھا۔ اگر گلزاری واقعی اچھی خبر سنا دیتا تو۔

گلزار کا فون دس بجے کے لگ بھگ آیا۔ ارم ڈنر سے فارغ ہوئی ہی تھی۔ جلال کو آج کافی دیر سے لوٹنا تھا۔ وہ فون سنتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

"ہیلو سسٹر! کیا حال ہے؟" گلزاری کی آواز سنائی دی۔ ارم کو فوراً محسوس ہوا کہ اس کی آواز میں کوئی خاص ترنگ نہیں ہے۔

"میں ٹھیک ہوں گلزاری! کیا نیوز ہے تمہارے پاس؟ کافی انتظار کے بعد فون آیا ہے تمہارا؟"

"نیوز..... تو کوئی ..... بہت خاص نہیں سسٹر! لیکن جلد ہی کوئی نہ کوئی ملے گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم تو کل بڑے جوش میں تھے۔ کیا پتا چلا حجاب کا؟"

گلزاری نے ایک لمبی سانس لی۔ "وہ میں نے پوری معلومات لے لی ہیں۔ دراصل حجاب صاحب کی ایک پرانی مہمان جو پاکستان چلی گئی تھی سیر سپاٹے کے لیے روم آئی ہوئی ہے۔ ساتھ میں اس کا میاں اور دو بچے بھی ہیں۔ ہوٹل واسکوڈے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ یہ حجاب پرسوں ان سے ہی ملنے گئی تھی۔ کل انہوں نے ٹیکسی پر تھوڑی سی سیر بھی کی ہے۔ میرے خیال میں کل تک وہ لوگ واپس چلے جائیں گے۔"

ارم نے مایوسی سے کہا۔ "یہ کیا بات ہوئی؟ عجیب واہیات ہو تم۔ وہ کیا کہتے ہیں کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ یا پھر تم چالاکی دکھا رہے ہو۔ مجھ سے یورو اینٹھنے کے لیے تم نے خوامخواہ سسپنس کھڑا کیا۔"

"تمہارے سر کی قسم سسٹر! غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ جو کچھ میں نے دیکھا وہی تمہیں بتایا تھا۔ جمعرات کے دن حجاب کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ہوٹل کے کمرے میں رہی۔ اس وقت پتا نہ چلا کہ کمرہ کون سا ہے۔"

"اور تم اتنے بڑے کمینے ہو کہ خبر پوری ہونے سے پہلے ہی آدھے پیسے وصول کر لیے۔ تم کسی کام کے نہیں ہو گلزاری! خوامخواہ میرا وقت برباد کرتے ہو۔ اب دھیان سے سن لو۔ جب تک کوئی کام کی خبر نہ ہو میرے کان مت کھانا۔ کوئی ضرورت نہیں فون کرنے کی۔"

"لیکن سسٹر......"

"بائے بائے۔" ارم نے کہا اور فون بند کر کے بستر پر پھینک دیا۔ یہی وقت تھا جب جلال کی والدہ آپا خانم اندر داخل ہوئیں۔ وہ بڑے ڈیل ڈول کی تھیں ان کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ "خبیث کو اب زبان چلانا بھی آ گئی ہے۔ پتا نہیں کہ بڑوں سے کس طرح بات کرتے ہیں۔ بچ کہیں کی۔"

"کیا ہوا آپا خانم! کس کی بات کر رہی ہیں؟" ارم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"ابھی حجاب کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی کہ یہ کمرہ کیوں لیا ہے ارم نے کیا اتنے بڑے گھر میں کوئی اور کمرہ ہی نہیں تھا۔ مجھے الزام دے رہی تھی کہ میں نے تمہیں یہ کمرہ دیا ہے میں نے بھی کھری کھری سنائی ہیں۔ بد لحاظ کہیں کی شرم نہیں آتی۔"

آپا خانم غصے سے کانپ رہی تھیں۔ ارم نے جلدی سے انہیں پانی پیش کیا۔ "لیں یہ پانی پئیں..... کول ڈاؤن ہو جائیں۔ آپ کا بی پی پہلے ہی اپ سیٹ ہے۔"

آپا خانم نے پانی پیا۔ پھر ذرا ٹھہری ہوئی آواز میں بولیں۔ "میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ وہ باغیچے کی طرف والا کمرہ لے لو۔ بڑا بھی ہے۔ تم بھی اپنی بات پر اڑی رہیں۔"

ارم نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ "آپا خانم! آپ اس طرح کیوں سوچ رہی ہیں۔ آپ مالکن ہیں اس گھر کی۔ آپ کا اختیار ہے۔ اسے شرم آنی چاہیے کہ اتنی سی بات کا جھگڑا بنا رہی ہے۔"

"اس کی جرأت بڑھتی جا رہی ہے۔ ابھی جلال آتا ہے تو بات کرتی ہوں اس سے۔" آپا خانم نے کہا۔

○......❖......○

وہ بڑی چمکیلی صبح تھی۔ چمکیلی اور خوشگوار..... روم اپنی تمام تر شان و شوکت اور تاریخی دبدبے کے ساتھ حدِ نگاہ

تک ہادی کی نگاہوں کے سامنے پھیلا ہوا تھا ہادی ہوٹل کے دسویں فلور کی ایک بالکونی میں کھڑا محوِ نظارہ تھا اور اس کے ساتھ ساتھ حجاب کا انتظار بھی کر رہا تھا۔

ایک جادو سا ہو گیا تھا اس پروینس کی وہ پہلی رات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو چکی تھی۔ وہ نہ چاہنے کے باوجود اس لڑکی کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ ہادی کے لیے صرف دوستانہ جذبات رکھتی ہے۔ اسے یہ بھی خبر تھی کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے سراسر آگ سے کھیلنے کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود وہ خود کو اس بے سمت سفر سے روک نہیں پا رہا تھا۔ بس مسکراہٹ میں لپٹے سفید موتیوں کی بے مثال قطار اس کی آنکھوں میں چمکتی رہتی تھی اور ایک حسین پیشانی جس پر چاند اور سورج اپنا عکس دکھاتے تھے اس نے ایک آہ بھری اور سوچنے لگا۔

کیا واقعی وہ محبت میں گرفتار ہو چکا ہے؟ اس کا جواب اثبات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ غور کرنے لگا۔ محبت بھی کیا چیز ہے۔ اپنے لیے مشکل ترین راستے ڈھونڈتی ہے۔ مستقبل کی مصیبتیں اور ناکامیاں اپنی آنکھوں کے سامنے صاف صاف دیکھتی ہے لیکن پھر بھی انسان کو آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ بے منزل راستے، اونچی دیواریں اور بند گلیاں اسے روک نہیں سکتیں۔ ہادی کو آج تک محبت نہیں ہوئی تھی اور جب ہوئی تھی تو کہاں ہو گئی تھی۔ اسے اس بے ڈھنگے پن پر رونا آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔

ہادی عام شاعروں کی طرح نرا پرا شاعر ہی نہیں تھا۔ وہ ایک مضبوط شخص تھا۔ دنیا میں رہتا تھا اور اس کی مشکلات سے عہدہ برا ہونا جانتا تھا۔ کل شام اس نے بڑی ہمت سے حجاب کے راستے کا ایک کانٹا صاف کر دیا تھا۔ اس کانٹے کا نام گلزار تھا۔ وہ مزید کانٹے صاف کرنے کا حوصلہ بھی رکھتا تھا۔ لیکن یہ پتا بھی تو چلتا کہ مستقبل میں حجاب کے ارادے کیا تھے۔ وہ اس معاملے کو کہاں تک لے جانا چاہتی تھی۔ یا کہاں تک لے جا سکتی تھی۔

ہادی صاف محسوس کر رہا تھا کہ وہ اپنے طور پر جو کچھ سوچ رہا ہے اور کر رہا ہے وہ غلط ہے۔ وہ میاں بیوی کے درمیان پیدا ہونے والے ایک تنازعے سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے ماحول کی شدید گھٹن کے نتیجے میں ایک لڑکی کے اندر مزاحمت کی ایک چنگاری پیدا ہوئی تھی۔ ہادی اس چنگاری کی روشنی میں اپنا راستہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ کیا ایسا کرنا مناسب تھا یا پھر ہادی کو کچھ اور کرنا چاہیے تھا۔ حجاب کو سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی کہ وہ اس چنگاری کو شعلہ نہ بننے دے۔ اپنے حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرے۔

وہ سگریٹ پھونکتا رہا اور نیچے ہوٹل کے پارکنگ لاٹ کی طرف دیکھتا رہا جہاں کے دائیں کنارے سے حجاب کو نمودار ہونا تھا۔ وہ وقت کی پابند تھی۔ آج بھی اس نے یہی ثابت کیا۔ ہادی کے سینے میں خوشگوار دھڑکنیں جاگ اُٹھیں۔ وہ آ رہی تھی۔ دلکش چال، متوازن قدم جیسے کسی ساحل کی ہوا بڑے ہموار طریقے سے بہہ رہی ہو۔ وہ پہلے کی طرح براؤن چادر میں لپٹی لپٹائی ہوئی تھی۔ نقاب میں سے صرف اس کی آنکھیں ہی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ اس چادر میں خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ اس کے گرد سازش کا ایک جال موجود ہے۔

ہادی پہلے سے تیار تھا۔ وہ لفٹ سے نیچے آیا۔ دونوں لابی میں ملے اور پھر مین روڈ کی طرف بڑھ گئے۔ "بس

آج آخری دن ہے۔" وہ بولی۔ "جی بھر کر گھوم پھر لیجیے۔"

"آپ شروع میں ہی مزہ کرکرا کر رہی ہیں۔ کچھ اچھی اچھی باتیں بولیے۔" ہادی نے کہا۔

"یہ اچھی بات ہی تو ہے کہ ہم آج سارا دن ساتھ رہیں گے۔"

"لیکن آپ یہ بھی تو کہہ رہی ہیں کہ پھر نہیں آئیں گی۔"

"آپ گلاس کو آدھا خالی کیوں کہہ رہے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہہ رہے کہ آدھا بھرا ہوا ہے۔"

"لیکن میں اس کو پورا بھرا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں اپنی اس گائیڈ کو کسی مصیبت میں نہ پھنسا دیجیے گا۔"

"فکر نہ کریں ایسا کچھ نہیں ہوگا اور آپ گائیڈ نہیں ہیں۔ ہمراہی ہیں۔ بہت ہمدرد اور مہربان ہمراہی۔ میں آپ کو تادیر بھول نہیں پاؤں گا۔"

"میں بھی آپ کو یاد رکھوں گی۔ آپ کے ساتھ کچھ بہت اچھا وقت گزرا ہے۔"

"گزرا نہیں ہے..... گزر رہا ہے۔ آپ الفاظ کے ہیر پھیر سے مجھے یہ نہ سمجھائیں کہ آج آخری ملاقات ہے۔

[illegible] نہیں۔"

وہ ہنسنے لگی۔ وہ میٹرو ٹرین میں بیٹھے۔ ہادی کی نگاہیں بار بار اطراف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آج پھر کوئی ان کے پیچھے تو نہیں ہے۔ دونوں عظیم الشان تاریخی ورثے کولیسیئم کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ آثار قدیمہ میں حجاب کو گہری دلچسپی تھی۔ وہ جیسے ان میں کھو سی جاتی تھی۔ یہ بھی ان کے اندر کی لطیف شخصیت اور اس کے بچپن میں چھپی رومانیت کی طرف اشارہ تھا۔ وہ ہجوم میں چلتے کولیسیئم کے ٹکٹ گھر کی طرف بڑھے۔ حجاب کے ساتھ ہجوم میں چلنا ہادی کو اچھا لگتا تھا۔ گاہے بگاہے اس کا شانہ حجاب کے شانے سے ٹکرا جاتا تھا، یا پھر اسے حجاب کا بازو تھامنے کا موقع مل جاتا تھا۔ یہ مختصر سے لمس اس کے جسم میں ایک ایسی سنسناہٹ جگاتے تھے جسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا تھا۔

کولیسیئم سے باہر مقامی آرٹسٹوں نے زمانہ قدیم کے لشکریوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ انہوں نے آہنی خود اور زرہ بکتر وغیرہ پہن رکھی تھی۔ ہاتھوں میں نیزے، ڈھالیں اور تلواریں تھیں۔ سیاح ان قدیم جنگجوؤں کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے۔ اس اسٹیڈیم نما جنگی اکھاڑے کو دنیا کے سات عجوبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی بیرونی دیوار کا کچھ حصہ گزرتی صدیوں کے بوجھ سے منہدم ہو چکا تھا لیکن جو باقی تھا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ یقیناً حجاب پہلے بھی کئی بار یہاں آ چکی ہوگی لیکن وہ اتنی ہی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جتنی دلچسپی سے ہادی۔ اس کے پاس ایک سیاہ ڈائری بھی تھی جس میں کبھی کبھار وہ کوئی نوٹ لے لیتی تھی۔ اس بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ مقامی آثار قدیمہ کے بارے میں ایک آرٹیکل لکھ رہی ہے اور شوقیہ قلم کار کی حیثیت سے ایک اخبار میں چھپوانا چاہتی ہے۔

ٹکٹ خریدنے کے بعد وہ ایک طویل سرنگ نما راستے سے گزرتے ہوئے کولیسیئم کے اندر داخل ہو گئے۔ ایک دور ہادی کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گیا۔ گلیڈی ایٹرز تلواریں اور نیزے سونت کر ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے۔

ان کے جسموں سے خون کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ ہر دو گلیڈی ایٹرز کو ایک دوسرے سے لڑنا تھا یہاں تک کہ ایک ان میں سے مر جاتا۔ سینکڑوں تماشائی زندگی اور موت کی اس لڑائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اپنے شفقت آسمان سر پر اٹھا رہے تھے اور یہ بھوکے شیروں کے مناظر تھے، جو بدقسمت غلاموں اور قیدیوں پر جھپٹ رہے تھے انہیں چیر پھاڑ رہے تھے۔ اور ان ہی جیسے انسان ٹھاٹ سے کرسیوں پر بیٹھے یہ درندگی ملاحظہ کر رہے تھے۔ شہزادے شہزادیاں، حسینائیں، رنگ برنگے لباس، شراب کے جام، نقاروں کی دھما دھم، مختلف درندوں کی چنگھاڑیں اور ان کے درمیان بے بسی سے سسکتی دم توڑتی انسانیت، یہ تھا روم کا مشہور زمانہ جنگی اکھاڑا اور زندگی موت کے کھیل کی تماش گاہ۔

"آپ کا کیا خیال ہے ہادی! ایسا کیوں ہوتا ہے۔ انسان ظلم کیوں کرتا ہے؟"

"اس لیے حب! کہ کوئی دوسرا انسان ظلم سہتا ہے۔"

ہادی نے پہلی بار اسے اس کے مختصر نام سے پکارا تھا وہ ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی لیکن منہ سے بولی کچھ نہیں۔ ہادی نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مظلوم کبھی بھی ٹھنڈے پیٹوں ظلم برداشت نہیں کرتا، ظالم سے ٹکرانے کے لیے کچھ وقت چاہتا ہے، کچھ مہلت مانگتا ہے مگر یہ مہلت اتنی طویل ہو جاتی ہے کہ ظلم سہنا مظلوم کی عادت بن جاتا ہے۔"

"اور یہ بھی تو ہوتا ہے ہادی! کہ ظالم اپنے ظلم کی کڑوی گولی کو مختلف طرح کی شکر میں لپیٹ دیتا ہے۔ کبھی اس پر رسم و رواج کی شکر چڑھاتا ہے، کبھی مذہب کی اور کبھی معاشرے کی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔ اس دن ہم یہی بات کر رہے تھے نا۔ اب دوسری یا تیسری شادی کی بات ہی کر لیجیے ننانوے کیسوں میں تو مرد کو نئی عورت کی خواہش ہی ہوتی ہے نا تو کبھی پہلی عورت کی بے اولادی کا بہانہ بنایا جاتا ہے کبھی اس کی بیماری یا کم صورتی کا۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ وہ دقیانوسی ہے اور زندگی میں اس کے قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی وغیرہ وغیرہ۔"

ہادی نے ایک گہری سانس لی اور ہلکے پھلکے انداز میں بولا۔ "جلال صاحب سے کوئی جھگڑا وغیرہ تو نہیں چل رہا آپ کا۔ میرا مطلب ہے کہ آج کل ہم مردوں کے خلاف بہت بول رہی ہیں۔"

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "میاں بیوی میں معمولی اونچ نیچ تو ہوتی رہتی ہے۔"

ہادی نے موضوع بدلا۔ "یہ ارم صاحبہ آپ کی دیورانی فوزیہ کی چھوٹی بہن ہے نا۔"

"ہاں......" حجاب ذرا چونک کر بولی۔

"میں گھر میں ایک دو بار ملا ہوں اس سے۔ کافی ہوشیار لڑکی ہے۔ اپنی بڑی بہن سے بالکل مختلف۔ یہ آپ کے ذاتی معاملات ہیں۔ ایک بات کہوں اگر برا نہ مانیں تو۔"

"جی کہیے۔"

"اس لڑکی کی طرف سے بہت چوکس رہیے۔ اس کی آنکھوں میں بالکل اور طرح کا رنگ نظر آتا ہے۔"

"کیوں؟ کوئی خاص بات دیکھی آپ نے؟"

"نہیں حب! مگر یوں لگتا ہے کہ وہ لڑکی کچھ نہ کچھ خاص کرنے کی تاک میں رہتی ہے۔ میں نے ایک دو بار اسے جلال سے بات کرتے دیکھا ہے۔ ان سے بات کرتے ہوئے اس کی آواز میں عجیب سی لگاوٹ آ جاتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی نوٹ کیا؟"

حجاب ذرا توقف سے بولی۔ "نہیں.... میرے خیال میں بے تکلفی سے بات کرنا اس کی عادت ہے۔ وہ اپنے چچا ظہیر بھائی سے بھی ایسے ہی بات کرتی ہے۔ اکثر دیکھنے والوں کو غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ خیر چھوڑیے اس موضوع کو۔ اب بتائیے کیا پروگرام ہے؟"

"نہیں کھانا شانا کھاتے ہیں۔" ہادی نے کہا۔

"تو چلیے۔" وہ بولی۔ وہ دونوں سیڑھیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ باتیں کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف چل دیے۔ تاہم ہادی نے محسوس کیا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے حجاب کو جو محسوس کرانے کی کوشش کی ہے وہ اس نے محسوس کیا ہے۔

وہ باہر نکلے۔ یہاں چہل پہل تھی۔ ایک طرف ایک آرٹسٹ دیوار پر "گرافٹی" کر رہا تھا۔ وہ ایک بہت بڑی پورٹریٹ بنانے میں مصروف تھا۔ کسی لڑکی کی تصویر تھی۔ دیواروں پر ایسی مصوری اور خطاطی یہاں کا رواج تھا۔ ہادی نے کہا۔ "دیکھیں حب ایسی ہی ایک پورٹریٹ آپ کے گھر میں بھی لگی ہوئی ہے نا؟"

حجاب کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ جیسے ایک سایہ سا۔ اس نے پہلی دفعہ بھی جب پورٹریٹ کا ذکر کیا تھا حجاب کے چہرے پر ایسا ہی تاثر آیا تھا۔ اس تاثر میں گہرا اندوہ تھا۔ جیسے کسی نے بے دھیانی میں اچانک کسی زخم کو چھو دیا ہو۔ وہ بس ایک "ہوں" کر کے خاموش ہو گئی۔ ہادی کو افسوس ہوا کہ اس نے خوامخواہ پورٹریٹ کی بات کر دی تھی۔

حجاب کا موڈ بحال کرنے میں ہادی کو کم و بیش آدھ گھنٹہ لگ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ پاکستان کی باتوں میں دلچسپی لیتی ہے۔ اس کا موڈ بہتر کرنے کے لیے اس نے پیارے پاکستان کا سہارا ہی لیا۔ پاکستان کے گلی کوچوں کی باتیں، موسموں کی باتیں، تہواروں اور میلوں ٹھیلوں کی باتیں۔ نقاب سے اوپر اس کی آنکھوں میں پھر ایک خوشنما خوشی چمکنے لگی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ پیدل ہی چل دیے۔ اب تک ہادی کو یقین ہو چکا تھا کہ کوئی ان کے پیچھے نہیں ہے۔ دوسری طرف حجاب کے رویے سے بھی ظاہر تھا کہ اندرون خانہ کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ مطلب یہ تھا کہ گلزار کل ہونے والی ڈیل پر عمل کر رہا ہے۔

وہ ایک آبی گزرگاہ کے کنارے ایک شاندار گرائیلا ان میں جا بیٹھے۔ یہاں ہوا چل رہی تھی اور سہ پہر کا سورج اپنی سنہری کرنیں بکھیر رہا تھا۔ حجاب کی چادر کے نقاب میں سے اس کے شہد رنگ بالوں کی ایک لٹ باہر نکل آئی تھی اور وہ اسے بار بار اندر گھسانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ دو سرخ و سپید پھولوں کی طرح تھے۔ وہ سوچنے لگا،

محبت کیوں وہیں پر ہوتی ہے جہاں اسے نہیں ہونا چاہیے۔ ان لمحوں میں اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس کی اس گواہی میں سورج کی سنہری کرنیں، ٹھنڈی ہوا، آبی گزرگاہ اور نیلا آسمان بھی شامل تھا۔ وہ سوچنے لگا اگر ان لمحوں میں اس وقت وہ حجاب پر آشکار کردے کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ وہ شاید ایک بار پھر وہی تیز دھار، زہریلا فقرہ کہے کہ "آپ سب مرد بس ایک ہی جیسے ہوتے ہیں، عورت کو بس ایک ہی زاویے سے دیکھتے ہیں" اور اٹھ کر روم کی گلیوں میں کہیں گم ہو جائے اور وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

عین ان لمحوں میں لکڑی کے اس بنچ پر بیٹھے بیٹھے حجاب بھی کچھ سوچ رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں اسے ہادی کے پاس راحت سی ملتی تھی۔ جیسے کوئی بہت اپنا اس کے ساتھ ہو۔ اس کے دکھ درد میں شریک ہو۔ حجاب کے ذہن میں ایک شاعر کا تصور ایک دبلے پتلے شخص کا تھا۔ بکھرے بال، ہونٹوں پر پان کا رنگ، آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک، لیکن ہادی تو یکسر مختلف تھا۔ دراز قد، روشن آنکھیں، کشادہ سینہ، وہ ہر اعتبار سے ایک ذہین اور مضبوط شخص نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے پھرتے حجاب کو کبھی بھی عدم تحفظ کا احساس نہیں ہوا۔ وہ کچھ دن پہلے وینس میں جس طرح اچانک ہادی کو حیران و پریشان چھوڑ کر روم چلی آئی تھی اس پر وہ قلق محسوس کرتی تھی۔ اس کے بعد فون پر اس نے ہادی سے بدتہذیبی کی تھی اس کا بھی اسے افسوس تھا۔ اب وہ اس کا مداوا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب وہ ایسا کرتی تھی تو اس کے اندر کی وہ شدید گھٹن بھی کم ہوتی تھی جس کا تعلق اس کے گھریلو حالات سے تھا۔

ہادی محویت سے اخبار دیکھ رہا تھا۔ ایک ادبی صفحہ پڑھنے میں مشغول تھا۔ فیض احمد فیض کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون چھپا تھا۔ مضمون پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ کن انکھیوں سے حجاب کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے جیسے اپنے خیالوں میں گم ہو گئی تھی۔ نقاب تھوڑا سا نیچے سرکا ہوا تھا۔ ناک کی دائیں جانب ننھا سا تل بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ جب بات کرتے ہوئے کبھی کبھی اپنا نچلا ہونٹ نرمی سے دانتوں میں دباتی تھی تو ایک نہایت دلکش ادا بن جاتی تھی۔ ہادی کو یاد آیا جب وینس میں وہ دونوں کیمپ سے پانچ نمبر بس پر شہر کی طرف آ رہے تھے بس کی لیڈی ڈرائیور کو اچانک بریک لگانا پڑے تھے۔ اس واقعے کی مہربانی سے حجاب پوری کی پوری اس کے ساتھ پیوست ہو گئی تھی۔ جیسے کوئی کمزرے کمزرے شدت سے بغلگیر ہو جائے۔ وہ دل فزا و جان لیوا لمس ہادی آج تک بھول نہیں پایا تھا۔ اس حسین ٹکراؤ کے بعد بھی حجاب نے خفت کے عالم میں اسی طرح ہولے سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تھا۔ وہ منظر ناقابل فراموش تھا۔

ہادی نے انگلش اخبار ایک طرف رکھا اور اپنے قدرے لمبے بالوں کو پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولا۔ "ایک بات میرے ذہن میں کھٹکتی رہتی ہے حب! مجھیں ایک سوال ہے۔ کیا آپ جواب دینا پسند کریں گی۔"

"جی کہیں۔"

"جب آپ علیزا تھیں اور وینس میں مجھ سے ملی تھیں تو وہ ایک بڑا مختلف روپ تھا۔ اس کی سمجھ مجھے آج تک نہیں آئی۔"

"خود مجھے بھی نہیں آئی۔"

"مذاق نہیں حب! پلیز بتائیں مجھے کیا آپ کو اس وقت ڈر نہیں لگا تھا کہ آپ کو اس حال میں کسی نے دیکھ لیا تو پھر؟"

"ڈر تو تھا مگر ......" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی پھر ذرا توقف سے بولی۔ "ہادی آپ جانتے ہی ہوں گے۔ اصل میں ہمارے کچھ معاملات کی جڑیں ہمارے ماضی میں ہوتی ہیں۔ بچپن میں جب میں بہت ڈپریس ہوتی تھی، بہت زیادہ تو میں ایک مزیدار کام کرتی تھی فیصل کی نیکر اور شرٹ وغیرہ پہن لیتی تھی اور گھر کے لان میں خوب ادھم مچاتی تھی۔ فیصل مجھ سے ڈیڑھ سال چھوٹا ہے مگر اس کے کپڑے مجھے پورے آ جاتے تھے۔ ہم دونوں لان میں لڑتے بھی، کشتیاں کرتے تھے۔ سائیکل چلاتے اور پتا نہیں کیا کیا۔ دو چار گھنٹوں میں، میں نارمل محسوس کرنے لگتی تھی۔ گیارہ بارہ سال کی عمر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ امی ابو کو بھی پتا تھا کہ میں شدید ڈپریشن سے نکلنے کے لیے ایسا کرتی ہوں اور ایسا بہت سے لوگوں میں ہوتا ہے ہادی! سخت پریشانی یا مایوسی کے وقتوں میں وہ مختلف طریقوں سے اپنا ری ایکشن دیتے ہیں۔ کوئی بہت زیادہ کھانا پینا شروع کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ لڑتے جھگڑتے ہیں یا برتن توڑتے ہیں، اور کچھ لوگ اندھا دھند شاپنگ کرتے ہیں۔ یہ سب ڈپریشن سے نکلنے کے راستے ہی ہوتے ہیں۔"

"یعنی آپ گیارہ بارہ سال کی عمر تک اسی طرح کپڑے بدل کر اور بھاگ دوڑ کر اپنی ڈپریشن دور کرتی رہیں۔ لیکن پھر ظاہر ہے کہ آپ بڑی ہو گئیں اور یہ ڈپریشن بھگاؤ سلسلہ ختم ہو گیا۔"

"ہاں ...... کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد کبھی نہیں ہوا۔ آخری بار بس وہاں وینس میں تھا اور شاید یہ بالکل آخری تھا اس کے بعد پھر کبھی نہیں ہوگا۔" وہ مسکرائی۔

"اس کا مطلب ہے کہ ان دنوں آپ شدید ڈپریشن کا شکار تھیں۔ مایوسی کا کوئی زبردست دورہ تھا۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔ بس ایک گھریلو معاملہ تھا۔" اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اس کی زندگی کی بدترین گھڑیاں تھیں۔ ایک بار تو اس کے جی میں آئی تھی کہ وہ خود کو ختم ہی کر لے۔ اسے ارم اور جلال کے رومانی تعلق کا پتا چلا تو لگتا تھا کہ وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔ اور جب واقعی اس کی کیفیت مرنے والی ہو گئی تھی تو وہ ساری مصلحتیں ایک طرف رکھ کر باہر نکلی تھی اور اس نے ایک دو دن کے لیے خود کو وینس کی گہما گہمیوں میں غرق کر دیا تھا۔

ہادی نے اس کے تاثرات دیکھ لیے تھے اور سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنے ذاتی معاملات میں مزید مداخلت نہیں چاہتی۔ لہٰذا اس نے بھی اسے مزید نہیں کریدا۔

حجاب بھی اب موضوع بدلنے کے لیے موسم کی صورت حال پر تبصرہ ڈال رہی تھی۔ سورج کی کرنوں میں تمازت تھی لیکن ہوا کے جھونکے اسے یوں زائل کر رہے تھے جیسے کاغذ پر پنسل کی مدھم سی لکیر کو ربڑ صاف کر دیتا ہے۔ اسی دوران میں اچانک حجاب کے فون کی بیل ہوئی۔ اس نے سکرین پر نگاہ ڈالی اور چونک گئی۔ یہ جلال کا نمبر تھا۔ وہ اپنے ساتھ سیل فون نہیں رکھتی تھی۔ مگر جب میکے میں ہوتی تھی تو کبھی کبھی جلال کی اجازت سے رکھ بھی لیتی تھی۔ وہ

فون منتی ہوئی ذرا آگے چلی گئی۔

"ہیلو۔" جلال کی بھاری بھر کم آواز حجاب کے کانوں میں پڑی اور وہ کپکپا سی گئی۔

"جی میں بول رہی ہوں۔" اس نے کہا۔

"کہاں پر ہو؟"

"یہاں ذرا بازار آئی ہوئی تھی۔ تھوڑی سی شاپنگ کے لیے۔"

"ساتھ کون ہے؟"

"کک..... کوئی نہیں۔ امی نے آنا تھا مگر ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ فیصل بھی آفس گیا ہوا ہے۔"

"تو شام کو آ جاتیں۔" ناگواری سے کہا گیا۔

"امی کی ایک دو دوائیں بھی لینا تھیں۔"

"اچھا..... یہ کل تم نے کیا بات کی ہے امی سے وہ سخت ناراض ہو گئی ہیں۔" جلال کی آواز میں

"مم..... میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کی جلال۔"

"تو تمہارے فرشتوں نے کی ہے؟"

"میں نے تو بس کمرے کی تھوڑی سی بات کی تھی۔ اتنا کہا تھا کہ وہ کمرہ ارم کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ بلکہ اسے تو ہی نہیں چاہیے تھا کہ اس کمرے میں آتی۔ اسے پتا بھی ہے کہ پچھلی دفعہ ہم کو یہ اچھا نہیں لگا تھا۔"

"لیکن امی کا اس میں کیا قصور ہے۔ تم نے ان کو کیوں الزام دیا؟"

"جلال! آپ جانتے ہیں امی کی مرضی کے بغیر وہ اوپر نہیں آ سکتی تھی۔ امی کو بھی سب پتا تھا۔"

"اچھا..... وہ آ ہی گئی ہے تو ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے تم پر۔" جلال گرجا۔

ایسے موقعوں پر حجاب سہم جایا کرتی تھی۔ منمنانے لگتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں جب بات ارم کی ہوتی تھی یا اس کی کسی پیش قدمی کی ہوتی تھی تو حجاب کے اندر ایک عجیب سی جرأت آ جاتی تھی۔ ایک دو بار وہ خود بھی ششدر رہ گئی تھی۔ کوئی نامعلوم سی توانائی تھی جو اس کے اندر بھر جاتی تھی۔ ایک ایسی توانائی جس کا کبھی اس نے سوچا بھی نہ تھا۔ خاص طور سے جلال کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ "جلال! آپ کو پتا ہے کہ اس کا یوں ہمارے قریب رہنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ پلیز جلال! پلیز ایسا مت کریں۔ اسے مجھ پر مسلط نہ کریں۔"

"مسلط..... کون مسلط کر رہا ہے۔ کون کر رہا ہے؟ تم خود اپنے اوپر مسلط کر رہی ہو چیزوں کو۔ تمہارے دماغ ٹھکانے نہیں ہیں اور زبان بھی لگ گئی ہے تمہیں۔ بدتمیزی کی ہے تم نے امی جان سے۔ تمہیں ان سے معافی مانگنا پڑے گی۔ ورنہ پھر یہ بات بگڑ جائے گی۔ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہو گا۔"

باتیں کرتے کرتے حجاب ایک درخت کی اوٹ میں چلی گئی تھی تاکہ ہادی اس کی آواز اور تاثرات سے بے خبر رہے۔ جلال کے طیش کے سامنے وہ تھر تھر کانپنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے بولنا چاہا مگر اس کا گلا خشک ہو گیا۔

پھنکارا۔ "میری بات سنی ہے تم نے۔ آج ہی گھر واپس آؤ اور معافی مانگو امی سے۔ آج ہی۔"

وہ تھوک نگل کر بولی۔ "میں آ جاتی ہوں جلال اور آپ کہتے ہیں تو معافی بھی مانگ لیتی ہوں لیکن پلیز ارم کے سامنے اس طرح میری توہین نہ کریں۔ اسے کہیں کہ وہ نیچے والے کمرے میں واپس چلی جائے۔"

ایک مختصر وقفے کے بعد جلال گمبھیر آواز میں بولا۔ "تو تم آنے کے لیے یہ شرط رکھ رہی ہو؟"

"نہیں جلال! ایسی بات نہیں لیکن....."

"لیکن کیا؟"

"وہ جب تک وہاں ہو گی۔ مجھ سے نہیں آیا جائے گا۔" پتا نہیں وہ آخری الفاظ کیسے کہہ گئی۔ یہ وہی جرأت تھی جو اس کے اندر بھڑکنے والی چنگاری نے اسے دی تھی۔ ورنہ وہ تو جلال کے سامنے ایسی بات کہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"تو یہ شرط ہے تمہاری؟" وہ ذرا سنبھلے ہوئے انداز میں بولا۔

"شرط نہیں ہے۔ منت کر رہی ہوں جلال! پلیز....."

دوسری طرف چند سیکنڈ کے لیے خاموشی طاری ہو گئی۔ حجاب کو لگا کہ شاید وہ فون بند کر دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس بار وہ بولا تو اس کی آواز میں طیش کا ہیجان نہیں تھا۔ "اچھا میں دیکھتا ہوں اس معاملے کو تو تم کب آ رہی ہو؟"

"اگر آپ اجازت دیں تو صبح آ جاؤں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ گاڑی بھیج دوں گا یا فیصل کے ساتھ آ جاؤ گی؟"

"گاڑی بھیج دیجیے گا۔"

آخری کلمات کے بعد یہ بات چیت ختم ہو گئی۔ تقریباً تین سال میں یہ پہلا موقع تھا جب اس طرح وہ کسی بات پر اڑی اور اس کی بات جلال نے مانی بھی تھی ورنہ تو اس سے بہت پہلے ہی ڈانٹ ڈپٹ اور سرخ انگارہ آنکھوں تک نوبت آ جاتی تھی۔

O.....❖.....O

اگلے روز دوپہر تک وہ واپس اپنے سسرال پہنچ چکی تھی۔ اس کا دل ابھی امی ابو کے پاس رہنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر جلال کا شاہی حکم تھا اور ایسے احکامات سے سرتابی کی جرأت وہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لیے یہی بڑی بات تھی کہ جلال نے اس کی بات مان لی تھی اور ارم کو کمرہ ڈیکوریٹ کرانے کے بہانے واپس نیچے بھیج دیا تھا۔ آج صبح حجاب نے خود جلال کو فون کر کے معلوم کر لیا تھا کہ ارم واپس نیچے جا چکی ہے۔ اس کے بعد ہی اس نے آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جلال کو آج ذرا دیر سے جانا تھا۔ وہ ابھی گھر میں ہی تھا۔ وہ نارمل طریقے سے حجاب سے ملا۔ اس کا حال احوال پوچھا اور دوا کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ باقاعدگی سے کھا رہی ہے یا نہیں۔ جلال کا موڈ قدرے بہتر لگتا تھا اور یہ بہتری دیکھ کر حجاب نے اطمینان کی سانس لی۔

"کتنے بجے آئیں گے؟"

"دس تو بج ہی جائیں گے۔ شاید زیادہ دیر ہو جائے۔ تم کھانا کھا لینا۔"

"نہیں اکٹھے ہی کھائیں گے۔" حجاب نے کہا۔

"او کے... میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔" جلال کے لہجے میں مفاہمت تھی۔

جلال کو آج چونکہ دیر سے جانا تھا اس لیے ارم خود ہی یونیورسٹی چلی گئی تھی۔ ارم کی بڑی بہن یعنی حجاب کی دیورانی فوزیہ میکے گئی ہوئی تھی۔ جلال کے جانے کے بعد آپا خانم گھر میں اکیلی تھیں۔ حجاب نے سب سے پہلے معافی والا کام کیا۔ وہ آپا خانم کے پاس پہنچی جو بستر پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ پاؤں کمبل میں تھے۔ حجاب ان کے پاؤں دبانے لگی۔ وہ بدستور ٹی وی دیکھتی رہیں۔ اگر وہ بہت زیادہ ناراض ہوتیں تو اپنے پاؤں کھینچ لیتیں۔ یا کوئی سخت بات کہتیں۔ اس کا مطلب تھا کہ معافی تلافی کی گنجائش موجود ہے۔ حجاب نے وہی کیا جو جلال نے کہا تھا۔ ان سے معافی مانگ لی۔ ان کا تنا ہوا چہرہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ بولیں "گھر کا نظام اور بڑوں کا احترام ساتھ چلتے ہیں ورنہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ تم اب آگے سے جواب دینے لگی ہو۔ اس عادت کو کنٹرول کرو۔ ورنہ مسائل بڑھ جائیں گے تمہارے لیے۔ تمہیں پتا ہی ہے بحث کرنے والے پر جلال کو کتنی جلدی غصہ آ جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے امی! میں آئندہ احتیاط کروں گی۔" وہ پاؤں دباتے ہوئے بولی پر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی نگاہ اس کمرے پر پڑی جہاں ارم نے قبضہ کیا تھا۔ اسے خالی دیکھ کر حجاب کو اپنی کامیابی اور جیت کا احساس ہوا۔ آخر کچھ نہ کچھ تو اہمیت تھی اس کی اس گھر میں۔ سہ پہر کو جلال کا فون آیا کہ میٹنگ کینسل ہو گئی ہے وہ نو بجے تک آ جائے گا اور اگر اس کا موڈ ہو تو وہ باہر کھانا کھا لیں گے۔

حجاب کیسے انکار کر سکتی تھی۔ شام کو وہ تیار ہو گئی۔ اس نے جلال کے پسندیدہ رنگوں والا سوٹ پہنا۔ سرخ اور سیاہ کا کمبی نیشن ہلکے سے میک اپ نے اسے ایک دم نکھار دیا۔ پچھلی سالگرہ پر اس کی امی نے اپنے ذاتی جیب خرچ میں سے اسے بندے بنوا کر دیے تھے۔ وہ اس نے پہن لیے۔ بیماری کے بعد یہ پہلی شام تھی جب وہ اس طرح تیار ہوئی تھی۔ ارم یونیورسٹی سے واپس آ چکی تھی مگر حجاب کو نظر نہیں آئی۔ شاید اپنے کمرے میں تھی۔

جلال آ کر فریش ہوا۔ گرے کوٹ پہنا جو وہ ہمیشہ کریم کلر شلوار قمیص کے ساتھ پہنتا تھا۔ وہ شاندار "نمبر" ڈنر پر نکل گئے۔ موسم اچھا تھا۔ کھانا بھی مزیدار تھا۔ وہ رات بارہ بجے کے قریب واپس آئے۔ وہ میاں بیوی کبھی کبھار باہر نکلتے تھے لیکن جب بھی نکلتے تھے حجاب، آپا خانم کے لیے کچھ نہ کچھ لانا نہیں بھولتی تھی۔ اب بھی وہ آتے آتے ان کے لیے شاپنگ سینٹر سے سردیوں کا سوٹ خرید لائی۔

جب وہ بیڈ روم میں پہنچے تو جلال کا موڈ کچھ عجیب تھا۔ جیسے وہ حجاب سے کوئی خاص بات کہنا چاہ رہا ہو۔ وہ گاؤن پہن کر اور بالوں کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں باندھ کر بستر تک آئی تو وہ بستر کے بجائے صوفے پر بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے۔ آج سونے کا پروگرام نہیں۔" وہ مسکرائی اور اس کی حسین پیشانی دمک اٹھی۔

"ہاں بیٹھ جاؤ تھوڑی دیر۔" جلال نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

حجاب بیٹھ گئی۔ اس کا دل یکبارگی تیز دھڑکنے لگا تھا۔ جلال کچھ دیر تک الفاظ کا انتخاب کرتا رہا۔ پھر دھیمی لیکن گمبھیر آواز میں بولا۔ "حب! بے شک ہم لڑتے جھگڑتے بھی ہیں۔ کبھی کبھی مجھ سے کچھ زیادتی بھی ہو جاتی ہے لیکن میری اور تمہاری محبت ایسی ہے جس میں کوئی فرق آ ہی نہیں سکتا۔ نہ اب نہ آئندہ کبھی۔ میرے دل میں تمہارا جو مقام ہے وہ صرف تمہارا ہی ہے۔"

"ہم... مجھے پتا ہے جلال! لیکن آپ کوئی بات کہنا چاہ رہے ہیں؟"

"ہاں حب!" وہ عجیب ٹھہراؤ کے ساتھ بولا۔ "میں...... ارم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ جیسے سن ہو گئی۔ کتنی ہی دیر کھلی کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ پھر آواز بمشکل اس کے گلے سے نکل سکی۔

"میں... کبھی...... نہیں جلال۔"

اس نے اپنا بھاری ہاتھ حجاب کے کومل ہاتھ پر رکھ دیا۔ "حب! مجھے یقین ہے میں تم دونوں کو بڑے اچھے طریقے سے رکھ سکتا ہوں۔ ہم تینوں خوش رہیں گے۔ اگر تم چاہو گی تو میں دونوں کو علیحدہ گھر لے دوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں کسی طرح کی بے انصافی نہیں ہونے دوں گا۔ دیکھو حب! میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں۔ جن کی زندگی میں ہر روز عورتیں آتی ہیں لیکن بیوی بے چاری بے خبر رہتی ہے اگر میری زندگی میں کوئی آیا ہے تو میں نے پوری صاف دلی کے ساتھ تمہیں بتا دیا ہے اور اب تم سے بھی امید رکھتا ہوں کہ تم حوصلے اور معاملہ فہمی کا ثبوت دو گی۔"

ایک مفلوج کر دینے والے وقفے کے بعد اب حجاب کے جسم میں زندگی لوٹنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ جلال کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچ لیا۔ اس طرح کے کوئی اور ظالم لمحے ہوتے تو حجاب جلال کے سامنے سراپا عجز و انکسار بن جاتی۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی، اپنے آنسوؤں سے اس کے پاؤں تر کر دیتی۔ کسی بھی طرح سے اسے سمجھانے اور سنبھالنے کی کوشش کرتی لیکن یہ اور معاملہ تھا۔ یہ اور کہانی تھی۔ یہاں حجاب نہیں، حجاب کے اندر کی عورت زد پر تھی۔ یہاں حجاب کی پامالی کا نہیں اس احساس کی پامالی کا مسئلہ تھا جو عورت کو کسی کی بیوی اور شریک حیات ہونے کا فخر عطا کرتا ہے۔ آج یہ فخر اور احساس اس سے چھن رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک آنگن بھی خود سے دور جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس لیے آج وہ حجاب نہیں رہی تھی۔ ایک دلیر عورت بن گئی تھی۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ "میرا گناہ مجھے بتا دیجیے جلال! آپ کی خدمت اور اطاعت میں مجھ سے کہاں کمی ہوئی ہے۔ یا میرے اندر کوئی کمی ہے تو بتا دیجیے۔ مجھے آپ کی بات سمجھنے میں مدد تو ملے۔"

"یہ تمہاری کمی کی بات نہیں حب! اگر کوئی کمی ہے تو پھر مجھ میں ہے۔ یہ سلسلہ کافی دیر سے موجود تھا حب اور کسی حد تک تم بھی جانتی ہو۔ اگر میں چاہتا تو خاموشی سے بھی یہ شادی کر سکتا تھا۔ ارم کو ڈیفنس یا میلانو میں کوئی گھر لے دیتا۔ تم لوگوں کو برسوں تک اس کی خبر نہ ہوتی اور شاید کبھی بھی نہ ہوتی۔ لیکن میں نے تمہیں کہا ہے نا میں دوغلا نہیں ہوں اور میں تمہیں یہ بھی بتا رہا ہوں حب! میں بے انصافی نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔"

وہ کھڑی ہو گئی۔ "آپ کس انصاف اور بے انصافی کی بات کر رہے ہیں۔ بے انصافی تو آپ نے اس وقت

شروع کر دی تھی جب ارم پر نظر رکھنی شروع کی تھی اور دو غلا پن اور کسے کہتے ہیں۔ آپ نے مجھے شریک حیات بنایا تھا۔ ہمیشہ ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔" وہ سر تا پا کانپ رہی تھی لیکن یہ خوف کی نہیں غصے کی کپکپاہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں آتشی آنسو تھے۔

وہ ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "دیکھو حجاب! اس بات کو جتنا بڑھاؤ گی بڑھتی جائے گی۔ ہونا وہی ہے جو میں نے تم سے کہا ہے۔ اب یہ اچھے طریقے سے ہو یا بُرے سے۔ اس کا فیصلہ تم نے کرنا ہے۔"

وہ گرج کر کہنا چاہتی تھی کہ جب فیصلہ تم نے کر ہی لیا ہے تو پھر مجھے کیوں بلایا ہے۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا۔ قدرے دھیمے لہجے میں بولی۔ "مجھے ابھی تک اپنے کانوں پر بھروسہ نہیں ہو رہا جلال! مجھے صرف یہ بتا دیں کہ یہ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ میرے اندر کیا کمی دیکھی ہے آپ نے۔ کیا کوتاہی ہوئی ہے مجھ سے؟"

"میں نے تمہیں بتایا ہے کہ جو کچھ ہوا ہے میری طرف سے ہوا ہے لیکن اب یہ ہو چکا ہے۔ ہم سب کو یہ قبول کرنا ہی ہوگا۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ پھر مجھے جواب دینا۔" جلال نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے واش روم میں جا کر ٹوتھ پیسٹ کی اور پھر بستر پر جا کر لیٹ گیا اس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔

حجاب اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھی رہی۔ اسے جیسے کسی نے دیوار میں چن دیا تھا۔ آنسو مسلسل اس کے رُخساروں پر رینگ رہے تھے۔ ابھی اس نے اپنے جو خوبصورت بُندے اُتار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھے تھے۔ وہ بھی اُداسی کی دھند میں لپٹے ہوئے تھے جیسے دو اٹھکیلیاں کرتے خوش رنگ پرندے ایک دم مردہ ہو گئے ہوں۔ اس کی گلابی نائٹی سے اُٹھنے والی "پروفیسی" کی مدھم خوشبو کسی بے نام سوگ میں ڈوب چکی تھی۔ کتنی ہی دیر بعد وہ بھی آنسو پونچھتے ہوئے اُٹھی اور بستر کے دوسرے کنارے پر جا کر لیٹ گئی۔ اس کی ہستی ایک طوفان کی زد میں آ چکی تھی۔ صرف ایک گھنٹے پہلے وہ کتنی خوشی محسوس کر رہی تھی۔ جلال کے ساتھ کھانا کھا رہی تھی۔ اس سے ہلکی پھلکی باتیں کر رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جلال کی یہ مہربانی ایک مہیب صدمے کا پیش خیمہ ہے۔ اسے لگا کہ اس نے جو شیشلک کھایا تھا وہ اس کے گلے کی طرف آ رہا ہے۔ گرم آنسو لگاتار رخساروں پر رینگ رہے تھے۔ جو کچھ آج سامنے آیا تھا اس کا خدشہ تو وہ بہت پہلے سے محسوس کر رہی تھی لیکن یہ اتنی جلدی اور ایسے بے رحم طریقے سے سامنے آئے گا اس کا اس نے سوچا نہیں تھا۔ شاید کل سہ پہر اس نے کمرے کے حوالے سے جو جسارت کی تھی اس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا تھا۔ جلال نے ارم کی صورت میں جو چھری اپنے لبادے میں چھپائی ہوئی تھی وہ آناً فاناً اس پر چلا دی تھی۔

اپنے والدین کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومنے لگے۔ ان کی معاشی پریشانیاں، ان کے حالات، وہ ہر وقت حجاب کی طرف سے ٹھنڈی ہواؤں کی دعا کرتے تھے لیکن یہ کیسی جھلسا دینے والی زہریلی آندھی چل رہی تھی۔ اپنی بیمار والدہ کا تصور اس کی نگاہوں میں آیا۔ اس نے سوچا، وہ یہ سب کچھ کیسے جھیل سکیں گی۔

بستر کے کنارے پر لیٹے لیٹے اس کی برداشت جواب دینے لگی۔ وہ ہر معاملے میں جلال کے سامنے جھکی تھی لیکن ارم والے معاملے میں جھکنا اسے کبھی پسند نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اسے کبھی یہ قبول ہوا تھا کہ وہ ارم کا راستہ روکنے کے لیے جلال کے پاؤں میں بیٹھے۔ پتا نہیں، اس کی انا جو کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی تھی اس معاملے میں کیوں اپنی جھلک

دکھانے لگتی تھی۔ لیکن آج سب کچھ اس کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ اس نے کروٹ بدلی۔ جلال کے کندھے پر ہاتھ رکھا، پھر عقب سے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس کا سینہ سسکیوں سے دہل رہا تھا۔ وہ جاگ رہا تھا لیکن بے حرکت لیٹا رہا۔ وہ روتی رہی۔ پھر وہ بیتاب ہو کر اُٹھی اور اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھ دیا۔ وہ ہچکیاں لینے لگی۔

"پلیز جلال! پلیز......" وہ بس اتنا کہہ پائی۔

جلال نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے اُٹھایا۔ گاؤ تکیے کے سہارے بٹھایا اور ایک بار پھر اسے سمجھانے بجھانے میں مصروف ہو گیا۔

اس کی گفتگو کا خلاصہ یہی تھا کہ یہ سب کچھ اتنا تکلیف دہ نہیں ہوگا جتنا وہ سمجھ رہی ہے۔ وہ انصاف کرے گا۔ حجاب کو کبھی کوئی دُکھ نہیں پہنچنے دے گا۔ ارم کو علیحدہ گھر میں رکھے گا۔ مگر وہ جو فیصلہ کر چکا ہے۔ اس سے پیچھے ہٹنا اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔

حجاب خاموشی سے سنتی رہی۔ رہ رہ کر ہچکی اس کے جسم کو دہلا دیتی تھی۔ دھیرے دھیرے شدید غم اور صدمے کی کیفیت اس کے اندر کچھ ماند پڑنے لگی اس کی جگہ ایک تپش نے لینی شروع کر دی۔ یہ تپش کہاں سے آ رہی تھی۔ یہ وہیں ایک چنگاری سے نکل رہی تھی۔ وہ چنگاری جس نے کچھ عرصہ پہلے حجاب کے سینے میں جگہ بنائی تھی اور اب دھیرے دھیرے اپنا حجم بڑھا رہی تھی۔

جلال باتیں کر رہا تھا۔ مگر یہ باتیں صرف حجاب کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ان سے آگے ان باتوں کا کوئی اثر نہیں تھا۔ جلال بار بار یہ بات کہہ رہا تھا اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ ہر راستہ تمہارے سامنے کھلا ہے۔ ہر راستے سے اس کی کیا مراد تھی، یہ بھی حجاب اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ یہ دہلا دینے والی بات بتا رہا تھا کہ وہ حجاب کو طلاق دینے کی قیمت پر بھی ارم کو اپنائے گا۔

آخر میں حجاب نے بس اتنا کہا۔ "میں کچھ دنوں کے لیے امی کے گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"سوچنے سمجھنے کے لیے۔" حجاب نے مختصر جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن اس طرح آنسو بہاتے ہوئے نہ جانا۔ ان لوگوں کو ابھی کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

وہ تائیدی انداز میں خاموش رہی۔

O......❖......O

وہ ابو کے گھر واپس آ گئی۔ وہ خود کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنے ماں باپ اور بھائی کو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی۔ خاص طور سے ماں کو۔ لیکن مائیں بھی عجیب شے ہوتی ہیں۔ اپنے بچے کے اندر جھانک لیتی ہیں۔ سو نمافون میں چھپی ہوئی کیفیت کو بھی بھانپ لیتی ہیں۔ حجاب کی امی بھی جان چکی تھیں کہ سسرال میں کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ اتنا تو انہیں پتا چلا تھا کہ ارم نے حجاب کے ساتھ والا کمرہ اپنے لیے کھلوایا تھا جس کے بعد گھر میں کشیدگی پیدا ہوئی تھی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ جلال نے اپنی والدہ سے معافی منگوانے کے لیے حجاب کو گھر بلایا ہے اور

حجاب نے معافی مانگی ہے۔ اس کے بعد کی کوئی بات انہیں معلوم نہیں تھی۔ ان کے بہت پوچھنے پر بھی حجاب نے کچھ نہیں بتایا۔

وہ امی ابو سے ہنس بول رہی تھی۔ فیصل کے ساتھ بھی نارمل انداز میں ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی تھی لیکن اس کے اندر جو قیامت برپا تھی وہ کچھ اسے ہی معلوم تھا۔ جلال انتہا کو چھو گیا تھا۔ اس نے اشاروں اشاروں میں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ وہ حجاب کو طلاق کی قیمت پر بھی ارم کو اپنائے گا۔ یہ بات اس نے کیوں کہی تھی۔ یہ اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ ایک سال پہلے جب طلاق کے لفظ کی بازگشت حجاب کے ودیلہ خاندان میں سنائی دی تھی تو کیا ہوا تھا یہ سب لوگ جانتے تھے۔ ایک طوفان تھا جو بہت کچھ بہا کر لے گیا تھا۔ ایک لڑکی نے ذلت اور تکلیف کی انتہا کو چھوا تھا۔ پھر اس کی جان گئی تھی۔ اس کے شیر خوار بچے کی جان گئی تھی۔ اس واقعے کی یادگاروں میں سے ایک یادگار وہ پورٹریٹ ابھی تک حجاب کے گھر کی ایک دیوار پر لگا تھا۔ وہ اس کی عزیز ہی نہیں اس کی گہری اور قریب ترین سہیلی بھی تھی۔ اس کا صدمہ ایک آہنی میخ کی طرح حجاب کے سینے میں گڑا رہتا تھا جس میں سے خون رستا رہتا تھا۔ بینش کی موت کا جاں گسل صدمہ صرف حجاب کے سینے میں ہی نہیں تھا۔ ودیلہ فیملی کے بہت سے لوگ اس کی ٹیسیں اب تک اپنے دلوں میں محسوس کرتے تھے۔ لہٰذا حجاب جانتی تھی کہ کل رات جلال کے منہ سے ادا ہونے والے اس لفظ کا مطلب کیا ہے۔ اور اگر یہ بینش والا واقعہ نہ ہوا ہوتا تو بھی حجاب کا گھرانہ ان گھرانوں میں سے تھا جہاں طلاق ہی کو نہیں طلاق کے لفظ کو بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس کے لیے فیصلہ اور علیحدگی جیسے لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اگر بینش طلاق لینے کی ہمت نہیں کر سکی تھی تو شاید حجاب بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بینش کے لیے بچے کی صورت میں ایک جکڑ بند موجود تھا۔ حجاب بھی ایک اور طرح کے جکڑ بند میں جکڑی ہوئی تھی۔

حجاب سوچ رہی تھی اور اس کے سینے میں گھٹن بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ کسی نے اس کے منہ پر ایک بھاری تکیہ رکھ دیا ہے اور پورے وزن کے ساتھ اس پر بیٹھ گیا ہے۔ وہ سانس لینا چاہتی ہے، تڑپ رہی ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتی۔ جو سلسلہ ڈیڑھ دو سال پہلے شروع ہوا تھا اب وہ اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتا نظر آ رہا تھا۔ کیا اب ودیلہ فیملی میں ایک اور بینش وجود پا رہی تھی۔

O.....❖.....O

وہ ہفتے کی سہ پہر تھی۔ ہادی کو ملے آج چار روز ہو چکے تھے۔ اس دوران میں حجاب نے اپنا سیل فون بھی بالکل بند رکھا تھا۔ یقیناً ہادی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ اچانک کیوں غائب ہو گئی ہے۔ بنا کچھ بتائے کیوں ایک بار پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ حجاب جانتی تھی کہ اس نے بار بار کال کی ہو گی اور سخت پریشان رہا ہو گا۔ مگر وہ خود اتنی پریشان تھی کہ ہادی کی پریشانی کا خیال اس کی اپنی پریشانی کے نیچے دب گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ وہ روم چھوڑ چکا ہو یا ایک دو دن میں چھوڑنے والا ہو۔

آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔ صرف ابو اسٹڈی میں موجود تھے۔ امی اور فیصل ہفتے بھر کا راشن لینے کے لیے سٹی سینٹر گئے ہوئے تھے۔ ملازم ابو کا خط پوسٹ کرنے گیا تھا۔ اس نے ابو کے لیے چائے بنائی اور لے کر اسٹڈی کی

طرف آ گئی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ابو میز پر جھکے ہوئے تھے۔ سامنے سیاہ جلد والی ایک ڈائری تھی۔ یہ وہی ڈائری تھی جس میں انہوں نے دو ڈھائی سال پہلے کا حساب کتاب لکھ رکھا تھا۔ اس حساب کتاب میں بیشتر حصہ ان اخراجات کا تھا جو امی کی بیماری کی تشخیص اور علاج کے سلسلے میں آئے تھے اور جنہوں نے آناً فاناً حجاب کے والدین کو ایک بھاری قرضے کے بوجھ تلے دبا دیا تھا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی ڈائری تھی لیکن اس کا وزن کتنا زیادہ ہے یہ کچھ ابو ہی جانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس ڈائری کو دیکھتے ہوئے ان کے چہرے پر درجنوں اضافی سلوٹیں نظر آنے لگی تھیں۔ حجاب نے سوچا وہ اچھے وقت پر چائے لائی ہے۔ حجاب کو دیکھتے ہی فیاض صاحب نے ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور چائے کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

دونوں چائے پینے کے ساتھ ساتھ باتیں کرنے لگے۔ پچھلے تین چار دن سے امی کی طرح ابو بھی حجاب کے موڈ سے کچھ کھٹکے ہوئے تھے۔ انہوں نے حجاب کو اپنے ساتھ لگا لیا اور بڑی محبت سے اس سے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھنے لگے۔ جب انہوں نے مخصوص انداز میں بار بار کہا کہ بیٹی بتاؤ۔ اس طرح تمہارا بوجھ ہلکا ہو گا۔ تو نہ جانے کیا ہوا کہ حجاب کے آنسو چھلک پڑے۔ اس نے ابو کے کندھے سے سر لگایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ اسے تھپتھپانے لگے، پچکارنے لگے۔ ساتھ ساتھ وہ اس کے رونے کی وجہ بھی پوچھ رہے تھے۔

”حب! کہیں جلال نے تم پر ہاتھ تو نہیں اُٹھایا۔ تمہیں مارا تو نہیں؟“

”نہیں ابو! یہ اس سے بہت آگے کی بات ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”جلال..... جلال.....“ اس کی آواز بیٹھ گئی۔

”کہو بیٹی! بتاؤ مجھے.....“

”جلال! دوسری شادی کرنا چاہتے ہیں ابو!“ وہ ہمت کر کے کہہ گئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

باپ بیٹی بہت دیر تک ساکت بیٹھے رہے۔ حجاب کے دل کا بوجھ قدرے ہلکا ہوا تو فیاض صاحب نے اسے بہت نرمی سے خود سے علیحدہ کیا۔ ان کے کہنے پر حجاب انہیں اس سارے واقعے کی تفصیل بتانے میں مصروف ہو گئی۔ ارم والے معاملے کی جانکاری اس حد تک تو فیاض صاحب کو بھی تھی کہ وہ بن بلائے مہمان کی طرح حجاب کے گھر میں گھسی رہتی ہے اور جلال کے ساتھ ضرورت سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن بات یہاں تک پہنچ جائے گی اس کا انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ان کے چہرے کی غمناک سلوٹوں میں چند مزید سلوٹوں کا اضافہ ہو گیا۔ وہ جیسے ایک لمحے کے اندر ہی مزید بوڑھے نظر آنے لگے تھے۔

”ابھی یہ سب کچھ اپنی ماں کو نہ بتانا حب! تم جانتی ہی ہو صدمہ اس کے لیے کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اگر اس پر دوبارہ بے ہوشی طاری ہونے لگی تو یہ خطرے کی علامت ہو گی۔ ابھی ہمیں کم از کم پانچ چھ ماہ بڑی احتیاط سے گزارنے ہیں۔“

”نہیں ابو! مجھ میں تو بتانے کی ہمت ہی نہیں ہے لیکن آخر کب تک چھپی رہے گی یہ بات؟“

”یا اللہ! کرم کر ہم پر۔“ وہ بڑبڑائے اور ماتھا پکڑ کر بیٹھ گئے۔

حجاب نے گہری سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "وہ میری پریشانی تو بھانپ گئی ہیں مگر میں نے بتایا کچھ نہیں۔ ابھی اس صورتِ حال کے لیے پہلے ذہنی طور پر تیار کرنا ہوگا۔"

فیاض صاحب اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔ "اچھا میں ذرا مسجد تک جارہا ہوں۔" جب کہیں کوئی صورتِ حال گمبھیر ہوتی تھی وہ اپنا تناؤ کم کرنے کے لیے اسی طرح مسجد کا راستہ اختیار کرتے تھے۔ واپسی پر ہمیشہ بہتر نظر آتے تھے۔

ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد اندرونی دروازے کی بیل ہوئی۔ حجاب نے پہلے ملازم کو آواز دی پھر اسے یاد آیا کہ وہ تو ابو کا خط پوسٹ کرنے گیا ہوا ہے۔ اس نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا اور بھونچکی رہ گئی۔ سامنے ہادی کرم تھا۔ ایک لمحے کے لیے حجاب کا دل چاہا کہ وہ دروازہ بند کردے۔ لیکن ایسا کر نہیں سکی۔ ہادی کے چہرے پر حیرت آمیز خوشی تھی۔ جیسے اسے بھی پورا یقین نہیں تھا کہ حجاب سے یوں ملاقات ہوجائے گی۔

"کیا بات ہے محترمہ! اب اندر آنے کا بھی نہیں کہیں گی؟"

"آ...... جائیے۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ گھر میں اس وقت اور کوئی نہیں تھا ورنہ حجاب کو چادر کا نقاب کرنا پڑتا۔ "یہ آپ کو اس طرح اچانک بن بتائے، غائب ہوجانے کی کوئی بیماری ہے؟" وہ بولا۔

"ہر بندے کے اپنے مسائل اور مجبوریاں ہوتی ہیں ہادی صاحب!" وہ روکھی آواز میں بولی۔ اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ کچھ دیر پہلے روتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ وہ گھر میں اکیلی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس نے نقاب کیا ہوتا۔

"باقی لوگ کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"مختلف کاموں سے نکلے ہوئے ہیں۔ آپ کیسے آئے؟"

"بس دو چار دن میں یہاں سے چل چلاؤ ہے اپنا۔ سوچا کہ ایک بار مل آؤں۔ یہ بھی امید تھی کہ شاید آپ سے ملاقات ہوجائے۔ ویسے میرے اندیشے کے عین مطابق آپ کافی پریشان ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے پتا چل رہا ہے۔"

"بس کوئی مسئلہ تھا لیکن مجھے معاف کیجیے۔ میں آپ سے شیئر کرنا نہیں چاہتی۔"

"آپ شیئر کریں نہ کریں لیکن مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ آپ کے زیادہ تر مسئلوں کی بنیاد وہی مس ارم چوہدری ہے۔"

حجاب کو ہادی کی یہ دخل اندازی ناگوار گزری تھی۔ وہ ذرا تلخ لہجے میں بولی۔ "آپ کیوں لٹھ لے کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کیا کوئی خاص بات معلوم ہوئی ہے آپ کو؟"

ہادی کا دل چاہا کہ کہہ دے۔ "ہاں خاص بات معلوم ہوئی ہے۔ لیکن پھر گلزار عرف گلزاری سے کیا وعدہ اسے یاد آیا۔ اس نے گلزار کو گارنٹی دی تھی کہ اپنی اور اس کی ڈیل کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔"

وہ حجاب سے نظریں ہٹا کر بولا۔ "نہیں کوئی خاص بات تو نہیں لیکن میری چھٹی حس نے اس کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے۔"

"پلیز ہادی! آپ میرے ذاتی معاملات میں دخل نہ دیں اور میری ایک گزارش ہے اگر آپ مان لیں تو......" آخری الفاظ کہتے کہتے اس کا لہجہ مزید روکھا ہوگیا۔

"آپ بزا مان رہی ہیں۔"

وہ اس کے جملے کو نظر انداز کر کے بولی۔ "اب ہم اس سلسلے کو یہاں ختم کردیں۔ اچھے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیں۔"

"مگر ہم نے تو طے کیا تھا کہ میرے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم وینی کن (مذہبی شہر) میں ملیں گے اور سارا دن وہاں گزاریں گے۔"

حجاب نے جھنجلاہٹ محسوس کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی۔ اندرونی دروازے کی بیل پھر ہوئی۔ حجاب کے اندازے کے مطابق یہ گھریلو ملازم تھا جو خط پوسٹ کر کے آیا تھا لیکن جب اس نے دروازہ کھولا تو ٹھٹک گئی۔ وہاں اس کے سسرال کے گھر کا ملازم مقصود کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں انڈین سوتی چور لڈوؤں کا ڈبہ تھا۔

"سلام علیکم، وڈی باجی!" اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔

"یہ کیا ہے بھئی؟"

"مٹھائی ہے جی! ارم بھابی نے بھجوائی ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" حجاب نے چونک کر پوچھا۔

"آپ کو نہیں پتا کل ٹی وی پر ان کی تصویر بھی آئی تھی۔ انہیں کافی بڑا انعام ملا ہے جی۔"

"کس بات کا؟"

"یونیورسٹی سے ملا ہے جی کوئی مقابلہ تھا تقریروں شقریروں کا......"

حجاب کو یاد آگیا۔ کچھ دن پہلے کوئی ملک گیر کمپٹیشن ہوا تھا جس میں یونیورسٹیز کے مقرروں نے حصہ لیا تھا۔ غالباً اس میں ارم نے کوئی پوزیشن لی ہوگی۔ اب اس نے حجاب کو جتانے کے لیے یہ مٹھائی ارسال کی تھی۔ وہ ایسے کام کرتی رہتی تھی۔

مقصود شاید اس انتظار میں تھا کہ حجاب اسے اندر آنے کے لیے کہے گی۔ مگر حجاب کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔ اندر ہادی موجود تھا۔ مقصود اگر ہادی کو دیکھ لیتا تو ضرور چونکتا۔ وہ اسے حجاب کے سسرال کی انیکسی میں کئی دن تک دیکھتا رہا تھا۔ مقصود شکی مزاج تھا اور گھر میں اکثر ارم کی ہاں میں ہاں بھی ملاتا تھا۔ وہ کسی طرح کا شک نہ بھی کرتا اور گھر جا کر کسی کے آگے ذکر ہی کردیتا کہ ہادی یہاں موجود تھا تو مسئلہ کھڑا ہوسکتا تھا۔ حجاب کو ہادی کے حوالے سے جھنجلاہٹ ہونے لگی۔

مقصود بدستور دروازے پر کھڑا تھا۔ حجاب نے کہا۔ "تمہیں کہیں اور بھی جانا ہے۔ مٹھائی دینے؟"

"جی وڈی باجی! ارم بی بی کی دو تین سہیلیاں ہیں اور ایک ان کی کزن۔"

"تو ٹھیک ہے تمہیں کہیں دیر نہ ہو جائے۔ ویسے بھی گھر میں اور کوئی نہیں۔"

"ٹھیک... ٹھیک ہے باجی! اللہ حافظ۔"

اندر سے ہادی کے کھانسنے کی مدھم آواز آئی اور حجاب مزید تلملا گئی۔ ملازم مقصود کو دروازے سے ٹال کر وہ واپس آئی۔ ہادی میگزین دیکھ رہا تھا۔ حجاب کے ہاتھ میں مٹھائی دیکھ کر بولا۔ "کوئی اچھی خبر ہے؟"

حجاب نے مٹھائی کا ڈبہ تپائی پر پھینکا۔ وہ ایک گلاس کو لیتا ہوا قالین پر جا گرا۔ وہ طیش آمیز لہجے میں بولی۔

"ہادی صاحب! میں نے ابھی آپ سے ایک گزارش کی تھی۔ پلیز آپ اس طرح دخل اندازی نہ کریں۔ آپ کی وجہ سے میں کسی بڑی مصیبت میں پڑ سکتی ہوں۔ آپ چلے جائیں یہاں سے۔ یہی میرے اور آپ کے لیے بہتر ہے۔" وہ ٹھٹک گیا۔ شاید اسے حجاب سے ایسے لہجے کی توقع نہیں تھی۔ "کوئی غلطی ہوگئی ہے مجھ سے؟" وہ بولا۔

"غلطی تو مجھ سے ہوئی تھی اس رات جو آپ کے ساتھ وینس دیکھنے چل پڑی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ نے اس طرح پیچھے پڑ جانا ہے۔ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آگئے جیسے میں کوئی جرم کر کے بھاگی ہوں۔ میرے گھر پہنچ گئے۔ یہاں امی کے گھر پہنچ گئے اور ایک دفعہ نہیں بار بار پہنچ رہے ہیں۔ آپ مجھے بتا دیجیے کہ میری غلطی کس طرح معاف کر سکتے ہیں آپ۔" اس نے آخری الفاظ ادا کیے اور غصے سے تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح دہک رہا تھا۔

ہادی نے بغور اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "سس سوری!" اس نے کہا۔

"میں بھی سوری کہتی ہوں۔ اور کہیں تو آپ کے پاؤں کو بھی ہاتھ لگا دیتی ہوں۔" اس نے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی ڈرائنگ روم سے اندرونی کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اسے پتا نہیں چلا ہادی کب ڈرائنگ روم سے نکلا۔ کب مین گیٹ تک پہنچا اور واپس گیا۔ ہاں اتنا اندازہ اسے ضرور ہو گیا کہ وہ چلا گیا ہے۔ چند منٹ بعد وہ اٹھی۔ قالین پر بکھری ہوئی مٹھائی اٹھائی اور اسے ڈسٹ بن میں ڈالا۔

O.....✤.....O

ہادی ہوٹل کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ظہیر کا فون بھی آیا تھا۔ وہ ہادی کے چند ہم ستاروں کو لے کر ہوٹل آنا چاہتا تھا۔ ان لوگوں کا پروگرام تھا کہ وہ ہادی کو روم کے سب سے اچھے چائنیز ریستوران میں ڈنر کرائیں مگر ہادی نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر منع کر دیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ چند ہفتوں کے اندر روم کی اس لڑکی میں اتنا انوالو ہو جائے گا اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وینس کی وہ پہلی شب اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گئی ہے اور وہ اس شب کے سحر سے کبھی نکل نہیں سکے گا۔ اس ایک روشن پیشانی اور ایک جادوئی مسکراہٹ

اس کے سوا اس کی آنکھوں کو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خود کو سمجھاتا، سنبھالتا، ملامت کرتا مگر کچھ بھی اس کے بس میں نہیں تھا۔ کہاں سے جڑتے ہیں یہ ناطے؟ کس ہوا سے کھلتی ہیں دل کی کلیاں وہ کون سی گھڑی ہوتی ہے جب دو اجنبی انسان ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور پھر ان کو یا ان میں سے کسی ایک کو لگتا ہے کہ یہاں تو صدیوں کی جان پہچان ہے۔ وہ سوچتا رہتا تھا۔

اگر اس پہلی رات ریستوران میں سے نکلنے کے بعد وہ اس گلی میں داخل نہ ہوتا ساتھ والی گلی سے نکل جاتا تو وہ نامعلوم لفنگا گیرا کبھی اس کے راستے میں نہ آتا۔ نہ حجاب اسے روکنے کے لیے اس کے سامنے چھتری گراتی۔ نہ وہ سب کچھ ہوتا جو اب تک ہوا تھا اور جس نے ہادی کی زندگی کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ ہادی کے لیے یہ صدمہ ہی کم نہیں تھا کہ اسے چند دن بعد یا ایک دو ہفتے بعد اٹلی چھوڑ کر جانا ہے۔ اب اس میں یہ صدمہ بھی شامل ہو گیا تھا کہ اس نے اپنے رویے سے حجاب کو بے طرح ناراض کر دیا ہے اور حجاب نے نہایت بے رخی سے بلکہ تقریباً دھتکار کر اسے گھر سے نکالا ہے۔ وہ ایک تخلیق کار تھا۔ بے حد حساس اور زود رنج۔ اس طرح کی توہین سے اس کا کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اور اس نے کوئی ایسی سنگین غلطی بھی نہیں کی تھی۔ حجاب ایک بار پھر بغیر کچھ کہے یا بتائے غائب ہوئی تھی۔ چار دن میں اس نے سینکڑوں ہی بار اسے کال کی تھی لیکن رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پھر ایک موہوم سی امید کے سہارے وہ انکل فیاض کے ہاں چلا گیا۔ اس کی موہوم امید پوری ہوئی تھی اور گھر کا اندرونی دروازہ خود حجاب ہی نے کھولا تھا لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی توقع ہادی کو ہرگز نہیں تھی۔ حجاب کا مٹھائی پھینکنا اور لال بھبھوکے چہرے کے ساتھ شدید غصے میں بولنا اس کے لہجے کی کاٹ ابھی تک ہادی کے دل پر آرے چلا رہی تھی۔

وہ الکحل نہیں لیتا تھا لیکن اندر کی حالت کچھ عجیب ہو رہی تھی۔ وہ پہلے بے تحاشا سگریٹ پھونکتا رہا۔ پھر اس نے روم سروس کے ذریعے بیئر کے دو ٹن منگوائے۔ بدبودار سیال اس نے کسی کڑوی دوا کی طرح گلے میں انڈیلا اور پھر نیم مدہوش سا ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ نہ جانے کب ایک روشن پیشانی کا پیچھا کرتے کرتے اسے نیند آ گئی۔

وہ دن چڑھے تک سوتا رہا۔ وال کلاک پر نظر ڈالی گیارہ بج رہے تھے۔ جاگتے ساتھ ہی احساس کی چکی پھر چل پڑی اور اس کے وزنی پاٹ ہادی کے جسم و جان کو کچلنے لگے۔ لیٹے لیٹے اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے۔ اس نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا۔ دور کہیں بلند عمارتوں اور درختوں کے درمیان بحیرہ روم کا پانی اپنی چمک دکھا رہا تھا۔ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا شہر اپنی مصروفیات میں مگن تھا۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ اب اس غافل شہر اور اس کے غافل مکینوں کو چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھا۔ کمرے میں بکھرے ہوئے اپنے سامان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور سائیڈ ٹیبل کی دراز میں سے اپنا پاسپورٹ اور ٹکٹ نکال کر اس کا جائزہ لینے لگا۔

یہی وقت تھا جب دروازے پر ناک ہوئی۔ اس نے کاغذات واپس دراز میں رکھے اور سوچنے لگا کون ہو سکتا ہے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ آہستہ سے بولا۔ "کون؟"

جواب میں پھر ناک ہی سنائی دی۔ ایک مدھم اور شائستہ سی دستک۔ اس نے دروازہ کھولا اور بھونچکا رہ گیا۔ سامنے وہ کھڑی تھی۔ براؤن چادر میں لپٹی لپٹائی۔ نقاب میں سے بس آنکھیں اور ناک کا تھوڑا سا حصہ نظر آ رہا تھا۔

ہادی پہلے تو سکتہ زدہ کھڑا رہا پھر اس نے اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ وہ اندر آ گئی۔ ہادی نے دروازہ بھیڑ دیا۔ حجاب نے اندر آنے کے بعد براؤن چادر کا نقاب تھوڑا سا نیچے کھسکا دیا۔ اب اس کے دلکش چہرے کا قریباً تہائی چوتھائی حصہ نظر آنے لگا تھا۔ "بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"بیٹھیں۔" ہادی نے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گیا۔

وہ کچھ دیر تک اپنی حنائی انگلیوں کو مروڑتی رہی پھر آزردہ آواز میں بولی۔ "ہادی کل جو کچھ ہوا میں اس پر بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ یقین کریں میں ساری رات ..." اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ سینے میں جلن سی تھی۔

وہ چند لمحے اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی پھر بولی۔ "مجھے معاف کر دیجیے۔ میں اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ ہادی! میں نے آپ کو اس طرح گھر سے نکالا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ تو یہاں روم میں چند دن کے مہمان ہیں۔ پلیز آئی ایم رئیلی ویری سوری ہادی میں نے آپ کو ہرٹ کیا۔"

ہادی نے گہری سانس لی۔ "میں چند دن کا نہیں شاید ایک آدھ دن کا مہمان ہوں۔ میں کل تک یہاں سے جا رہا ہوں۔"

وہ نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ حنائی انگلیاں بے ساختہ ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ سرخ چہرہ کلائیوں پر ہری اور سرخ چوڑیوں کی کھن کھن تھی۔ آخر ہمت کر کے بولی۔ "آپ نے جانا ہے تو ضرور جائیے لیکن میں اس طرح نہیں جانے دوں گی۔"

"کیا مطلب؟"

"آپ کو ٹھیک ہونا ہوگا۔ بالکل پہلے کی طرح۔ جب آپ جائیں تو مجھے ہنستے ہوئے الوداع کہیں۔"

"ہنسنا آپ نے میرے لیے بہت مشکل کر دیا ہے حجاب! مجھے لگتا ہے کہ اندر سے بالکل خالی ہو گیا ہوں۔"

"میں اپنے سارے الفاظ واپس لیتی ہوں ہادی! اس کے علاوہ بھی آپ جیسے کہیں Apologise کو تیار ہوں۔"

"میں صرف کل کی بات نہیں کر رہا۔"

وہ اپنائیت سے بولی۔ "تو پھر بتا دیجیے نا۔ کس کس بات پر ناراض ہیں آپ؟"

"آپ خود جانتی ہیں حب! آپ نے کہاں کہاں دھکا دے کر مجھے پیچھے ہٹایا ہے۔ غیروں کی صف میں کھڑا کیا ہے۔"

"میں سمجھی نہیں۔" اس نے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں تلے دبایا۔

"ہم اتنے روز اکٹھے ایک ساتھ رہے ہیں۔ جگہ جگہ گھومے ہیں۔ ہر طرح کی باتیں کی ہیں۔ میں نے اپنے بارے میں آپ کو تقریباً سبھی کچھ بتایا ہے۔ لیکن آپ کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا یہاں سے گزرنے والے کسی راہگیر کے بارے میں۔"

"اچھا بتائیں۔ کیا جاننا چاہتے ہیں آپ؟"

"کوئی ایک سوال تو نہیں ہے۔ درجنوں ہیں جو میرے ذہن میں ابھرتے رہے، مجھے کچوکے لگاتے رہے۔ یہ سب سوال آپ ہی نے اپنی باتوں سے پیدا کیے لیکن ان کے جواب نہیں دیئے اور نہ یہ سوچا کہ میں کس طرح شدید الجھن میں رہوں گا یہاں بھی اور یہاں سے جانے کے بعد بھی۔"

"چلیں ٹھیک ہے ہادی! آپ پوچھیے۔ میں آپ کو بتاؤں گی۔" اس کا انداز مفاہمت کا تھا۔

وہ اب بھی خاموش بیٹھا رہا۔

"اب کیا ہے؟" وہ ذرا ادا سے بولی۔

"رہنے دیں حجاب! بات تو وہ ہوتی ہے جو دل سے نکلتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں آپ کو مجبور کر رہا ہوں۔"

"یعنی ایموشنل بلیک میل..... نہیں جناب نہیں ہرگز نہیں۔ میں دل کی گہرائی سے سمجھتی ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس میں میرا ہی کوئی فائدہ نکل آئے۔ آپ مجھے کوئی اچھا مشورہ دے سکیں لیکن ایک بات..." وہ تذبذب سے بولی۔

وہ اپنی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے کہ کمرہ مناسب نہیں۔ یہاں کوئی آ سکتا ہے۔ ہم باہر چلتے ہیں۔ کہیں آرام سے بیٹھیں گے۔"

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ لوگ ویٹی کن سٹی کی خوبصورت فضا میں تھے ویٹی کن کو ایک طرح سے عیسائیت کا سب سے اہم شہر کہا جاتا ہے۔ اسے علیحدہ ملک کا درجہ حاصل ہے۔ حالانکہ یہ ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ اس شہر میں سات سو کے قریب نہایت منتخب مذہبی پیشواؤں ہی کو رہائش رکھنے کی اجازت ہے۔ ان میں اہم ترین پوپ ہوتا ہے۔ ویٹی کن کا داخلی دروازہ عظیم الشان ہے اور اس کے سامنے ایک نہایت وسیع و عریض احاطہ ہے جس کی اطراف میں اونچی فصیل پر بے شمار مجسمے ایستادہ تھے۔ یہ مجسمے زمانۂ قدیم کے مختلف پیشوں اور ہنروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ احاطے کے برآمدے میں بلند و بالا دیوہیکل ستونوں کی قطاریں ہیں۔ حجاب بڑے اشتیاق سے ہادی کو یہاں گھماتی رہی۔ ایک ایک چیز کے بارے میں بتاتی رہی۔ وہ ساتھ ساتھ اپنے آرٹیکل کے لیے نوٹس بھی لے رہی تھی۔ حجاب کے شوہر جلال اور حجاب کے مزاج میں جو تضادات تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ جلال کو سیاحت اور آثارِ قدیمہ وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اسی دوران میں یورپین لڑکیوں کا ایک گروپ ادھر آ نکلا۔ یہ سرخ و سپید لڑکیاں بڑے خوشگوار موڈ میں تھیں۔ ان میں سے ایک نے ہادی اور حجاب کو دیکھ کر بے ساختہ اپنا کیمرہ ان کی طرف کر دیا۔ غالباً وہ ایک خوبصورت جوڑے کے طور پر ان کی تصویر اتارنا چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ جوڑا نہیں تھے اور نہ ہی تصویر اتروانے کے موڈ میں تھے حجاب تو بالکل بھی نہیں۔ اس نے اپنا نقاب درست کیا اور فوراً منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ خوش باش لڑکیوں نے ہادی سے درخواست کی کہ اگر اس کی ساتھی نہیں تو وہ ہی تصویر اتروا لے۔ ہادی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تصویر اتروانے لگا تو

لڑکیاں ایک گروپ کی شکل میں اس کے ساتھ کھڑی ہوگئیں اور بڑی خوش خلقی کا اظہار کیا۔ ویٹی کن کے وسیع و عریض احاطے سے باہر ایک خوبصورت پارک بیٹھنے کے لیے بہت مناسب تھا۔ یہاں اشوکا کے گھنے درخت تھے اور گملوں کی خوشنما باڑوں پر پھولوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ایک تنہا فوارے کے پاس پتھر یلے بنچ پر جا بیٹھے۔

"پوچھیے ہادی! کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔" وہ خود ہی بول اُٹھی۔

"حجاب! یہ انسانی فطرت ہے کہ جس کے ساتھ اپنائیت اور لگاؤ ہوتا ہے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے اور اس کے دُکھ سکھ میں شریک ہونے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے شروع سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی مشکلات کا شکار ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے انکل فیاض اور خالہ صوفیہ بھی بے حد پریشان میں ہیں۔ خاص طور سے خالہ صوفیہ جبکہ وہ بیمار بھی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق آپ اور جلال میں دوریاں بڑھانے میں اس لڑکی ارم کا بھی اہم کردار ہے۔"

"آپ نے پہلے بھی یہ بات کہی تھی۔ کیا آپ نے کچھ دیکھا ہے؟"

"ہاں کچھ دیکھا بھی ہے لیکن آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے آپ مجھے کچھ بتائیں۔ آپ کی مشکلات کس نوعیت کی ہیں۔ بہت سے سوال کلبلاتے رہتے ہیں میرے ذہن میں۔ میں سوچتا ہوں آپ سب کے بارے میں۔ خالہ صوفیہ کی اصل بیماری کیا ہے؟ یہ ارم کیوں ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس معاملے میں آپ اور آپ کے گھر والے مناسب مزاحمت کیوں نہیں کر پاتے؟ اور وہ جو تصویر آپ کے گھر میں لگی ہوئی ہے اس کا کیا قصہ ہے؟ جب بھی اس تصویر کا ذکر ہوا میں نے آپ کے چہرے پر گہرے دُکھ کا سایہ دیکھا۔"

تصویر کے ذکر پر واقعی ایک بار پھر حجاب کے چہرے پر زردی سی کھنڈ گئی۔ وہ کتنی ہی دیر خاموش رہی جیسے اپنے اندر کی کشمکش سے نبرد آزما ہو۔ شاید وینس میں کشمکش کا یہی وہ لمحہ تھا جب ہادی اُٹھ کر منرل واٹر لینے چلا گیا تھا اور حجاب اُٹھ کر غائب ہوگئی تھی لیکن آج وہ اُٹھنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ آج وہ حجاب کی نیم آمادگی کے ان لمحوں کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

وہ یک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری پھر دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔ "میرے سسرال خاندان کو راٹھ خاندان کہا جاتا ہے۔ ہمارا خاندان وبلہ کہلاتا ہے۔ یہ ایک ہی برادری کی دو شاخیں ہیں لیکن ان میں کبھی کوئی رشتے داری نہیں ہوئی تھی۔ پاکستان میں نہ پاکستان سے باہر۔ کوئی ایسی دشمنی بھی نہیں تھی لیکن بس ایک طرح کا کھچاؤ سا تھا جو شاید ماضی میں زمینوں کے معاملات کی وجہ سے پیدا ہوا ہوگا۔ گجرات میں وبلہ اور راٹھ خاندان کی زمینیں ساتھ ساتھ تھیں۔

بہرحال یہاں روم میں ان دونوں گھرانوں میں پہلا تعلق بینش کی شادی کی صورت میں پیدا ہوا۔ یہ بینش میری وہی کزن ہے جس کی تصویر آپ نے میرے کمرے میں دیکھی ہے۔ شاید آپ کو پتا نہ ہو میرے شوہر جلال کا ایک بڑا بھائی فیروز بھی ہے۔ وہ میلانو میں گارمنٹس کا کاروبار کرتا ہے۔ جلال کے برعکس وہ ایک آزاد خیال اور سیلانی شخص ہے۔ بینش کی شادی قریباً پانچ سال پہلے اس سے ہوئی تھی۔ اس شادی کے بعد ہی دونوں گھرانوں کا آپس میں ملنا

جلنا ہوا اور پھر میری شادی کی راہ بھی ہموار ہوئی۔ جب میری شادی جلال سے ہوئی اس وقت تک بینش کا کوئی بچہ نہیں تھا اور وہ نارمل زندگی ہی گزار رہی تھی۔ لیکن پھر بتدریج میاں بیوی میں اختلاف بڑھنے لگا۔ پتا چلا کہ فیروز کو نت نئی عورتوں میں دلچسپی ہے۔ اس کی اکثر راتیں گھر سے باہر نائٹ کلبوں میں گزرتی تھیں اور وہ اٹلی سے باہر اپنے کاروباری دوروں پر بھی اکیلا نہیں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال کسی بھی بیوی کے لیے قابل قبول نہیں ہوتی۔

بینش میری کزن ہی نہیں میری سب سے گہری سہیلی بھی تھی۔ ہم نے ہوش سنبھالتے ہی ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما تھا اور زندگی کے سارے گرم سرد اکٹھے دیکھے تھے۔ جب بینش کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں آئیں تو اس کا سب سے زیادہ اثر مجھ پر ہی پڑا۔ یوں تو بینش میلانو میں رہتی تھی اور میں روم میں لیکن ہمارے درمیان فون پر اکثر رابطہ رہتا تھا۔ جب وہ آنسو بہاتی تو وہ میرے دل پر گرتے۔ میں اسے سمجھاتی بجھاتی اور بہتری کے لیے مشورے دیتی لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ فیروز کی پراپرٹی اور کاروبار اٹلی سے باہر بھی ہے۔ آئرلینڈ کے ایک دو جزیروں پر بھی اس نے چھوٹی موٹی جائیدادیں خریدی تھیں۔ وہ اکثر گھر سے باہر رہتا تھا اور اس کے رہنے کا انداز بھی کسی سے چھپا نہیں تھا۔ اس کا حوصلہ بھی بڑھ چکا تھا اور وہ بینش کے ساتھ برملا اپنے افیئرز کا اظہار بھی کرتا تھا۔ ایک روز شراب کے نشے میں اس نے بینش کو بُری طرح پیٹا اور وہ والدین کے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد چار پانچ ماہ میں نوبت طلاق تک پہنچ گئی لیکن وہ طلاق بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔ بینش سینکڑوں میں ایک تھی اور فیروز الدین ان مردوں میں سے تھا جو گھر کی مرغی دال برابر تو ضرور سمجھتے ہیں لیکن اسے دال کی طرح پھینکنا نہیں چاہتے۔ وہ ان کی مرغوب غذا ہوتی ہے اور وہ اپنے دسترخوان پر اس غذا کی ڈش کو بھی برابر سجا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ شاید وہی جاگیردارانہ سوچ کا اثر۔ عورت ایک ملکیت اور اس ملکیت میں اضافہ۔ بینش نے برداشت کی آخری حدوں کو چھونے کے بعد طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے خاندان میں بھی کئی لوگوں نے اس کو بہت بُرا سمجھا۔

دانتوں میں انگلیاں دبائی گئیں۔ مگر حالات کا جائزہ لینے والوں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ ناجائز مطالبہ نہیں ہے بینش خلع حاصل کرنے میں حق بجانب ہے۔ دوسری طرف فیروز نے صاف کہہ دیا کہ وہ بینش کو طلاق نہیں دے گا۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ وہ اسے ماں باپ کے گھر سے منا کر لے گیا اور وعدہ کیا کہ اپنی روش بدلے گا لیکن حالات میں ذرا سی تبدیلی بھی نہیں آئی۔ بلکہ کچھ بگاڑ ہی پیدا ہوا۔ وہ شراب میں دھت ہو کر بینش سے مار پیٹ بھی کرتا تھا۔ اسی دوران میں بینش ایک بچے کی ماں بھی بن گئی۔ اٹلی میں قانون کچھ سخت ہیں۔ بینش عدالت سے رجوع کرتی تو اسے بہ آسانی طلاق مل جاتی لیکن فیروز ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بینش کو ہر طرح سے ڈرایا دھمکایا۔ چہرہ بگاڑنے کی دھمکیاں دیں۔ آخر یہاں تک کہہ دیا کہ وہ سات ماہ کے بچے کو لے کر کہیں غائب ہو جائے گا اور وہ زندگی بھر اس کی صورت کو ترستی رہے گی اور اس سے یہ بعید بھی نہیں تھا۔ وہ جنونی سب کچھ کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بینش نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور ہر طرح کا جبر سہتے ہوئے فیروز کے ساتھ ہی رہنے لگی۔"

ذرا توقف کر کے حجاب نے اپنی آنکھوں کے نم گوشے پونچھے اور چادر کا نقاب درست کرنے میں مصروف ہو گئی۔ ہادی نے پوچھا۔ "بینش کے گھر والوں کا اس معاملے میں کیا کردار رہا۔"

حجاب بولی۔ ''والد تو بینش کے تھے نہیں۔ والدہ اور دو بھائی تھے۔ ایک بڑا ایک چھوٹا۔ بڑے بھائی کے ساتھ بھی فیروز کا سخت جھگڑا ہوا تھا اور نوبت پستول نکالنے تک پہنچ گئی تھی۔ اس جھگڑے کے بعد فیروز نے بینش کا میکے میں آنا جانا بالکل بند کر دیا تھا۔ صرف اس کی ماں کو اجازت تھی وہ کبھی کبھار آ کر مل جاتی تھی۔ بہت کٹھن حالات تھے وہ بینش کے لیے۔ اگر... اگر میری شادی سے پہلے اس طرح کے حالات کی کوئی جھلک نظر آئی ہوتی تو شاید اس گھر میں میری شادی کے بارے میں سوچا بھی نہ جاتا۔ بدقسمتی یہی تھی کہ میری شادی ہونے تک بینش اور فیروز کے معاملات میں بظاہر کوئی خرابی دکھائی نہیں دی تھی۔ شاید اختلافات ابھی اس اسٹیج پر ہی نہیں پہنچے تھے کہ چار دیواری سے باہر نکلتے۔'' حجاب کی آنکھوں میں ٹھہرا تاسف پھیل گیا جیسے وہ تقدیر کی اس ستم ظریفی پر دل کی گہرائیوں سے دکھ محسوس کرتی ہو۔

''جب یہ معاملات بگڑے تو آپ کو اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں بھی اندیشے پیدا ہوئے [illegible] نے پوچھا۔

''بس مجھے اتنی تسلی تھی کہ جلال کا ذہن اور طرح کا ہے۔ ان کے گھر میں اور ان کے اپنے اندر مذہبی رنگ نمایاں تھا اور اب بھی ہے۔'' وہ کچھ مزید کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد دوبارہ بینش والے موضوع پر آتے ہوئے بولی۔

''بہن بھائیوں کا رشتہ آسانی سے چھوٹنے والا نہیں ہوتا۔ لڑکی سسرال میں آ جاتی ہے مگر اس کی زندگی کے بیس پچیس سال تو اس کے میکے میں ہی بکھرے ہوتے ہیں نا۔ اگر کوئی سخت دل شوہر یہ توقع رکھے کہ وہ چند دنوں کے اندر زندگی کے اس حصے سے ہر ناطہ توڑ لے گی اور اپنے دل و دماغ کو صرف اپنے سسرال اور وہاں کے رشتوں تک محدود کر لے گی تو یہ اس کی بیوقوفی ہی ہے۔ یہ ہو بھی جاتا ہے لیکن اس میں کچھ وقت لگتا ہے۔ دوسری طرف فیروز چاہتا تھا کہ سب کچھ آناً فاناً ختم ہو جائے۔ بینش کبھی کبھار ماں اور بھائیوں سے فون پر بات کر لیتی تھی، فیروز کو یہ بھی گوارا نہیں تھا۔ اس نے بینش کے فون کرنے پر بھی مکمل پابندی لگا دی۔ بینش نے فیروز کی سب پابندیاں قبول کی تھیں مگر یہ پابندی مکمل طور پر قبول کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ یہ پہلی حکم عدولی تھی جو اس نے کی۔ وہ کبھی کبھار چوری چھپے ماں اور بھائیوں سے فون پر بات کرتی رہی۔ درحقیقت بینش کی یہی ''جسارت'' تھی جو ایک دن اس کی موت کا سبب بن گئی۔ وہ اپنی ماں اور بھائیوں کی آواز سننے کی خواہش میں موت کی وادی میں اتر گئی۔ اس کے مرنے کی کوئی عمر نہیں تھی ہادی! وہ تو جیسے ابھی زندگی شروع کر رہی تھی۔ پھول سا بچہ تھا اس کا۔ اتنا پیار کرتی تھی اس سے کہ میں کیا بتاؤں۔ وہ دونوں ایک ساتھ ہی چلے گئے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں، ایک دوسرے کی سسکیاں سنتے ہوئے اور ایک دوسرے کے خون میں لتھڑے ہوئے۔'' حجاب کی آواز رندھ گئی۔ وہ سسکنے لگی۔ آنسو نقاب کے اندر رینگنے لگے۔

کچھ دیر بعد ہادی نے پوچھا۔ ''کس طرح ہوا یہ سب؟''

''وہ کرسمس کے دن تھے۔ وہ تین روز رہ گئے تھے۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بینش کی والدہ بیمار تھی۔ بینش کے

پاس ایک سیل فون موجود تھا۔ فیروز آفس چلا گیا تو بینش نے والدہ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا۔ اسی دوران میں فیروز واپس آ گیا۔ وہ اپنا کوئی کاغذ بھول گیا تھا۔ غالباً کوئی نقشہ وغیرہ۔ ڈرائیور بھی اس کے ساتھ تھا اور برآمدے میں کھڑا تھا۔ فیروز نے بینش کو فون کرتے دیکھا اور سیخ پا ہو گیا۔ اس نے بینش پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے لے کر سیڑھیوں پر پٹخ دیا اور چلایا۔ ''میں مار دوں گا تمہیں جان سے مار دوں گا تم دونوں کو ختم کر دوں گا۔'' وہ دندناتا ہوا سیڑھیاں اتر گیا۔

دہشت زدہ بینش نے سمجھا شاید وہ اسٹڈی میں سے پستول وغیرہ نکالنے گیا ہے۔ وہ روتی بلکتی اس کے پیچھے لپکی۔ غالباً اس کی ساڑھی کا پلو اس کے پاؤں کے نیچے آیا اور وہ انیس بیس سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آ گری۔ اس کی کمر اور سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بے ہوش ہو گئی۔ دوسری طرف فیروز آگ بگولا حالات میں باہر پورچ میں آ گیا اور ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر نکل گیا۔ اس کے بعد بے ہوش ماں اور شیر خوار بچے کے لیے ایک دردناک صورت حال شروع ہو گئی۔ ایسا واقعہ جس نے سب کو لرزا کر رکھ دیا۔ بینش سیڑھیوں کے نچلے سرے پر بے ہوش پڑی تھی۔ شیر خوار ارسلان پہلے تو بہت دیر قالین پر بیٹھا رہا۔ پھر رونے لگا اور آنسوؤں کی زبان میں ماں کو پکارنے لگا۔ اسے بھوک لگی تھی۔ یوں تو گھر میں ایک ملازم اور ملازمہ ہوتے تھے مگر کرسمس کی وجہ سے وہ بھی چھٹی پر تھے۔ گھر میں ماں بیٹے کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ ننھا ارسلان بھوک سے بیتاب ہو گیا تو ہاتھ پاؤں پر رینگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف آ گیا۔ اس معصوم نے سیڑھیوں کے آخری سرے پر اپنی ماں کی جھلک دیکھی ہو گی۔ وہ اس سے دور کیسے رہ سکتا تھا۔ وہ تو اس کی ہر مصیبت کا مداوا اور ہر مسئلے کا حل تھی۔ وہ کچھ دیر سیڑھیوں کے اوپری سرے پر رکا اسے دیکھتا رہا پھر اس نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس معصوم نے آگے بڑھنا چاہا اور لڑھکتا ہوا اپنی بے ہوش ماں کے پاس پہنچ گیا۔ وہ بھی شدید زخمی ہو گیا تھا۔ سیڑھیوں کے نچلے سرے پر تانبے کے گملے میں ایک ان ڈور پودا رکھا تھا۔ چوکور گملے کا نوکیلا کنارہ کم سن ارسلان کی پسلیوں میں لگا تھا اور وہاں گہرا کٹ آ گیا تھا۔ اس کا کومل بدن خون اگل رہا تھا۔ بہرحال وہ ہوش میں تھا۔ ماں کے پہلو میں سما کر رویا چلایا تو ماں کی بے ہوشی، نیم بے ہوشی میں بدل گئی۔ کچھ دیر بعد وہ مکمل ہوش میں آ گئی۔ مگر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں فریکچر ہو چکے تھے۔ ایک کلائی ٹوٹ گئی تھی اور ناک منہ سے خون رس رہا تھا۔ اپنے خونچکاں بچے کو دیکھ کر وہ روئی پکاری لیکن اس کی اور اس کے شیر خوار کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ باہر برف گر رہی تھی اور کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ باہر کے لوگوں سے رابطے کا واحد ذریعہ بس ایک سیل فون تھا اور یہ سیل فون فیروز سیڑھیوں پر پٹخ کر ناکارہ کر چکا تھا۔

مصیبت زدہ ماں کسی طرح رینگتی ہوئی اور اپنے پیچھے خون کے نشان چھوڑتی ہوئی سیل فون تک پہنچی لیکن وہ اس کی تقدیر کی طرح اسے دھوکا دے چکا تھا۔ وہ پھر رینگتی ہوئی واپس اپنے بچے کے پاس آ گئی۔ ماں اور بچہ دونوں نازک حالت میں تھے۔ ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ بینش کی کمر کے جن مہروں پر شدید ضرب آئی تھی، ان میں اوپر کے تین چار مہرے بھی شامل تھے۔ یہی مہرے سانس کی روانی برقرار رکھتے ہیں۔ اس کی سانس اکھڑتی جا رہی تھی۔ وہ اب رونے چلانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی سانس اور آواز دونوں رک رہی تھیں۔ مگر وہ اپنے معصوم

بچے کو بچانا چاہتی تھی۔ اس موقعے سے جو ثبوت ملے ان سے پتا چلا کہ وہ آخر وقت تک اپنے بچے کو اپنے ساتھ لپٹائے رہی، اس کو اپنا دودھ پلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس کے اپنے جسم سے بھی خون رس رہا تھا لیکن وہ بچے کے زخم سے خون روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک ٹوٹی ہوئی تپائی کے پاس بہت سے خون آلود ٹشو پیپر پڑے ملے۔

حادثے کے قریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے اپنے جاں بلب بچے سمیت بیرونی دروازے کی طرف رینگنے کی کوشش بھی کی لیکن چند فٹ طے کرنے کے بعد بے بس ہو گئی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ریڑھ نے اسے بے بس کر دیا تھا۔ ارسلان کا بہت زیادہ خون بہہ گیا تھا۔ سات ماہ کے معصوم میں خون ہوتا ہی کتنا ہے۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ ماں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ گھڑی کس کرب سے گزری ہوگی۔ ہادی آپ تصور کریں۔" وہ سسکنے لگی۔

ہادی یکسر خاموش تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے کربناک لہجے میں بولی۔ "وہ دونوں مر گئے ہادی! پہلے کون مرا ہوگا؟ پورے یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن بینش کے چہرے پر کرب اور ماتم کی جو کیفیت تھی اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے شیر خوار ارسلان نے پہلے دم توڑا۔ ڈاکٹروں کے اندازے کے مطابق بینش قریباً ڈیڑھ گھنٹے مزید زندہ رہی۔ اس کی موت دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی تھی۔"

حجاب کی آواز بیٹھ گئی۔ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا مگر سنبھال نہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "ہادی ہادی! وہ دونوں مر گئے سسک سسک کر...... اور وہ دفتر میں بیٹھا اپنے کاروباری دوستوں کے ساتھ پراپرٹی کے نقشے دیکھتا رہا۔ اس واقعے کی نیوز میڈیا پر بھی آ گئی۔ اخباروں میں بھی شور مچا۔ بہت لے دے ہوئی ماں بچے کی اس دردناک موت نے لوگوں کو دہلا کر رکھ دیا۔ فیروز گرفتار ہوا لیکن اگلے ہی روز ضمانت پر رہا ہو گیا۔ اس کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ اس پر زیادہ سے زیادہ مجرمانہ غفلت کا الزام لگ سکتا تھا۔ وکیل صفائی اسے سراسر حادثہ قرار دیتا تھا۔ جس وقت فیروز اور بینش میں جھگڑا ہوا اور فیروز نے بینش کا سیل فون سیڑھیوں پر پٹخ کر توڑا۔ فیروز کا ڈرائیور نیچے برآمدے کے ساتھ کامن روم میں کھڑا تھا۔ اس نے عدالت میں سارا واقعہ بیان کر دیا تھا۔ فیروز کو عدالت سے صرف چھ ماہ کی سزا ہوئی۔ بینش اور ارسلان کی موت ہمارے دلوں پر گہرے زخم چھوڑ گئی۔ مجھے تو ایسا لگتا تھا کہ جسم روح سے خالی ہو گیا ہے اور میں بس کسی روبوٹ کی طرح چلتی پھرتی رہتی ہوں۔ وہ میرے بہت قریب تھی۔ اس کے بغیر میں نے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا کبھی۔ ان دنوں میں نے خود کو گھر میں قریباً بند کر لیا تھا۔ میں گھر سے باہر اور روم میں جہاں کہیں نکلتی تھی مجھے بینش کی یادیں بکھری نظر آتی تھیں۔ ہمارا اسکول، ہمارا کالج وہ سڑکیں جن پر ہمارے قدم پڑے تھے وہ ریستوران جہاں ہم نے کھانے کھائے تھے اور وہ تفریح گاہیں جو ہماری بے مثال دوستی کی گواہ تھیں۔

کئی ماہ بعد اپنے گھر اور جلال کے لیے میں خود کو بمشکل سنبھال پائی تھی۔ فیروز، جلال کا بھائی تھا لیکن جلال سے بہت مختلف۔ وہ نت نئے فیشن کے لباس پہنتا تھا، شراب پیتا تھا، کلبوں میں جاتا تھا۔ دوسری طرف جلال ایک مذہبی شخص ہے۔ اس نے کسی پیر صاحب کی بیعت بھی کی ہوئی ہے۔ وہ بھی کافی دولت مند شخص ہیں۔ جلال ان کے ساتھ تبلیغی دوروں پر بھی جاتا ہے۔ ظاہری حلیے سے لے کر لباس اور رہن سہن تک بلکہ زندگی کے ہر معاملے میں وہ مذہبی

رنگ نمایاں رکھتا تھا لیکن دونوں بھائیوں میں اس بے انتہا فرق کے باوجود کبھی مجھے لگتا ہے کہ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے میرا مطلب ہے......"

بات کرتے کرتے حجاب ایک دم چپ ہو گئی۔ اسے جیسے احساس ہوا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ کہہ گئی ہے۔ ہادی نے اسے کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ جو کہنے والی تھی وہ کسی حد تک ہادی کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ دونوں بھائی زندگی سے وہ سب کچھ حاصل کر رہے تھے جو کر سکتے تھے۔ فرق صرف طریقہ کار کا تھا۔ ایک تو تھا ہی آزاد خیال اور زندگی سے ہر طرح کی لذتیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا مذہبی تھا لیکن ہر طرح کی آسائشوں کے حصول کے لیے اس نے بھی درمیانی راہیں ڈھونڈ رکھی تھیں۔

بینش والے واقعے نے ہادی کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ واقعی یہ جھنجھوڑ دینے والا حادثہ تھا (اگر اسے حادثہ کہا جائے تو) فیروز نے بڑی بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔ بینش کو اتنی سی بات یا جسارت کی خوفناک سزا ملی کہ وہ اپنے گھر والوں سے فون پر رابطہ رکھنا چاہتی تھی۔ حادثے سے چند لمحے قبل وہ بینش کا سیل فون توڑ کر چلا گیا اور یہ سیل فون بینش کے رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ اگر وہ ایمبولینس سروس یا کسی پڑوسی کو کال کر سکتی تو ماں بیٹے کی جان بچ سکتی تھی۔ وہ خون میں لت پت قریباً چار گھنٹے تک بے یارو مددگار گراؤنڈ فلور پر پڑے رہے اور دم توڑ گئے۔

ہادی اور حجاب کتنی ہی دیر بالکل گم صم بیٹھے رہے۔ آخر ہادی نے اس خاموشی کو توڑا۔ "اب کہاں ہے یہ فیروز الدین؟"

"آج کل جیلپر میں رہ رہا ہے۔ وہی عیاشیاں چل رہی ہیں۔ بینش کی موت کے بمشکل دس ماہ بعد اس نے دوسری شادی بھی کر لی تھی۔ اس کے لیے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہوگا۔ کچھ مرد بڑے پتھریلے دل والے ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان میں سے ایک ہے۔"

"اور جلال؟"

"کیا مطلب؟"

"یہ کس طرح کے مردوں میں سے ہے۔" ہادی نے بیباکی سے پوچھا۔

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ وہ تذبذب جو بینش والا واقعہ سنانے سے پہلے اس کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ ہادی نے بڑے تحمل سے اس تذبذب کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ اسے یقین سا تھا کہ اب جب حجاب نے بتانا شروع کیا ہے تو وہ اور بھی بتائے گی۔ اس کا اندازہ کافی حد تک درست نکلا۔ حجاب نے کہا۔ "جلال بھی سخت مزاج ہیں۔ ایک بیوی کی حیثیت سے میں اپنا فرض جانتی ہوں کہ ان کی ہر طرح کی سختی کو برداشت کروں۔ مگر کبھی کبھی ایسی باتیں بھی اٹھانی پڑتی ہیں جو برداشت کے قابل نہیں ہوتیں۔ اس وقت میں سخت اذیت میں آ جاتی ہوں۔"

"کہیں آپ کا اشارہ ارم کی طرف تو نہیں۔"

اس نے چونک کر ہادی کو دیکھا۔ "آپ بار بار ارم کی بات کیوں کرتے ہیں؟"

"میں آپ کو بتاتا ہوں پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔"

وہ چند لمحے خاموش رہ کر بولی۔ ''آپ کسی حد تک کہہ سکتے ہیں وہ ہماری زندگی میں دخل اندازی کر رہی ہے۔''

''میرے خیال میں دخل اندازی چھوٹا لفظ ہے حب! وہ بہت کچھ کر رہی ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔''

''آپ نے وعدہ کرنا ہوگا کہ یہ بات اپنے تک رکھیں گی۔ ارم سے بھی اس کا کوئی ذکر نہیں کریں گی۔ میں نے کسی سے کمٹمنٹ کر رکھی ہے کہ اس کا راز رکھوں گا۔''

اس کی آنکھوں میں فکر انگیز تجسس اُبھرا۔ بہرحال اس جنے ہادی نے وعدہ کیا کہ وہ یہ بات صرف اپنے تک محدود رکھے گی۔ اس کی آنکھوں میں اس بات کی گواہی نظر آ رہی تھی کہ وہ بات نبھانے والی لڑکی ہے۔ ہادی نے مناسب الفاظ میں اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو چند روز پہلے پیش آیا تھا۔ گلزاری کا مسلسل پیچھا کرنا۔ پھر ہوٹل کے کمرے میں ہادی کا اسے گھیرنا۔ ڈپٹی ہاشم ایرک کا آنا۔ ہادی کا سب کچھ اُگلنا اور پھر اس کے ساتھ ... ہادی نے سب کچھ حجاب کے گوش گزار کر دیا۔ بہرحال گلزاری کی شناخت اس نے چھپالی۔ وہ ہکا بکا سنتی رہی۔ آنکھوں میں خوف آمیز حیرت تھی۔

آخر میں وہ قدرے ہراساں نظر آنے لگی۔ ''ہادی! کہیں اب بھی تو کوئی ہمارے پیچھے نہیں ہے۔'' اس نے دائیں بائیں دیکھا۔

''نہیں..... ایسی بات نہیں۔ میں پوری تسلی کر چکا ہوں۔ وہ بندہ بھی معاہدے کی مکمل پابندی کر رہا ہے۔''

حجاب کو مطمئن کرنے میں ہادی کو دس پندرہ منٹ لگے۔ ہادی نے جو تذکرہ کیا اس کا فائدہ ... حجاب کچھ اور کھل گئی۔ اب تک اس نے بے حد محتاط لہجے میں بات کی تھی مگر اب اس کا لب و لہجہ تبدیل ہو گیا۔ اس نے تسلیم کیا کہ اس ارم کی وجہ سے اس کی ازدواجی زندگی خطرے کا شکار ہے۔ اس کے ساتھ جلال کا رویہ دن بدن خراب تر ہو رہا ہے۔ اکثر اوقات وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کی سخت توہین بھی کر جاتا ہے۔ وہ خاص طور سے اپنی والدہ کی طرف سے پریشان ہو رہی ہے۔

وہ بولی۔ ''والدہ بیمار ہیں اور ان پر یہ حالات بہت بُرا اثر ڈال سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں ٹینشن والی بات بیٹھ گئی ہوئی ہے۔ ان کے دل میں ہر وقت یہ وہم رہتا ہے کہ کہیں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی نہ ہو جائے ... جلال بھائی نے نافیروز کا۔ میرے خیال میں امی کی تکلیف بڑھ جانے میں ان سوچوں کا بھی بڑا دخل ہے۔''

''والدہ کی بیماری کیا ہے حب؟'' ہادی نے دریافت کیا۔

''ان کے برین میں رسولی تھی۔ پہلے تو یہ خدشہ تھا کہ یہ کینسر کی کوئی قسم ہے۔ ان کے سر میں شدید درد ہوتا اور بیٹھے بیٹھے ایک دم بے ہوشی بھی طاری ہو جاتی تھی مرض کو ڈائیگنوز کرنے کے لیے بہت سے ٹیسٹ ہوئے ... کریں ہادی! یہ درجنوں نہیں سینکڑوں ٹیسٹ تھے۔ ان میں سے کئی بے حد مہنگے تھے۔ اس سلسلے میں امی کو دو بار ... بھی لے جانا پڑا۔ اس کے بعد آپریشن کا مرحلہ آیا۔ دو مہینے میں ان کے تین آپریشن ہوئے تھے۔ یہ سارے ... پہلے کے واقعات ہیں۔ اس سارے علاج معالجے میں بہت زیادہ اخراجات اُٹھے ابو جان کو روم سینٹرم میں ایک

... نسبتاً کم قیمت پر بیچنا پڑا۔ یہ گھر بھی جس میں رہ رہے ہیں سمجھیں کہ گروی پڑا ہوا ہے۔ ابو کو کافی رقم قرض بھی لینا پڑی۔ اس قرض کے بوجھ نے ابو اور بھائی کو بُری طرح دبا رکھا ہے۔''

''خالہ صوفیہ کی طبیعت اب کیسی رہتی ہے؟'' ہادی نے پوچھا۔

''اللہ کا شکر ہے۔ اب ٹھیک ہیں۔ معمول کی دوائیاں لے رہی ہیں۔ ایک قریبی ہسپتال میں ہفتہ وار معائنہ بھی کرواتی ہیں۔''

ہادی کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ ہسپتال کی انتظار گاہ میں بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو گئی تھیں اور انہوں نے ہادی سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی اس بے ہوشی کے بارے میں ان کے گھر میں کچھ نہ بتائے۔ اس کا مطلب تھا کہ خالہ صوفیہ کی طبیعت اتنی اچھی بھی نہیں تھی جتنا حجاب بتا رہی تھی۔

وہ کافی دیر ان موضوعات پر بات کرتے رہے۔ ہادی نے کہا۔ ''حب! اس روز میں نے آپ سے کہا تھا کہ ارم کی طرف سے آپ کو بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر حد تک جا سکتی ہے۔''

''ہاں ہادی! اس بات کا تو مجھے بھی علم تھا کہ وہ دن بہ دن کھلتی جا رہی ہے اور نڈر بھی ہو رہی ہے لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ گھٹیا ہتھکنڈوں پر اُتر آئے گی۔''

ہادی نے اس کی جھیل آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حب! آپ نے مجھے ایک اچھے دوست کا درجہ دیا ہے میں اسی پر خوش اور مطمئن ہوں۔ اگر آپ کو اپنے معاملوں میں کسی بھی طرح کا مشورہ یا مدد درکار ہو تو میں دل و جان سے حاضر ہوں۔ پورے اخلاص کے ساتھ۔''

''نہیں ہادی! آپ نے مجھے بتائے بغیر میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ خطرہ مول لیا ہے میں آپ کی شکر گزار ہوں لیکن میں آپ کو اپنی زندگی کے کانٹوں میں نہیں گھسیٹ سکتی۔ یہ جو کچھ بھی ہے اس کا سامنا مجھے ہی کرنا ہے۔''

''پکا نا سمجھ رہی ہیں نا؟''

''نہیں..... زیادہ اپنا سمجھ رہی ہوں۔ جو زیادہ اپنا ہوتا ہے اس کی سلامتی کا اتنا ہی خیال رکھا جاتا ہے۔ آپ میرے دُکھ سُکھ میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے اور ہادی! جو کچھ آپ نے بتایا ہے اس کے بعد تو ہمیں اور محتاط ہو جانا چاہیے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دوسرے سے اب نہ ملیں۔ جب تک آپ یہاں ہیں، ہم فون پر بات کر سکتے ہیں۔''

ہادی ایک دم گم صم ہو گیا۔ یہ وہی ناراضی والی کیفیت تھی جس کے بعد حجاب ہوٹل پہنچی تھی اور یہاں اس کے ساتھ ویگن میں آئی تھی۔ وہ فطرتاً ایک حساس لڑکی تھی۔ وہ فوراً بولی۔ ''اچھا آپ پھر خفا ہونے کی کوشش نہ کریں۔ میں وعدے کے مطابق پرسوں آؤں گی۔ شاپنگ میں آپ کی مدد کروں گی۔ اس کے بعد ہم اس دن ملیں گے جس سے اگلے دن آپ نے جانا ہوگا۔''

"او کے......" ہادی لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔

وہ جان چکا تھا کہ حجاب جو کچھ بتا رہی ہے حالات اس سے کہیں زیادہ بُرے ہیں۔ میاں بیوی میں بہت بڑی خلیج پیدا ہو چکی ہے اور اس خلیج میں چالباز ارم اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ سما گئی ہے یا سمانے کی کامیاب کوشش کر رہی ہے لیکن یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا ہادی کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ یہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ حجاب کے متعلق ہادی کے جذبات وہی رہنے تھے، جو تھے یہ لڑکی کون تھی؟ اس کی ازدواجی حیثیت کیا تھی، اس کے مسائل اور اس کے قریبی جوار کیا تھے؟ ان سب سے قطع نظر ہادی کو یہی لگتا تھا کہ یہ صدیوں کا سفر طے کر کے اس تک پہنچی ہے اور کوئی ہادی کے اندر صدیوں سے کسی رہگزر پر بیٹھا تھا اور اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اپنی تمام تر ظاہری و باطنی خوبیوں کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں اُتر چکی تھی اس کی رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی۔ وہ یہ سوچ کر حیران ہوتا تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں کوئی دیوانگی کا اتنا لمبا سفر بھی طے کر سکتا ہے۔ تو کیا پھر وہ صدیوں والی بات درست تھی۔ وہ پہلے سے اسے جانتا تھا۔ اسے تلاش کرتا پھر رہا تھا۔ اور تقدیر اسے اس سے ملانے کے لیے نہروں کے شہر وینس میں لے آئی اور اس جادوئی شب میں دونوں سرِ راہ ٹکرا گئے۔

اب سائے لمبے ہونے لگے تھے۔ وینس کے عظیم الشان دروازے پر دو گھڑیال لگے تھے۔ ایک درست وقت بتا رہا تھا۔ یعنی سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ دونوں نے وہیں پارک میں بیٹھے بیٹھے ریڈی میڈ لنچ کیا تھا۔ چکن ڈونر اور ساتھ میں کوک کے ٹھنڈے ٹن۔ یہاں تو وقت کا کوئی احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ سیاحوں کی ٹولیاں پارک میں چکرا رہی تھیں۔ رومانی جوڑے چہل قدمیاں کر رہے تھے اور ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ سارے جوڑے میاں بیوی بھی نہیں تھے۔ آہ یہ مغربی تہذیب کی اندھی پستیاں۔

مدھم سی ہوا شمالاً جنوباً چلنا شروع ہو گئی تھی۔ اس میں مولسری اور گلاب کے پھولوں کی مہک تھی۔ دور کچھ فاصلے پر سرو اور سفیدے کے بلند و بالا درخت لہلہاتے تھے اور ان سے اوپر گہرا نیلا آسمان تھا جس پر پرندے اٹکھیلیاں کرتے تھے۔ حجاب بار بار کلائی کی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ ایک اور ملاقات ختم ہونے جا رہی تھی۔ اب انہیں پرسوں ملنا تھا اور پھر شاید چار پانچ دن بعد۔ پتا نہیں کیوں ہادی اس دن کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

O......❖......O
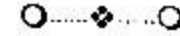
وہ میٹرو میں بیٹھ کر واپس آئے۔ اپنے ہوٹل کے قریبی اسٹیشن پر ہادی اُتر گیا، حجاب بیٹھی رہی اور خدا حافظ کہہ کر آگے نکل گئی۔ اپنے کمرے میں جا کر بھی ہادی کو چین نہیں آیا۔ وہ لکڑی کے فرش پر بے قراری سے ٹہلتا رہا۔ یہ وہلہ اور راٹھ خاندان کی کہانی تھی۔ وہلہ خاندان کی دو لڑکیوں کو بیاہنے کے بعد دیگرے راٹھ خاندان میں بدترین حالات پیش آئے تھے۔ ان میں سے ایک تو جان کی بازی ہار چکی تھی اور دوسری شاید دھیرے دھیرے اس طرف بڑھ رہی تھی۔ آج ہادی نے حجاب کی پُرکشش آنکھوں کے گرد حلقے سے دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں کے اندر بھی بے قرار شب و روز کی گواہی موجود تھی۔ اس نے اب تک اس گھر میں بہت کچھ برداشت کیا تھا لیکن اب جو کچھ ہونے جا رہا تھا وہ اس کے لیے قابلِ برداشت نہیں تھا۔ وہ جیسے اندر سے ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ چھوٹا بھائی بھی اسی راہ پر چل رہا تھا جس پر

چا بھائی چلا تھا۔ بس دونوں کا انداز مختلف تھا۔ کیا اس حسین مسکراہٹ والی لڑکی کے ساتھ بھی کچھ ہونے والا ہے۔ اس کی جبیں کا چاند اماوس کی کالی راتیں نگل لیں گی۔ وہ سوچتا تھا تو اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے خون رسنے لگتا تھا۔ وہ اس کے عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ ہاں وہ ہو چکا تھا۔ کسی کافی کے بول اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ لگن لاگی۔ مو ہے لگن لاگی۔

اس کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف فربہ اندام ظہیر کی خوش باش آواز تھی۔

"ہادی بھائی! یہ تو کوئی بات نہیں تم روم میں ہو اور لگتا ہے کہ لاہور میں ہو۔ اور جب لاہور میں پہنچ جاؤ گے تو پھر تو ہم کسی دوسری دنیا کے باشندے کہلائیں گے۔ کوئی رابطہ ہی نہیں ہے ہم سے۔"

"نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ظہیر بھائی! آپ حکم کریں۔"

"ہم نے حکم کیا کرنا ہے حکم تو فنکار کرتے ہیں۔ پرستار تو صرف التجائیں ہی کر سکتے ہیں۔ پلیز چند منٹ...... پلیز چند شعر...... پلیز آٹوگراف۔"

"اب آپ شرمندہ کر رہے ہیں۔ اس دن ذرا مصروف تھا۔ اب بتایئے کیا کرنا ہے مجھے؟"

"کچھ بھی نہیں بھائی میرے دو تین چاہنے والے ہیں تمہارے، بلکہ ایک چاہنے والی بھی ہے، گھبراؤ نہیں بڑی لڑکی ہیں۔ ان سے تم سے ملنا ہے تھوڑی سی گپ شپ کریں گے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں لیں گے۔"

"تو ٹھیک ہے شام کو آجایئے۔"

"نہیں...... کھانے کے ٹائم آئیں گے۔ اور کھانا بھی ان کی طرف سے ہوگا بہرصورت۔"

"چلیں جیسی آپ کی مرضی۔"

"مگر ایک شرط ہے۔ اپنی کوئی نئی چیز سنانا پڑے گی تمہیں اور کوئی ڈراما نہیں چلے گا۔ وہ جو محترمہ ہیں انہوں نے تو شروع سے آخر تک پڑھا ہوا ہے۔ جس ادبی نشست میں آپ نے شائقین کو اپنے پرانے کلام پر ٹرخایا تھا اس میں بھی یہ موجود تھیں۔"

"او کے ظہیر بھائی کوشش کروں گا۔" ہادی نے کہا۔

کہنے کو تو اس نے نئی چیز کا کہہ دیا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے لیے کچھ نیا لکھنا ممکن نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ لب تک شیخو صاحب کو ناراض نہ کرتا چلا آ رہا ہوتا۔ وہ بہت بڑے مہربان تھے اس کے۔ ہر بُرے بھلے وقت میں کام آنے والے۔ اس نے یونہی دراز میں سے ایک ا تنک پیڈ نکالا اور اس پر انگلیوں سے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔ وہ غور سوچ رہا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ شعر لکھا نہیں جا سکے گا۔ لیکن پھر اچانک اس پر انکشاف ہوا۔ اسے لگا کہ وہ لکھ سکتا ہے۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت کچھ لکھ سکتا ہے۔ وہ کیفیت جو اس نے بہت عرصے سے کھو رکھی تھی۔ آج پھر اس پر طاری ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ لکڑی کے دیدہ زیب فرش پر ٹہلنے لگا۔ اس کی طبع موزوں ہو رہی تھی۔ اس نے پہلا شعر لکھا ایک عرصے بعد ایک طویل وقفے کے بعد۔ اس شعر میں اس محبت کا ذکر تھا جو سنگلاخ پتھروں میں سے ایک چشمے کی طرح پھوٹتی ہے اور تمام رکاوٹوں کے باوجود اپنے من چاہے راستے پر بہنے لگتی ہے۔ اس کا تعلق جسم سے اتنا

نہیں ہوتا جتنا روح سے ہوتا ہے۔

اس شعر کو کاغذ پر اُتارنے کا مرحلہ آیا تو نہ جانے کیوں ہادی کو اس قلم کا خیال آ گیا جو حجاب نے ویلنٹائن ڈے پر بطور تحفہ دیا تھا۔ اس نے اپنے اپنی کی پاکٹ میں سے وہ قلم نکالا۔ اس کے لمس نے اس کی پوروں کو چھوا تو جیسے انگلیوں سے ایک راستہ سیدھا اس کے دل تک پہنچ گیا۔ وہ خوش تھا اور حیران بھی۔ سوچنے لگا کیا تخلیق کے بند دروازے اس پر وا ہو رہے ہیں؟ اس لڑکی کی بدولت جو کہانیوں کے شہرِ روم کی انگوٹھی میں ایک بے مثال نگینے کی طرح تھی۔

O……❖……O

ہادی کے بارے میں اپنے خیالات خود حجاب کی سمجھ میں بھی نہیں آتے تھے۔ وہ ایک بہت پیارے دوست کی حیثیت سے اس کے سامنے آیا تھا اور اس نے اپنی افادیت ثابت کی تھی بہرحال حجاب کی محسوسات میں کسی طرح کی رومانیت کو دخل نہیں تھا۔ وہ بس اسے ایک مخلص اور محبوب ساتھی کی حیثیت سے دیکھتی تھی۔ اس کی قربت سے اسے سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ وہ ایک شاعر تھا لیکن ایک مضبوط اور چارہ گر شخص بھی تھا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنے اردگرد ایک مضبوط مرد کی کمی محسوس ہوا کرتی تھی۔ اس کے ابو لاغر اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والے بالکل اور طرح کے شخص تھے۔ اس کے ایک ماموں جو کسی وقت دبنگ ہوا کرتے تھے، اب طویل عرصے سے بیمار تھے۔ بھائی فیصل ایک دبلا پتلا لڑکا تھا۔ اپنے دفتر میں کام میں مگن رہنے والا اور زندگی کی ہنگامہ خیزیوں سے گھبرانے والا۔ ہادی میں حجاب کو کچھ اور طرح کی جھلک نظر آئی تھی، مگر پھر بھی جو کچھ ہو رہا تھا وہ بہت ڈرانے والا تھا۔ ارم کی خباثت اب بالکل کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ وہ اوچھے ہتھکنڈوں پر اُتری ہوئی تھی۔ اس نے حجاب کے خلاف جو سازش کی وہ ہادی کی وجہ سے ناکام ہو گئی لیکن اس کے خطرات پوری طرح دور نہیں ہوئے تھے۔ اگر کسی طرح جلال تک یہ بات پہنچ جاتی کہ حجاب اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلی ہے، نہ صرف نکلی ہے بلکہ ایک مرد سے ملی ہے تو وہ اس کا بہت بڑا ایشو بناتا اور حجاب کے لیے قیامت بپا کر دیتا۔ حجاب بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ پرسوں اگر ہادی سے ملی تو اسی ملاقات میں اسے الوداع بھی کہہ دے گی کوئی ایسا معقول عذر پیش کر دے گی کہ وہ دوسری ملاقات پر اصرار نہ کرے۔

اس کے فون کی بیل ہوئی۔ اس کا دل دھڑک اُٹھا۔ یہ جلال کا نمبر تھا۔ امی کچن میں تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ان پر کچھ بھی آشکار ہو۔ وہ کال ریسیو کرتی ہوئی چھت پر چلی آئی۔ جلال کی آواز میں بھاری پن تھا اور وہی خنک سنجیدگی جو حجاب کے دل کی کلی کو کبھی کھلنے نہیں دیتی تھی۔ رسمی کلمات کے بعد وہ اصل موضوع پر آ گیا۔ ”تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے حب؟“

”میں فیصلہ کرنے والی کون ہوتی ہوں۔ فیصلے تو آپ ہی کے ہوتے ہیں۔“

”حب! میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ تمہارے لیے میرے دل میں جو جگہ ہے وہاں کوئی اور نہیں آ سکتا۔“

”آپ کے دل میں پتا نہیں کتنی جگہیں ہیں۔ میرے دل میں تو بس ایک ہی ہے۔“

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں حب! ہم تینوں بہت خوش رہیں گے۔ میں تم دونوں کو پورا پورا حق دوں گا۔“

”حق کو آدھا تو آپ نے خود ہی کر دیا ہے جلال! اس کو پورا کیسے کریں گے؟ اور کر بھی دیں گے تو کیسے ہو گا۔ علیحدہ گھر، علیحدہ کار، علیحدہ نوکروں سے تو یہ حق پورا نہیں ہوتا۔“

”میں تم سے لمبی بحثوں میں اُلجھنا نہیں چاہتا حب! میں چاہتا ہوں کہ یہ کام تم اپنے ہاتھوں سے کرو۔ اس میں تمہاری مرضی نظر آئے۔ مجھے پتا ہے تمہارا یہ رویہ ارم پر بھی بہت اچھا اثر ڈالے گا۔ وہ ہمیشہ تمہاری عزت کرے گی۔ فرمانبردار رہے گی تمہاری۔“

”میں نے ہمیشہ ”آپ“ سے عزت پانے کی دعائیں کی تھیں، اپنی سوکن سے نہیں، آپ یہ سزا کیوں دے رہے ہیں جلال! اگر آپ نے کوئی ایسی سزا دینا ہی تھی تو کچھ برس انتظار کر لیتے۔ شاید کوئی مناسب بہانہ آپ کو مل جاتا۔ اولاد سے محرومی، نرینہ اولاد سے محرومی، میری بیماری موت یا پھر کچھ اور۔ آپ اتنی جلدی مجھ پر یہ ستم ڈھانے پر کیوں آمادہ ہو گئے ہیں۔ اب مجھ سے یہ توقع کر رہے ہیں کہ میں اپنی خوشی سے آدھا حق کسی اور کو سونپ دوں گی۔ صرف اس لیے…… صرف اس لیے کہ ڈھائی تین سال میں آپ کا دل مجھ سے بھر گیا ہے اور آپ کو ایک نیا چہرہ اچھا لگنے لگا ہے یہ تو کوئی جواز نہیں جلال! اور اگر ہے تو کیا پھر یہ رعایتیں صرف مردوں ہی کو حاصل ہیں۔ خدا کے واسطے جلال! مجھے کوئی تو گناہ بتایئے۔“

وہ توقف کے بعد بولا۔ ”وجوہات تو ڈھونڈنے سے کئی مل سکتی ہیں حب! ہماری شادی کو تین برس ہو چکے ہیں، ابھی تک تمہاری گود خالی ہے۔ مجھے جلد بچہ چاہیے مجھے مستقبل کے سہارے کی ضرورت ہے حب! تمہاری فیملی میں بے اولادی کا اور دیر سے اولاد ہونے کا رجحان ہے۔ تمہاری بڑی بہن کے ہاں شادی کے نو سال بعد اولاد ہوئی ہے اور وہ بھی دو بچیاں ہیں لیکن…… لیکن میں ایسی باتوں کو جواز نہیں بنا رہا ہوں حب! اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہے، کیا پتا تمہاری گود کل ہی ہری ہو جائے۔ میں صرف اور صرف سچ بیان کر رہا ہوں حب! اور سچ یہی ہے کہ میں کمٹمنٹ کر چکا ہوں۔ ہمیں یہ شادی کرنی ہے۔“

”تو پھر آپ یہ کیوں چاہ رہے ہیں کہ میں اپنے ہاتھ سے اپنے گلے پر چھری چلاؤں اور وہ بھی مسکرا مسکرا کر۔ آپ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیجیے۔ مجھے میری قسمت پر چھوڑ دیجیے۔“

”ایک کام جو اچھے طریقے سے ہو سکتا ہے اسے بُرے طریقے سے کرنا کیوں چاہتی ہو۔ جبکہ…… جبکہ میں تمہیں پوری گارنٹی دے رہا ہوں کہ میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ تمہاری زندگی پہلے سے بہت بہتر ہو گی۔“

”اگر میں یہ کہوں کہ مجھے یہ بہتر زندگی نہیں چاہیے اور اس بات پر بھی راضی ہو جاؤں کہ آپ جو تکلیفیں مجھے دے رہے ہیں وہ دیتے رہیں۔ اس سے زیادہ بھی دے لیں۔ مگر دوسری شادی کا ارادہ ختم کر دیں تو پھر؟“

”تم کج بحثی کر رہی ہو حب! ہمارا مذہب ہمیں ایک سے زائد شادیوں کی اجازت دیتا ہے۔“

”اجازت دیتا ہے لیکن انصاف کی شرط کے ساتھ اور انصاف یہ نہیں ہے کہ ایک جیسی گاڑیاں اور ایک جیسی کوٹھیاں، انصاف میں سب سے اہم چیز ایک جیسی محبت اور چاہت ہے۔ کیا آپ مجھے اور ارم کو ایک جیسی محبت دے

سکتے ہیں؟ اپنے دل میں جھانک کر دیکھیے کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟"

"ہو سکتا ہے کہ اس میں تھوڑا بہت فرق آ جائے۔ انیس بیس کا فرق ناممکن نہیں ہوتا۔ لیکن اس صورت حال میں ایک بیوی دوسری کو تھوڑی بہت رعایت دے سکتی ہے۔"

"لیکن اگر وہ یہ تھوڑی بہت بھی ہاں تھوڑی بہت رعایت نہ دینا چاہے تو؟" حجاب کا لہجہ آتشیں تھا۔

وہ ذرا توقف لے کے بولا۔ "تو پھر دیگر راستے کھلے ہیں۔ وہ علیحدہ ہو سکتی ہے۔"

"بہت خوب جلال! یعنی اگر آپ کو کسی بھی وقت کوئی حسین چہرہ پسند آ جاتا ہے تو آپ اپنی پہلی بیوی کو مجبور کریں گے کہ وہ یا تو اپنے حق میں کمی کو تیار ہو جائے یا طلاق لے لے۔ کیونکہ انصاف کی اہم ترین شرط پوری کرنا یعنی ایک جیسی چاہت دینا آپ کے بس میں نہیں ہے۔"

"یہ سیدھی سیدھی بات ہے۔"

"یہ سیدھی سیدھی بات نہیں ہے۔ ہمارے مذہب میں مرد کو زیادہ شادیوں کی اجازت ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے درمیان انصاف نہیں کر سکو گے اور حالات میں خرابی کی نوبت آئے گی تو پھر ایک ہی بیوی کافی ہے۔"

"تم بات کو اور بحث کو بڑھا رہی ہو حب! اور میں نے یہ وقت تمہیں اس لیے دیا تھا کہ تم بات کو اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔"

"میں کیا کوشش کروں۔ میں اپنے گھر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتا دیکھ رہی ہوں۔ وہ بد بخت عورت ہے جلال! وہ نقب لگا رہی ہے ہمارے گھر میں اور آپ نقب لگوا رہے ہیں۔"

"دیکھو حب!" جلال کڑے لہجے میں بولا۔ "میں اس کے خلاف کچھ سننا پسند نہیں کروں گا۔"

"تو پھر مجھے گولی مار دیجیے۔ ختم کر دیجیے مجھے۔" وہ قریباً چلا اٹھی۔

"اس وقت تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ پھر بات کروں گا۔" جلال نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ اپنی جگہ بیٹھی لرزتی رہی۔

O……❖……O

ارم آج کل سارے گھر میں اڑتی پھر رہی تھی۔ ہر کام میں پیش پیش نظر آتی تھی۔ خاص طور سے آپا خانم کے سب کام تو وہ اپنے ہاتھ سے کرتی تھی۔ یا اپنی نگرانی میں کرواتی تھی۔ صبح کے دس بجے تھے۔ آج اسے یونیورسٹی نہیں جانا تھا۔ سب سے پہلے تو ارم نے آپا خانم کے گھٹنوں پر زیتون کے تیل کی مالش کی۔ ملازمہ کلثوم پاس کھڑی تھی وہ کلثوم کو سمجھاتی رہی کہ مالش اور مساج کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ مالش سے فارغ ہونے کے بعد وہ آپا خانم کے لیے پرہیزی ناشتہ بنوانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ یہاں اس کی بڑی بہن فوزیہ پہلے سے موجود تھی اور آپا خانم کے لیے کھانا تیار کروا رہی تھی۔

ارم نے کہا۔ "باجی! میرے خیال میں جیجا جی کو آپ کی زیادہ ضرورت ہے۔ ان کی کوئی ٹائی نہیں مل رہی۔ آوازیں دے رہے ہیں آپ کو آپ انہیں دیکھ لیجیے میں ناشتہ بنواتی ہوں۔"

"ناشتہ تو بس تیار ہی ہے۔" فوزیہ نے کہا۔

"چلیں جی! میں بھی تھوڑا سا خون لگا کر شہیدوں میں نام لکھوا لیتی ہوں۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔

فوزیہ نے اسے گھورا، جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو۔ "تمہاری ان چستیوں اور پھرتیوں کی وجہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔"

اسی دوران میں ظہیر بھی فوزیہ کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ "بھئی! وہ میری سرخ ٹائی نہیں مل رہی کہیں بھی......"

ارم چہکی۔ "سرخ ٹائی لگا کر سویرے سویرے کہاں جائیے گا جیجا جی؟"

وہ بولا۔ "میری پیاری سالی صاحبہ! تم نے خود ہی جواب بھی دے دیا ہے۔ سویرے سویرے تو لوگ کام پر ہی جاتے ہیں۔ ہاں شام کے بعد سرخ ٹائی لگا کر کہیں جاتا تو آپ شک کا اظہار فرما سکتی تھیں۔"

"شاموں کو بھی تو آپ جناب نکلے ہی ہوتے ہیں۔ پرسوں بھی آٹھ بجے کے بجائے رات بارہ بجے آئے تھے۔ میں اور باجی ٹی وی دیکھ دیکھ کر ہلکان ہو گئی تھیں۔ پھر میں تو سو گئی تھی جا کر۔"

"ہاں اس دن...... اس دن تو ہادی صاحب کے ساتھ ایک نشست تھی۔ ہوٹل واسکوڈے گئے تھے۔ ان کے دو چار شاعر بھی ساتھ تھے۔ خوب محفل جمی۔ غیر متوقع طور پر ہادی صاحب نے اپنی دو نئی نظمیں بھی سنائیں۔ بالکل فریش، تازہ بتازہ۔"

ہوٹل واسکوڈے گاما کے نام پر ارم چونکی۔ یہ نام چند دن پہلے بھی اس نے سنا تھا کس سے سنا تھا؟ ایک دم اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ہوٹل واسکوڈے گاما کا ذکر تو گلزاری نے کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ حجاب وہاں کسی سے ملنے گئی تھی۔ اس کے جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔

وہ بولی۔ "جیجا جی! یہ ہادی صاحب ہوٹل واسکوڈے گاما میں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"ہاں۔ کہہ رہے تھے کہ ان کا ایک پاکستانی دوست وہاں ٹھہرا تھا اور اس نے تاکید کی تھی کہ روم میں جا کر ہوٹل واسکوڈے گاما میں ضرور ٹھہرنا ہے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

ارم ذرا سنبھل کر بولی۔ "ہوٹل میں کہاں قیام ہے جناب کا؟"

"سیکنڈ فلور، روم نمبر 118 ہے۔ تین چار روز میں انہوں نے چلے جانا ہے۔ ملنا ہے تو مل لو۔"

ظہیر بات کرتا کرتا باہر نکل گیا۔ ارم اپنی جگہ گم صم کھڑی رہی۔ اس کے ذہن میں بڑی تیزی سے ایک تانا بانا پروان چڑھ رہا تھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ تیار ہوئی اور چھوٹی گاڑی لے کر خود ہی نکل گئی۔ ہوٹل واسکوڈے گاما کا ایڈریس اسے ایک ٹورسٹ گائیڈ سے مل گیا تھا۔ مناسب رفتار سے ڈرائیو کرتی ہوئی وہ ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوٹل تک پہنچ گئی۔ گاڑی پارکنگ میں لگانے کے بعد وہ استقبالیہ پر آ گئی۔ یہاں سے بذریعہ لفٹ سیکنڈ فلور پر پہنچی۔ کمرہ نمبر 118 پر دستک دینے کا ارادہ تھا مگر پھر دروازے پر ڈسٹرب نہ کریں کا بورڈ دیکھ کر واپس استقبالیہ پر آ گئی اور لابی میں بیٹھ

گئی۔ اس کے دل و دماغ میں ہلچل تھی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس پر کوئی اہم انکشاف ہونے والا ہے۔ ہادی کئی روز تک گھر کی انیکسی میں قیام پذیر رہا تھا۔ اب وہ ہوٹل میں شفٹ ہو چکا تھا اور اسی ہوٹل میں حجاب بھی دیکھی گئی تھی۔ ارم کو بار بار گلزاری کا رویہ بھی یاد آ رہا تھا۔ ایک دن پہلے تک وہ اپنی کارکردگی کے بارے میں بڑا پُر جوش تھا مگر اگلے ہی روز اس نے مایوسی کا راگ الاپ دیا تھا۔ کیا اس تبدیلی کے پیچھے کوئی وجہ تھی؟ وہ سوچتی رہی۔ اس نے ایک میگزین اپنے سامنے کھول رکھا تھا۔ تا کہ اگر ہادی اپنے کمرے سے نکل کر نیچے آئے تو اس کی نظر فوراً ہی اس پر نہ پڑ سکے۔

اس کی یہ احتیاط کارگر رہی، بلکہ انتہائی کارگر رہی۔ اسے لابی میں بیٹھے پندرہ بیس منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہادی لفٹ کے دروازے سے نکلتا دکھائی دیا۔ ارم نے قدرے رشک سے دیکھا۔ چوڑے شانے، دراز قد، کشادہ پیشانی پر بالوں کی چند لٹیں جھولتی ہوئی۔ وہ شاعر کم اور ہیرو زیادہ نظر آتا تھا۔ تیار ہو کر نکلا تھا۔ اس نے ہاف سلیو سرخ شرٹ کے ساتھ میچنگ ٹائی لگا رکھی تھی۔ پینٹ بالکل سفید تھی۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ نظر آ رہا تھا۔ وہ رسٹ واچ دیکھتا ہوا بیرونی دروازے کی طرف بڑھا اور سیڑھیاں اُتر کر باہر پارکنگ لاٹ میں پہنچ گیا۔ ارم بھی اُٹھی اور دروازے کے قریب پہنچ کر اسے باہر جاتا دیکھنے لگی۔ وہ پندرہ بیس قدم آگے گیا ہو گا جب ارم کو بُری طرح چونکنا پڑا۔ وہ سکتہ زدہ سی کھڑی رہ گئی۔ اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ وہ سرتا پا براؤن چادر میں لپٹی تھی۔ نقاب میں سے چہرے کا بہت تھوڑا سا حصہ نظر آتا تھا اور اس حصے میں سے بھی کچھ حصے کو دھوپ کے چشمے نے اوجھل کر رکھا تھا۔ بہرحال ارم کے لیے اسے پہچاننا قطعی دشوار نہیں تھا۔ اسے ننانوے فیصد یقین ہو گیا کہ یہ حجاب ہے حجاب اور ہادی کے درمیان مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا اور چند الفاظ بولے گئے پھر وہ دونوں پیدل ہی مین روڈ کی طرف بڑھے۔ ارم کی دھڑکن تیز ہو چکی تھی۔ وہ ان کے پیچھے جانا چاہتی تھی مگر یہ خدشہ بھی تھا کہ ان میں سے کوئی اسے دیکھ لے۔ بہرحال یہ رسک تو لینا ہی تھا۔ اس نے میگزین واپس لابی کی تپائی پر رکھا اور شولڈر بیگ اُٹھا کر باہر نکل آئی۔ وہ دونوں پچاس ساٹھ میٹر تک سیدھے گئے پھر میٹرو کے اسٹیشن پر رُک گئے۔ یہاں زمین دوز سیڑھیوں پر بہت بھیڑ تھی۔ مسافروں کا اضافی ہجوم نظر آ رہا تھا۔ لوگ یہاں وہاں بیٹھے اور کھڑے بیزاری کا اظہار کر رہے تھے۔ ارم نے ایک پولیس والے سے پوچھا اس نے بتایا۔ "کوئی ایمرجنسی ہے اس لیے سروس کچھ دیر کے لیے معطل ہے۔"

غالباً کوئی بم وغیرہ کی افواہ تھی۔ اس طرح کی افواہیں گردش کرتی ہی رہتی تھیں۔ یقیناً ہادی اور حجاب کو بھی پتا چل گیا کہ وہ ٹرین پر نہیں بیٹھ سکیں گے۔ وہ دس پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے اور سڑک کے ساتھ ساتھ پیدل ہی ایک طرف روانہ ہو گئے۔ سامنے ہی ایک کافی شاپ نظر آ رہی تھی۔ وہ اس میں گھس گئے۔ یہ صورت حال ارم کے لیے زیادہ موزوں تھی۔

اس نے اپنا فون نکالا۔ نمبر پریس کیا۔ "ہیلو جلال! کہاں ہیں آپ؟"

"سٹور پر...... کیا خیریت ہے؟"

"میرے خیال میں ہوٹل واسکو ڈے آپ کے سٹور سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

"ہوٹل واسکو ڈے...... ہاں...... زیادہ دور نہیں ہے لیکن کیا کہنا چاہ رہی ہو؟"

"پلیز آپ یہاں آ جائیں۔ میں ہوٹل کے سامنے موجود ہوں۔ آپ کے لیے ایک بہت ضروری اطلاع ہے۔"

"لیکن......"

"پلیز جلال! ذرا جلدی آ جایئے۔"

"اچھا...... ٹھیک ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔"

ارم وہاں فٹ پاتھ پر ٹہلتی رہی۔ اس کی یونیورسٹی کی ایک دوست روبی بھی گزرتے ہوئے وہاں رُک گئی۔ دونوں باتیں کرنے لگیں۔ ارم نے اسے بتایا کہ اس کی باجی کے جیٹھ جی اسے پک کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔ وہ ان کا انتظار کر رہی ہے۔ اسی دوران میں جلال کی ہمر گاڑی دکھائی دے گئی۔ اس نے ارم کو دیکھ لیا تھا۔ ارم کی دوست بھی خدا حافظ کہتے ہوئے آگے نکل گئی۔ جلال نے گاڑی پارکنگ لاٹ میں لگائی اور سیدھا ارم کی طرف آیا۔ "کیا ہے ارم؟" اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔

"آپ کی بیگم۔"

"کیا ہوا ہے؟"

"وہ کافی دنوں سے آپ کے شاعر مہمان کے ساتھ مل رہی ہے۔ خفیہ ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔" ارم نے دھماکہ خیز انکشاف کیا۔

"کیا اول فول بول رہی ہو؟" جلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سیاہ داڑھی کے بال جیسے کھڑے ہو گئے تھے۔

"پورا ثبوت مل گیا ہے، اس کے بعد ہی آپ کو بتایا ہے۔ وہ سامنے کافی شاپ میں بیٹھے ہیں دونوں جا کر دیکھ لیں۔ میں یہیں کھڑی ہوں۔ بلکہ میں ہوٹل کی لابی میں جا کر بیٹھتی ہوں۔"

جلال کے چہرے پر ہیجان کی کیفیت تھی۔ وہ عجیب سے انداز سے ارم کو دیکھتا ہوا کافی شاپ کی طرف بڑھا۔ اس نے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے سڑک کراس کی۔ پہلے تو لگا کہ وہ دندناتا ہوا اندھا دھند اندر داخل ہو جائے گا لیکن پھر اس نے خود کو ذرا سنبھالا۔ شیروانی کا کالر درست کیا اور متوازن قدموں سے کافی ہاؤس میں داخل ہوا۔ یہاں ہر طرف کافی کی مہک تھی۔ ہلکا میوزک بج رہا تھا۔ اس نے ہال میں نظر دوڑائی اور فوراً ہادی اور حجاب کو پہچان لیا۔ وہ چوکور میز کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ہادی کسی بات پر ہنس رہا تھا۔ جلال کی رگوں میں آگ سی بھر گئی۔ بہرحال اس نے خود کو نارمل رکھا۔ دھیمے قدموں سے وہ ان کی میز تک پہنچا۔ حجاب نے اسے دیکھا اور اس کی آنکھوں میں ہراس کی یلغار نظر آئی۔ دوسری طرف ہادی بھی بھونچکا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پر وہ بوکھلا کر اُٹھا۔

"آیئے...... آیئے جلال صاحب بیٹھیے۔"

وہ خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہادی بولا۔ "در...... دراصل میں پہلے سے یہاں موجود تھا۔ حجاب صاحبہ شاپنگ کرتی ہوئی آئی ہیں۔ ذرا فریش ہونے کے لیے یہاں آ گئیں۔ میں نے دیکھ لیا اور ان کو انوائٹ کر لیا۔"

''شاپنگ ہوگئی حجاب؟'' جلال نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''جج...... جی...... تھوڑی بہت...... ابھی امی کی دوائیاں لینی ہیں۔ ایک دوائی تو ملی ہی نہیں رہی۔'' گود میں امی کے ہاتھ لرز رہے تھے۔

''اگر تم یہاں بیٹھنا چاہو تو ٹھیک ہے ورنہ میں میڈیسن اسٹریٹ کی طرف ہی جارہا تھا۔ وہاں سے دوا لے لینا اور کہو گی تو میں گھر بھی چھوڑ آؤں گا۔''

''ٹھ...... ٹھیک ہے، جیسا آپ کہیں۔''

اسی دوران میں ہادی کے اشارے پر ویٹر کولڈ کافی لے آیا تھا۔ کافی کا مگ ختم کرنے میں جلال نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ یہ دورانیہ ایک گمبھیر خاموشی میں گزرا۔ آخر میں جلال نے کافی کے لیے ہادی کا شکریہ ادا کیا اور حجاب کو لے کر وہاں سے نکل آیا۔

O......O......O

ہادی آگ بگولا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ سب گلزاری کا کیا دھرا ہے۔ اس نے معاہدہ توڑا ہے۔ وہ دندناتا ہوا اس بلڈنگ میں داخل ہوا جہاں گلزاری کا اپارٹمنٹ تھا۔ یہ جگہ حجاب کے میکے گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ اب دن کا ایک بج چکا تھا۔ بذریعہ لفٹ ہادی مطلوبہ اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچا۔ اس نے کال بیل دی۔ تیسری چوتھی بیل پر دروازہ کھلا اور ایک دبلی پتلی دراز قد لڑکی نظر آئی۔ وہ خاصی کم عمر تھی۔ بمشکل سترہ اٹھارہ سال کی رہی ہوگی۔ اس کے کندھے پر بیگ تھا اور وہ کہیں جانے کے لیے تیار تھی۔ ''گلزار کہاں ہے؟'' ہادی نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''وہ سورہے ہیں۔ آپ کون؟'' اس نے بھی انگلش میں پوچھا۔

اتنی دیر میں دوسری طرف والے کمرے میں روشنی ہوئی اور ہادی کی نظر گلزار پر پڑی۔ وہ بستر میں تھا۔ بالائی دھڑ عریاں تھا اور سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا نظر آتا تھا۔ بالکل جیسے کسی گوریلے کا جسم ہو۔ ہادی کو دیکھ کر وہ بری طرح چونکا۔ پھر اس نے چادر کے نیچے ہی نیچے اپنے ہاتھوں کو مشکوک حرکات دیں۔ ان سے اندازہ ہوا کہ وہ سرتاپا عریاں ہے اور چڈی وغیرہ پہن رہا ہے۔ تب وہ لپک کر بستر سے باہر آیا۔ اس نے شرٹ پہنی تھی۔ لڑکی نے سوالیہ نظروں سے گلزار کی طرف دیکھا۔ گلزار نے اطالوی میں اس سے کچھ کہا۔ یقیناً جانے کے لیے ہی کہا تھا۔ وہ مسکرائی اور ہاتھ ہلاتی باہر نکل گئی۔ چھوٹے قد کے گلزاری کے مقابلے میں وہ کافی لمبی تھی۔

ہادی کے تاثرات دیکھ کر گلزاری کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ ''گلزاری! تم نے کیوں کیا ایسا؟'' ہادی نے پرطیش لہجے میں پوچھا۔

''مم...... میں سمجھا نہیں۔''

ہادی نے اس کا گلا پکڑ لیا اور دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا...... میں نے کہا تھا۔''

''مگر میں نے کیا کیا ہے؟'' وہ کراہا۔

''وہی جو تم جیسے لالچی کتے سے امید تھی۔ تم نے ارم کو اور حجاب کے خاوند کو بتا دیا ہے سب کچھ۔ تم کسی انسان کی نہیں، یہودی کی اولاد لگتے ہو مجھے۔''

''آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے آپ سے جو کمٹمنٹ کی تھی، اس پر قائم ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس سے بڑھ کر بھی آپ کے لیے کچھ کیا ہے۔ آپ الٹا مجھے ہی لتاڑ رہے ہیں۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے کسی کو ایک لفظ نہیں بتایا۔''

''پھر یہ سب کیسے ہوا ہے؟ ابھی ایک گھنٹہ پہلے حجاب کے شوہر نے ہمارا پیچھا کیا۔ ہم ایک کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے۔ وہ وہاں پہنچ گیا۔''

''میں اس معاملے میں بالکل بے قصور ہوں ہادی صاحب! اگر کچھ ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری۔''

''ثبوت تو اب ڈپٹی ہاشم ہی حاصل کرے گا تم سے۔ میں سمجھ گیا ہوں تمہیں اچھی طرح۔ تم لاتوں کے بھوت ہو۔ مجھ سے رقم لے کر یہاں لڑکیوں سے عیاشی کررہے ہو اور ساتھ ساتھ میری جڑیں بھی کھود رہے ہو۔''

کچھ دیر میں گلزاری منت سماجت پر اتر آیا۔ اس نے ہادی کو دماغ ٹھنڈا رکھنے کے لیے کہا اور یقین دلایا کہ اس معاملے میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ ہادی کوئی ایسا چہرہ شناس تو نہیں تھا لیکن لہجے کے اتار چڑھاؤ اور تاثرات سے سچ جھوٹ کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ دھیرے دھیرے اسے اندازہ ہونے لگا کہ گلزاری کم از کم اس معاملے میں سچ ہی بول رہا ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ جلال الدین کافی ہاؤس میں کیسے آ دھمکا۔ یہ بات تو ماننے والی نہیں تھی کہ ایسا اتفاق کے تحت ہوا۔ کیا کسی اور ذریعے سے اسے خبر ہو گئی تھی کہ حجاب نقاب پہن کر ہوٹل واسکوڈے میں آتی جاتی ہے۔

ہادی کے اندر شدید تفکر کی کیفیت تھی۔ اسے جلال کی سخت مزاجی اچھی طرح معلوم ہو چکی تھی۔ وہ جس طرح حجاب کو کافی ہاؤس سے لے کر گیا تھا وہ بھی اندیشوں کو ابھارتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کس طرح پیش آئے گا؟ یہ بات کہاں تک چلے گی؟ اس کو سینٹا حجاب کے لیے کس طرح ممکن ہوگا؟ ایسے ان گنت سوال ہادی کے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔

گلزار نے اب پورا لباس پہن لیا تھا۔ اس نے ہادی کو کولڈ ڈرنک پیش کیا۔ اس کی پیشانی پر بھی لکیریں تھیں اور وہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ حجاب کے شوہر تک یہ بات کس طرح پہنچی ہے۔

ہادی نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تم نے اپنی کمٹمنٹ سے بڑھ کر بھی کچھ کیا ہے۔ اس سے کیا مطلب ہے؟''

گلزار کی آنکھوں میں ایک بار پھر عیاری کی چمک نمودار ہوئی۔ دبا دبا جوش بھی تھا۔ بولا ''میں آج کسی وقت آپ کو فون کرنے والا تھا لیکن آپ خود ہی آ گئے اور آتے ہی اس طرح کہ دل ہی توڑ کر رکھ دیا۔''

''دل تو تمہارا پھر بھی جڑ جائے گا لیکن اگر حجاب کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو میں خود کو بھی معاف نہیں کر سکوں گا۔ اب بتاؤ تم کیا بتانے جارہے تھے؟''

''دیکھیں ہادی صاحب! ہر بندے کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ارم کی بھی ضرور ہوگی۔

میں آج کل اسی کی کھوج میں لگا ہوا ہوں۔ ایک تھوڑا سا اشارہ تو ملا ہے مجھے۔"

"مثلاً کیا؟"

"یونیورسٹی کے جس کیمپس سے ارم نے ایف آئی اے کیا تھا وہاں کی ٹک شاپ کے مالک سے میری جان پہچان ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ ارم تین چار بار ایک اٹالین لڑکے کے ساتھ وہاں آئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی سیریس جھگڑا چل رہا ہے۔ وہ بہت بولتے تھے ایک مرتبہ ارم فرش پر ایک پلیٹ پٹخ کر باہر بھی نکل گئی تھی۔ میں اسی معاملے کی ٹوہ لگا رہا ہوں۔"

ہادی نے گلزار کی عیار آنکھوں میں دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ گلزار جو کچھ بتا رہا ہے اس سے زیادہ جانتا ہے۔ مگر وہ اپنے لفظوں کی قیمت لگانے والا بندہ تھا۔ ہادی کے لیے یہ لالچی شخص بہت فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا مگر شرط یہی تھی کہ اس کی بیٹری چارج رکھنے کے لیے اسے پورا بلکہ پورے سے بھی زیادہ کرنٹ ملتا رہے۔

ہادی کی جیب میں کچھ رقم موجود تھی۔ اس نے کل ہی قریباً پانچ ہزار یورو شیخو صاحب سے بذریعہ منگوائے تھے۔ اس نے بلاتوقف قریباً دو ہزار یورو گلزاری کی جیب میں منتقل کر دیئے۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ اس سے پہلے وہ ارم سے ترلے منت کے ساتھ دس سو یورو حاصل کرتا تھا۔

گلزاری کا چہرہ جوش سے تمتما گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ صرف ایڈوانس ہے۔ کارآمد اطلاع دینے پر اسے بڑی ملے گی اور وہ کافی بڑے اور گودے سے بھرپور ہوگی۔

اس نے ہادی سے کہا۔ "آپ بے فکر رہیں۔ ٹک شاپ والے سے اٹالین لڑکے کا اتا پتا تو مجھے معلوم ہو گیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے ایک دو دن میں آپ کو کوئی اہم اطلاع دے سکوں گا۔"

ہادی نے کہا۔ "اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ سارا معاملہ اب تیزی سے بگاڑ کی طرف ہے۔ مجھے حجاب کی طرف سے بہت زیادہ فکر ہے۔ وہ بے قصور ہے پھر بھی سخت مصیبت میں پھنس سکتی ہے۔"

O……❖……O

گاڑی روم کی بھری پڑی سڑکوں پر چلتی جا رہی تھی۔ جلال نے اپنے ہاتھ مضبوطی سے اسٹیئرنگ وہیل پر جما رکھے تھے۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ حجاب بھی اس کے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی۔ اگر وہ کچھ کہتا۔ کچھ بولتا تو شاید یہ صورتِ حال اتنی بوجھل اور تناؤ بھری نہ ہوتی۔ لیکن اس نے تو کافی ہاؤس سے اٹھنے کے بعد ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ گاڑی حجاب کی امی کے گھر پہنچنے والی تھی جلال نے بس اتنا کہا۔

"ان سے کہنا کہ میں گھر واپس جا رہی ہوں۔ ابھی اسی وقت اور ان کو کسی پریشانی کا پتا نہیں چلنا چاہیے۔"

حجاب اندر سے لرز رہی تھی۔ اس نے وہی کچھ کیا جو جلال نے کہا تھا۔ حجاب اور جلال بظاہر نارمل موڈ میں ہی نظر آئے۔ جلال نے حجاب کے ابو سے بس اتنا کہا۔ "گھر میں کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ حب کا جانا ضروری ہے۔ میں آپ ہی کی طرف آ رہا تھا۔ یہ راستے میں مل گئی۔"

اس گھر میں اتنی مجال کس کی تھی کہ جلال کی رائے سے اختلاف کرتا۔ کچھ ہی دیر بعد حجاب ایک بار پھر جلال کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی جا رہی تھی۔ وہ جلال سے بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن اس کی خاموشی اتنی گمبھیر تھی کہ حجاب کو ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ گھر کو جانے والے راستے پر گاڑی چلاتے چلاتے ایک جگہ جلال رُک گیا۔ وہ جیسے تذبذب میں تھا۔ پھر اچانک اس نے گاڑی کو گھر کی طرف موڑنے کے بجائے دائیں جانب موڑ دیا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" حب بمشکل کہہ پائی۔

"درس والے گھر۔" جلال نے مختصر جواب دیا۔

درس والے گھر کا نام درس والا گھر پتا نہیں کیوں پڑ گیا تھا۔ روم ویسٹ کے نسبتاً کشادہ اور مضافاتی علاقے میں یہ ڈھائی تین کینال کی کوٹھی تھی۔ پرانی تعمیر تھی لیکن جگہ اندر سے بھی سنوری تھی۔ یورپ کی اکثر عمارتیں ایسی ہی ہوتی تھیں۔ باہر سے ان کی قدامت کو برقرار رکھا جاتا ہے لیکن اندر سے جدید بنا دیا جاتا ہے۔ جب ابھی جلال الدین اور ظہیر الدین کا کاروبار پوری طرح چمکا نہیں تھا وہ یہیں رہائش پذیر تھے۔ بعد ازاں انہوں نے فیشن ایبل علاقے میں شاندار گھر بنوا لیا تھا۔ اس پرانی کوٹھی میں کبھی کبھی جلال کے پیرِ طریقت صاحب محفل جمایا کرتے تھے شاید اسی لیے اسے درس والی کوٹھی کہا جانے لگا تھا۔ اب یہ محفل والا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔

حجاب کو یہ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اسے درس والی کوٹھی کیوں لیے جا رہا ہے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ کوٹھی

میں تھے۔ کوٹھی رہائش کے لیے ہر وقت تیار رہتی تھی۔ جلال اور ظہیر کے کاروباری مہمان بھی یہاں آ کر ٹھہر جاتے تھے۔ چوکیدار، خانساماں، کام کاج والی ملازمہ سب کچھ یہاں موجود تھا۔ پچھلے سال جب نئے گھر کے رنگ و روغن ہو رہے تھے جلال اور حجاب پندرہ بیس روز یہاں رہے تھے۔ لہٰذا حجاب کو کچھ اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔

انہوں نے بیڈ روم میں چائے پی۔ چائے کے فوراً بعد جلال اصل موضوع پر آ گیا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

حجاب کے دل میں چونکہ کوئی چور نہیں تھا لہٰذا اس کے لہجے میں توانائی آ گئی۔ اس نے کہا۔ "جلال! میں آپ کے سامنے زیادہ وضاحتیں پیش نہیں کروں گی۔ ایک مرتبہ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ اگر عورت پورے پردے میں ہو اور اس کا دل بھی پردے میں ہو تو پھر کسی کے ساتھ ملنے جلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ مجھ پر پورا بھروسہ رکھیں۔ میں پردے میں تھی اور میرا دل اس سے بھی زیادہ پردے میں تھا۔"

"کیسے ملاقات ہوئی؟"

"بس اتفاقاً ہی سمجھ لیجیے۔ سرِ راہ" وہ بولی۔ "ہادی صاحب روم میں گھومنا پھرنا چاہ رہے تھے۔ ... وزٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ میں بھی آرٹیکل لکھ رہی ہوں۔ ہم دو تین جگہوں پر اکٹھے گئے۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں یہ ایسے ہی تھا جیسے میں ماریہ کے ساتھ گھومنے نکلوں یا فیصل کے ساتھ نکلوں۔"

"لیکن...... تمہیں مجھ سے اجازت تو لینی چاہیے تھی۔"

"یہ میری غلطی ہے۔ میں اس کے لیے سوری کہتی ہوں۔ دراصل آپ کا موڈ اتنا خراب تھا کہ......"

"اچھا...... چلو چھوڑو ان باتوں کو۔" جلال نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

جب وہ اس طرح بات کرتے کرتے اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ لیتا تھا تو اس کا یہی مطلب ہوتا تھا کہ وہ کوئی خاص بات کہنے جا رہا ہے۔ وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ "تو پھر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے حجاب؟"

وہ توقف سے بولی۔ "م...... میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے جلال؟"

"حجاب! مجھے ہاں یا نہ میں جواب چاہیے۔ تم ہنسی خوشی یہ کام کر رہی ہو یا نہیں؟"

حجاب کا سارا جسم پسینے میں نہا گیا۔ وہ بالکل بے رحم ہو گیا تھا۔ وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "جلال! آپ مجھے اس طرح فیصلے کی سولی پر کیوں لٹکا رہے ہیں مجھ پر ترس کھائیے۔"

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو حجاب! تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کام ہونا ہے اور ہر صورت ہونا ہے۔ ہر کام کا ایک شیڈول ہوتا ہے۔ میں اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ تم نے ہاں یا نہ میں جواب دے کر بتانا ہے کہ یہ کام ہنسی خوشی ہو گا یا رو پیٹ کر۔"

خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا۔ وہ یوں سانس لے رہی تھی جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو۔ آخر روہانسی ہو کر بولی۔ "جلال! میں اپنے دل کا کیا کروں۔ یہ آپ کو کسی کے ساتھ بانٹنے کے لیے تیار نہیں۔ میں آپ کا ہر ستم سہہ سکتی ہوں پر یہ نہیں...... یہ نہیں جلال۔"

"میں تمہیں ہر سہولت دینے کو تیار ہوں۔ تمہاری من چاہی پراپرٹی تمہارے نام کر سکتا ہوں۔ یا جو تم چاہو......"

"نہیں جلال نہیں۔" وہ کرب میں ڈوب کر بولی۔

"دیکھو...... تم دنیا کی کوئی پہلی عورت نہیں ہو جس کا شوہر دوسری شادی کر رہا ہے۔ ایسا ہوتا آیا ہے۔ ہمارے خاندان میں، تمہارے خاندان میں۔ ہمارے اردگرد ایسی بہت سی مثالیں ہیں جب دو بلکہ تین بیویوں والی فیملی نے بھی بڑی خوشگوار زندگی گزاری ہے۔"

"اگر ایسی پانچ مثالیں ہوں گی تو دوسری طرف پچاس مثالیں بہت بُری زندگی کی بھی ہوں گی لیکن مجھے کسی اور سے کیا لینا ہے جلال! میں تو اپنی اور آپ کی بات کر رہی ہوں۔ میں آپ کو تقسیم نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر؟"

وہ ایک جان گسل وقفے کے بعد بولی۔ "اگر کوئی اور راستہ نہیں تو مجھے آزاد کر دیجیے۔"

ایک زوردار تھپڑ حجاب کے گال پر پڑا اور اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچ گئے۔ کان میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ اس نے دہشت زدہ ہو کر جلال کی طرف دیکھا۔ تب دوسرا تھپڑ دوسرے رُخسار پر پڑا۔ وہ چکرا کر گری۔ جلال نے اس کی پیٹھ پر ٹھوکریں رسید کیں۔ اسے لگا جیسے کمر چٹخ کر رہ گئی ہے۔ "جلال...... جلال" وہ پکارتی جا رہی تھی۔ اس نے خود کو گٹھڑی سا بنا لیا اور اپنے جسم کے نازک حصوں کو اس کی ٹھوکروں سے بچانے کی کوشش کرنے لگی۔

اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر نہایت بیدردی سے کھینچا اور اُٹھا کر صوفے پر پٹخ دیا۔ "اب بھی یہی بکواس کر کہ تیری نیت میں کوئی فتور نہیں۔ وہ تیرا بھائی ہے جس کے ساتھ نقاب چڑھا کر گھومتی پھرتی ہے۔ تُو نے سچ نہیں بولا لیکن تیرے ارادوں نے سچ بول دیا ہے۔ تجھے آزادی چاہیے۔ طلاق چاہیے تاکہ تُو کوئی نیا سفر شروع کر سکے۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ سب سمجھتا ہوں، سب جانتا ہوں۔"

"خدا کے لیے جلال! خدا کے لیے...... مجھ پر ایسا الزام نہ لگائیں۔" وہ صوفے سے اُٹھ کر اس کے پاؤں پر گر پڑی۔

اس نے ایک غصیلے جھٹکے سے اپنے پاؤں پیچھے ہٹائے اور دو تین قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی۔ ہچکیوں سے روتی رہی۔

وہ فیصلہ کن، پاٹ دار آواز میں بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اگر تُو آزادی چاہتی ہے تو میں تجھے آزادی دینے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے بیوی چاہیے، قیدی یا کنیز نہیں۔ تیرے لیے سارے دروازے کھلے ہیں اور راستے بھی۔"

وہ مڑا اور پاؤں پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس کی ہمر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سن رہی تھی۔ وہ جا رہا تھا۔ وہ اس کے لیے بظاہر دروازے کھلے چھوڑ گیا تھا اور سارے راستے بھی لیکن وہ جانتی تھی کہ جو نظر آ رہا ہے وہ ہے نہیں۔ سارے دروازے کھلے تھے اور نہ سارے راستے۔ وہ اَن دیکھی زنجیروں میں بندھی ہوئی تھی۔ اور یہ معاشرتی نہیں، معاشی زنجیریں تھیں۔ حجاب کے ابو ایک بڑے قرضے کے بوجھ تلے دبے تھے۔ محتاط اندازے کے مطابق قریباً ایک لاکھ

نوے ہزار یورو اور قرض خواہ کون تھا؟ قرض خواہ ان کا داماد تھا۔ جلال الدین تھا۔ وہ سکتہ زدہ بیٹھی تھی۔

وہ ساری رات حجاب نے سوتے جاگتے میں گزار دی۔ توقع کے عین مطابق جلال واپس نہیں آیا تھا۔ خالہ ناہید اس کی ضروریات کے لیے اس کے اردگرد موجود رہی۔ حجاب کے ذہن میں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ جلال کو وہاں کافی ہاؤس میں پہنچانے والا کون تھا؟ ہادی نے تو بڑے وثوق کے ساتھ کہا تھا کہ ارم والی سازش اس نے ناکام بنا دی ہے۔ یہ بات بھی ہرگز ماننے والی نہیں تھی کہ یہ ایک اتفاق تھا۔

حجاب کا دل بالکل صاف تھا اس لیے اسے کوئی شرمندگی نہیں تھی لیکن جلال نے جو رد عمل دکھایا تھا اس نے اس کی روح تک کو شرمسار کر دیا تھا۔ اس نے دو طرح کا رد عمل دکھایا تھا۔ ایک تو اسے مارا پیٹا تھا، دوسرے فوری طور پر اس سے ہاں یا نہ میں جواب مانگ لیا تھا۔ یہ پوائنٹ آف نو ریٹرن والی بات تھی۔ حجاب کو کروٹ لینے سے تکلیف ہو رہی تھی۔ جلال کی بے رحم ٹھوکروں کے نتیجے میں اس کی پوری کمر دکھ رہی تھی۔ شادی سے پہلے یہ کیسا جسم تھا، جس کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے تھے۔ کتنی جلدی ختم ہوا تھا یہ سب کچھ۔ حالانکہ وہ دبلی تھی بلکہ شاید جسم کی موزونیت پہلے سے بہتر ہو چکی تھی۔ وہ سوچتی رہی اور اس کے سینے میں دھواں بھرتا رہا۔ گاڑھا سیاہ دھواں۔ اس دھوئیں میں چنگاری تھی۔ بلکہ اب یہ ایک نہیں کئی چنگاریاں تھیں۔ آگ نے جب شعلے کا روپ دھارنا ہوتا ہے تو چنگاریاں بڑھ جاتی ہیں۔ زیادہ پُر حرارت ہو جاتی ہیں۔ وہ پامال ہو رہی تھی، بالکل دیوار کے ساتھ لگائی جا رہی تھی۔ اس کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا جا رہا تھا۔ اب ایک ہی راستہ تھا علیحدگی کا لیکن کیا والد یہ راستہ اختیار کرنے دے گا؟

وہ اپنے ماں باپ کو کوئی تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی مگر اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اسے صاف پتا تھا کہ اگر وہ اسی طرح جیتی رہی جس طرح جلال چاہ رہا ہے تو وہ مر جائے گی۔ بہت جلد اور بڑی اذیت سے۔

اس نے شام کو ہی پروگرام بنا لیا تھا کہ گھر چلی جائے، امی ابو کے پاس۔ لیکن پھر اس نے آئینہ دیکھا تھا۔ چہرے پر طمانچوں کے سرخ نشان تھے۔ وہ ہمیشہ ان نشانوں کو چھپاتی رہی تھی۔ اب بھی چھپانا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے رات یہیں درس والی کوٹھی میں گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔

صبح سویرے وہ کراہتی ہوئی اٹھی۔ ایک بار پھر آئینے میں چہرے کا معائنہ کیا۔ کئی بار رخساروں پر پانی کے چھینٹے مارے۔ ابھی اسے کچھ اور انتظار کرنا تھا۔ اسے پتا تھا کہ امی ابو پریشان ہوں گے۔ جلال جس طرح آ کر اسے یہاں لے آیا تھا وہ ضرور چونکے ہوں گے۔ اس نے سوچا انہیں کال کر لے۔ اس نے شولڈر بیگ میں سے سیل فون نکالا مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ اسے پتا تھا کہ وہ فون کر کے انہیں ابھی سے پریشان کر دے گی۔ پھر اسے ان کالز کا خیال آیا جو ہادی اور اس کے درمیان ہوتی رہی تھیں۔ اس نے ان کالز کا ریکارڈ Delete کیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ہادی کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے جھنجھلاہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ کیوں جلدی واپس نہیں چلا گیا تھا۔ کیوں اس کے اردگرد منڈلاتا رہا تھا۔ وہ جانتا بھی تھا کہ اس کے حالات کتنے خراب ہیں پھر بھی اس سے ملنے پر اصرار کرتا رہا اور وہ بھی اس کے اصرار کی مزاحمت نہ کر سکی۔ اسے ہادی پر غصہ آنے لگا۔ اور اس سے زیادہ اپنے آپ

پر۔ شاید یہ کافی ہاؤس والا واقعہ نہ ہوتا تو جلال اسے کچھ مزید مہلت دے دیتا۔ یوں اس سے ہاں یا نہ میں فوری جواب نہ مانگتا۔

لیکن ایسا ہو بھی جاتا تو کیا ہوتا؟ کیا وہ اس صورت حال سے بچ جاتی؟ نہیں یہ تو ممکن نہیں تھا۔ آج نہیں تو کل یہ ہونا ہی تھا۔ وہ طریقہ کار طے کرنے لگی کہ امی ابو اور بھائی کو کس طرح اس صورت حال سے آگاہ کرے۔ اب کچھ بھی چھپانا ممکن نہیں رہا تھا۔

شام سے پہلے ہی وہ امی کے گھر پہنچ گئی۔ فیصل کا چہرہ دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ''کیا ہوا فیصل؟''

فیصل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر حجاب کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''امی کی طبیعت خراب ہے۔ ابھی انجکشن لگایا ہے۔ سو رہی ہیں۔''

حجاب نے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا اور اس کا دل ہول گیا۔ وہ سیدھی لیٹی تھیں۔ رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ منہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس نے ہولے سے دروازہ بند کر دیا۔ فیصل اسے اسٹڈی کی طرف لے آیا۔ خلاف توقع ابو وہاں موجود نہیں تھے۔ چائے کے تین چار خالی کپ پڑے تھے۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے بہت سے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔ ''ابو کہاں ہیں؟'' حجاب نے پوچھا۔

''دوپہر سے نکلے ہوئے ہیں بتا کر نہیں گئے۔''

''تم نے پوچھا نہیں؟''

''وہ بتاتے ہی کب ہیں باجی! بتا دیں تو اس طرح کے مسئلے بھی نہ ہوں۔ ہر بات بس اپنے پر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''کیا مطلب فیصل؟''

''چھوڑیں آپ بھی پریشان ہوں گی۔ پہلے ہی لگ رہی ہیں۔''

حجاب نے اسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔ ''فیصل! مجھے صاف صاف بتاؤ کیا بات ہے؟''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''صبح نو دس بجے ایک فون آیا تھا۔ اس کے بعد بالکل گم صم ہو گئے۔ مسلسل سگریٹ پیتے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد غالباً وہی فون دوبارہ آیا۔ اس بار دو چار باتیں میں نے بھی سنیں۔ یہ جلال بھائی کے منیجر قادر صاحب کا فون تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ انہوں نے ابو سے قسط کے بارے میں کہا ہے اور زور دے کر کہا ہے۔''

حجاب کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یہی اندیشے تھے جو حجاب کے لیے سوہان روح بنے رہتے تھے۔ چھ ماہ پہلے قرض کی ادائیگی کے لیے حجاب کے ابو اور جلال میں کچھ طے ہوا تھا۔ اس کے مطابق جلال نے قرض کی ادائیگی قسطوں میں کر دی تھی۔ وہ اسے آسان قسطیں کہتا تھا لیکن وہ اتنی آسان بھی نہیں تھیں۔ ایک تہائی رقم حجاب کے گھر والوں کو چار ماہ بعد ادا کرنا تھی۔ باقی چار اقساط میں۔ گجرات میں ابو کی تھوڑی سی وراثتی زمین موجود تھی۔ وہ اسے بیچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امید تھی کہ وہ دو تین ماہ میں بک جائے گی مگر ایسا ہو نہیں سکا تھا۔ سستا بیچنے کی کوشش بھی

ابھی تک کامیاب نہیں ہوئی تھی اور اب تقریباً تین ماہ اوپر ہو چکے تھے۔

صورتِ حال جتنی گمبھیر تھی اتنی ہی سادہ تھی۔ کل دوپہر جلال اور حجاب میں جھگڑا ہوا تھا اور آج منیجر قادر کا فون آ گیا تھا۔ سب کچھ واضح تھا۔

حجاب بے دم سی ہو کر بیٹھ گئی۔ فیصل بھی کرسی گھسیٹ کر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آزردہ لہجے میں بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ابو ایک قرضہ چکانے کے لیے مزید قرضہ اُٹھانے کی فکر میں ہیں۔ میں نے انہیں منع بھی کیا تھا۔ کچھ بھی ہے..... جلال بھائی پھر بھی اپنے تو ہیں کہہ سن کر ان سے مزید مہلت لی جا سکتی ہے۔ یہ بینکوں والے اور دوسرے سود خور تو اللہ معاف کرے ہتھکڑیاں لے کر پہنچ جاتے ہیں۔"

فیصل کہہ رہا تھا کہ کچھ بھی ہے جلال بھائی اپنے تو ہیں وہ اسے کیا بتاتی۔ وہ کتنے اچھے ہیں۔ ہتھکڑی تو یہاں بھی موجود تھا۔ ہتھکڑیاں تو یہاں بھی کھڑکھڑائی جا رہی تھیں۔ اس کے آنسو جیسے اندر ہی اندر گرنے لگے۔

فیصل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "جلال بھائی سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہے آج کل؟"

"نہیں ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔"

"چلیں شکر ہے۔ ورنہ کل آپ دونوں جس طرح آناً فاناً آئے اور چلے گئے مجھے ڈر تھا کہ پھر کوئی بات نہ ہوگئی ہو۔"

اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے حجاب کی امی کے کراہنے کی مدھم آواز آئی۔ دونوں بہن بھائی تڑپ کر اُٹھے اور کمرے کی طرف گئے۔ تاہم حجاب اندر جاتے جاتے رُک گئی۔ دروازے پر کھڑی رہی۔ فیصل اندر گیا۔ والدہ انجکشن کے زیرِ اثر گہری غنودگی میں تھیں اور پانی مانگ رہی تھیں۔ فیصل نے ان کا سر اونچا کر کے انہیں دوا پلایا اور ان کا سر دبانے لگا۔ حجاب نیم تاریکی میں کھڑی ادھ کھلے دروازے میں سے اندر جھانکتی رہی۔ وہ جانتی اگر وہ اندر گئی تو امی کی بے چینی و پریشانی میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوگا۔

کچھ دیر بعد جب وہ دوبارہ سو گئیں تو فیصل اور حجاب پھر اسٹڈی میں آ بیٹھے۔ فیصل نے بتایا۔ "ابو کی پریشانی کا جتنا اثر امی لیتی ہیں آپ کو پتا ہی ہے۔ انہیں اس بات کی خبر تو نہیں ہوئی کہ قادر کا فون آیا تھا لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی کہ یہ قسط والا چکر ہی ہے۔ پہلے ابو سے پوچھتی رہیں انہوں کچھ نہیں بتایا اور ٹال دیا۔ پھر میرے پاس آ گئیں۔ ابو کی پریشانی کی وجہ جاننے کی کوشش کرتی رہیں اسی دوران میں ان کے ہونٹ بالکل خشک ہو گئے اور سر پکڑ کر ایک طرف جھک گئیں۔ انہیں چکر سا آ گیا تھا۔ میں نے فوراً ڈاکٹر انکل عطا کو فون کیا وہ دس منٹ میں پہنچ گئے۔ اس دوران میں میں نے انہیں پینے والی دوا دے دی تھی۔ انکل نے انجکشن وغیرہ دے دیا ہے۔ متعلقہ ڈاکٹر سے ٹائم بھی لے لیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ امی کے تفصیلی معائنے کی ضرورت ہے۔"

"تفصیلی معائنہ کیوں؟" حجاب نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

"بس..... وہ بہتر..... سمجھتے ہوں گے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "فیصل! تم کچھ چھپا تو نہیں رہے ہو۔ پلیز ایسا مت کرو۔ مجھے بتاؤ۔ کہیں وہ بے ہوش تو نہیں ہو گئیں؟"

فیصل کے دبلے پتلے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ پہلے تو چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے تم آنکھوں کے ساتھ بتایا کہ ایسا ہوا ہے۔ وہ چار پانچ منٹ کے لیے Sence Less ہو گئی تھیں۔

حجاب کا دل ڈوبنے لگا۔ آپریشن کے بعد ڈاکٹرز نے یہی کہا تھا کہ ان پر پھر سے بے ہوشی کا طاری ہونا اچھی علامت نہیں ہوگی۔ اور اگر ایسا ہوا تو انہیں فوری طور پر ہسپتال سے رجوع کرنا چاہیے۔

فیصل نے حجاب کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "باجی! آپ ٹینشن نہ لیں۔ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ڈاکٹر انکل کہہ رہے تھے کہ میڈیکیشن سے ہی صورتِ حال بہتر ہو جائے گی۔ بس ان کو خوش رہنا چاہیے اور ذہنی دباؤ نہیں لینا چاہیے۔"

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے فیصل۔"

"باجی! آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔ مجھے زیادہ ڈر اسی بات کا تھا کہ کہیں جلال بھائی اور آپ کے درمیان پھر کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔ آپ بس کوشش کر کے اُدھر کے حالات بہتر رکھیں۔ کوئی اچھا موقع دیکھ کر جلال بھائی سے بات بھی کر لیں۔ تین چار ماہ اور مل جائیں تو مجھے یقین ہے کہ گجرات والی زمین کا سودا ہو جائے گا صرف بیعانہ بھی ہو گیا تو بھی تسلی کی بات ہوگی۔ جلال بھائی کو اطمینان ہو جائے گا کہ قسط مل جائے گی۔"

حجاب صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔ فیصل کو کچھ پتا نہیں تھا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ اس کے اندر سلگنے والی مزاحمت کی چنگاریاں ماند پڑتی جا رہی تھیں۔ توانائی کی جگہ ایک عجیب سی نقاہت رگ و پے میں اُتر رہی تھی۔ شاید وہی نقاہت جو ازل سے عورت کا مقدر رہی ہے۔

فیصل نے کہا۔ "میں جانتا ہوں باجی! وہاں جلال بھائی کے ہاں حالات آپ کے لیے اتنے زیادہ اچھے بھی نہیں لیکن یہ ایسا موقع ہے کہ ہم کسی طرح کا کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ میں جانتا ہوں آپ کی پیشانی پر دُکھ کی ایک شکن آتی ہے تو امی کے دل پر پتا نہیں کتنی شکنیں آ جاتی ہیں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو فیصل! ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔"

"آپ کچھ چھپا تو نہیں رہیں باجی؟"

"نہیں فیصل! سب ٹھیک ہے۔ بس تھوڑی بہت چپقلش تو چلتی ہی رہتی ہے تمہیں پتا ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ بس امی ابو کا دھیان رکھو۔"

اسے لگا کہ فیصل اسے مزید کھوجنا نہیں چاہتا۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ مزید کھوجنے سے کوئی پریشان کن بات سامنے آ جائے گی۔

○.....❖❖.....○

شام سے پہلے حجاب ڈرس والی کوٹھی یعنی پرانے گھر واپس آ گئی۔ اس نے ابو کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ ابو کے سامنے جائے گی تو اس کے خاموش رہنے کے باوجود وہ بہت کچھ محسوس کر لیں گے۔ جیسے

فیصل نے محسوس کیا تھا۔ گھر واپس آتے ہی اس نے ملازمہ نابیدہ سے جلال کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ تو نہیں آئے۔ ملازم اور ڈرائیور آئے تھے اور کچن کا بہت سارا سامان دے گئے ہیں۔ یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیا جائے۔

جب حجاب ملازمہ نابیدہ سے بات کر رہی تھی۔ اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اسکرین پر وہی ہادی کا نمبر تھا۔ اس نمبر سے اور ہادی سے اس کی بیزاری عروج پر پہنچ گئی۔ وہ کیوں چمٹ گیا تھا اس کی جان سے؟ کیوں اس کی زندگی کو مزید زہر آلود کر رہا تھا۔ اس نے فون بند کر دیا اور پھر اس کی سم نکال کر کوڑے دان میں پھینک دی۔

رات دس گیارہ بجے اس نے فون میں نئی سم ڈالی اور جلال کو فون کیا۔ بیل ہوتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں کی گئی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا (جلال کو پتا بھی تھا کہ یہ اس کا نمبر ہے) اس نے فون صوفے پر پھینک دیا اور تکیے میں سر دے کر آنسو بہانے لگی۔ وہ اپنے حالات پر نوحہ کناں تھی اور خود کو بھی ملامت کر رہی تھی۔ اس نے کیوں کیا ایسا؟ جب اس میں حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی تو کیوں اپنے اندر چٹکنے والی چنگاریوں کو بجھانے کی بجائے مزاحمت کو سر اُبھارنے کا موقع دیا۔ بے شک ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ لیکن یہ کیا ردعمل تھا کہ ویس میں وہ اپنی حدود سے آگے نکل گئی۔ اس نے خود کو ایک آزاد ماڈرن لڑکی کا روپ دیا اور کھلی فضاؤں میں جی بھر کر سانس لینے کا سپنا پالا کیا۔ اور صرف یہی نہیں اسی ردعمل کے نتیجے میں وہ ہادی سے بھی ملتی رہی۔ بے شک یہ ایک صاف ستھرا تعلق تھا۔ رومانیت سے پاک مگر تھا تو غلط اور اس کی بنیاد بھی غلط تھی۔ اس بنیاد میں ماحول سے بغاوت کی بو آ رہی تھی۔

اچانک فون کی بیل ہوئی۔ اس نے لپک کر فون اُٹھایا۔ دوسری طرف جلال ہی تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ جلال کی بھاری بوجھل آواز آئی۔ "کیا بات ہے تم نے فون کیا تھا؟"

"اور آپ نے ریسیو ہی نہیں کیا۔"

"میں...... واش روم میں تھا۔ کیا بات تھی؟"

"مجھے دوسری رات ہے یہاں۔ آپ پلٹ کر آئے ہی نہیں۔ کوئی خبر ہی نہیں لی کہ کس حالت میں ہوں۔"

"میرے آنے سے تمہاری حالت میں کیا سدھار آ سکتا ہے؟"

"اور آپ کے نہ آنے سے کیا سدھار آئے گا؟"

"جو باتیں ہمارے درمیان ہوتی ہیں وہ کئی بار ہو چکی ہیں۔ ان کا تمہیں پتا ہے اور مجھے بھی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ اب ہمارے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوگی۔" وہ بھرائی آواز میں بولی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر وہ بولا۔ "ٹھیک ہے۔ میں ابھی آدھ پون گھنٹے میں آتا ہوں۔" اس کی آواز میں ایک فاتحانہ آہنگ کی جھلک تھی۔ بین السطور وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور یقیناً حجاب بھی۔

اس رات وہ آیا۔ دونوں نے ٹیرس میں اکٹھے چائے پی۔ باغیچے میں تھوڑی دیر چہل قدمی بھی کی۔ بہر حال کسی نازک موضوع پر ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ بیڈ روم میں بھی جلال کا موڈ بہتر ہی رہا۔ دونوں لیٹے تو جلال کی انگلیاں بے ساختہ حجاب کے بالوں میں رینگنے لگیں۔ وہ رات بھر اس کے بہت قریب رہا۔ اس کی محبت میں

جوش اور طلب کی پُر حرارت شدت تھی۔ بہر حال ہمیشہ کی طرح طلب کی اس شدت نے حجاب کی روح کو نہیں چھوا۔ بس اس کے جسم تک محدود رہی۔ اس کے بالوں کی نرمی تک۔ اس کے ہونٹوں اور رخساروں کی گرمی تک، اس کے پیکر کی رعنائی تک۔

جلال کی فیملی میں ناشتہ کافی ہیوی ہوتا تھا۔ بالکل کسی بوفے کی طرح۔ کئی ڈشز ہوتی تھیں۔ حجاب نے بس چند لقمے لینے پر ہی اکتفا کیا۔ جلال کھاتا رہا اور اس سے بھی کھانے کے لیے اصرار کرتا رہا۔ اس نے حجاب کو اس دوا کے بارے میں بھی یاد کرایا جو وہ روزانہ ناشتے سے قبل لیتی تھی۔ اس طرح کی یاد دہانیوں سے وہ حجاب کو باور کرایا کرتا تھا کہ وہ اس کا دھیان رکھتا ہے۔

چائے کا آخری گھونٹ لینے کے بعد وہ بولا۔ "حجاب! میں چاہتا ہوں کہ میں سارے پیسے تمہارے ہاتھ میں دوں۔ کم از کم جیولری اور کپڑوں کی شاپنگ تم خود کرو۔ ارم کے لیے بھی اور اپنے لیے بھی۔ بلکہ میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے نام سے ایک اکاؤنٹ کھلوا دوں۔ بعد میں بھی گھر کے ماہانہ اخراجات تم خود کرو۔ ارم آئے تو گھر میں تمہیں مختار کی حیثیت حاصل ہو۔"

وہ باتیں کرتا رہا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔ دل کے اندر آنسوؤں کا آبشار سا گر رہا تھا۔ ایسی باتیں جلال نے عام حالات میں کہی ہوتیں تو حجاب خود کو آسمان پر اُڑتا ہوا محسوس کرتی لیکن اب یہ باتیں اسے بس زخمی ہی کر رہی تھیں۔

آخر میں وہ بولا۔ "میں تھوڑی دیر میں ڈرائیور کو بھیجوں گا تم اس کے ساتھ گھر چلی جانا۔ امی بھی کئی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے دو چار دن ورس والی کوٹھی میں رہنا چاہ رہی ہے۔"

"میں اب بھی یہی چاہ رہی ہوں جلال! ابھی میرا دل وہاں جانے کو نہیں چاہ رہا کچھ وقت لگے گا مجھے سنبھلنے میں۔"

"لیکن کم از کم امی اور فوزیہ سے تو مل آؤ۔ وہاں سے اپنا کچھ سامان وغیرہ بھی لانا ہے تو لے آؤ۔"

"چلیں ایک دو دن میں چکر لگا لوں گی اگر ہو سکے تو آپ شریفاں کو یہاں بھجوا دیجیے۔ اس کے ہوتے ہوئے مجھے آسانی رہتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اسے بھجوا دیتا ہوں۔ بلکہ تمہارا کچھ سامان بھی بھجوا دیتا ہوں۔ آج تو میلان جانا ہے دو دن کے لیے۔ پرسوں سے شام کے بعد یہیں آ جایا کروں گا۔"

○...◆...○

ہادی، حجاب کی طرف سے بہت پریشان تھا۔ کوشش کے باوجود حجاب سے کسی طرح کا رابطہ نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے گھریلو ملازمہ شریفاں کو بھی فون کیا تھا اس سے بھی اس کے سوا کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ حجاب سسرال میں واپس نہیں آئی ہے۔ شریفاں کی زبانی یہ پتا چلا تھا کہ وہ کسی دوسرے گھر میں ہے جسے پرانا گھر یا ورس والا گھر کہا جاتا ہے۔

اور شاید دو چار روز تک یہاں آ جائے گی۔ شریفاں کے مطابق گھر میں چپکے چپکے ارم کی شادی کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ جلال نے ارم اور اس کی بڑی بہن فوزیہ میں بھی صلح صفائی کرا دی تھی۔ آپا خانم پہلے ہی اس شادی کی خلاف نہیں تھیں۔ انہیں یقین تھا کہ ان کے بیٹے نے جلد یا بدیر دوسری شادی کرنا ہی ہے۔ تو پھر وہ کیوں ایسی لڑکی نہ لے آتیں جو ہر طرح ان کی فرمانبردار اور اطاعت گزار تھی۔

ہادی کو ہرگز معلوم نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ چکی ہے اور جلال نے دوسری شادی کی تیاری شروع کر دی ہے۔ حجاب کا مصیبت زدہ چہرہ رہ رہ کر اس کی نگاہ میں آتا اور وہ جیسے پوری جان سے تڑپ جاتا تھا۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا ہر حال میں اور اس خواہش میں اتنی شدت تھی کہ کسی وقت وہ خود حیران ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی جان کے بدلے میں بھی اس کی پیشانی کی چمک برقرار رکھنا چاہتا تھا اور یہ صرف لفظوں کی بات نہیں تھی۔ وقت پڑنے پر وہ یقیناً ایسا کر بھی سکتا تھا۔ وہ عشق میں گرفتار ہو چکا تھا۔ سر تا پا اس میں ڈوب گیا تھا۔ اسے اپنے جسم سے حجاب کی خوشبو آتی تھی۔ تنہا ہوتے ہوئے بھی اپنے اردگرد اس کی سانسوں کی مہک اور چوڑیوں کی کھنک محسوس کرتا تھا۔

پچھلے تین چار روز میں اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ پھر "ایون ہینز" جائے اور انکل فیاض کے گھر کا چکر لگائے۔ پچھلا تجربہ اسے ابھی بھولا نہیں تھا۔ حجاب بہت تنگ پا ہوئی تھی۔ اپنے مزاج کے برخلاف وہ ہادی سے بہت تلخ ہوئی تھی اور اب تو حالات اور بھی خراب تھے۔ شروع میں اسے اندیشہ تھا کہ شاید جلال اس سے رابطہ کرے اور ان کے درمیان کوئی تلخی ترشی ہو۔ یا وہ خود نہ آئے اور ظہیر وغیرہ کے ذریعے اسے کوئی سخت قسم کی وارننگ دی جائے لیکن ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ مستقبل قریب کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ بہرحال ہادی ایسے خدشات سے گھبرانے والا نہیں تھا۔ وہ ہوٹل واسکوڈے میں ہی تھا اور یہاں اپنا قیام بڑھانے کے بارے میں بھی غور کر رہا تھا۔ اسی کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ اس نے بے تاب نظروں سے اسکرین دیکھی یہ حجاب کا فون نہیں تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے ریسیور کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف لاہور سے شنو صاحب تھے۔ وہ ذرا جوشیلی آواز میں بولے۔ "تمہارا لفافہ مل گیا ہے ہادی! بھئی زبردست تینوں گیت کمال کے ہیں۔ ڈر رہا ہوں کہ کہیں تمہاری گردن میں سریا نہ آ جائے لیکن سچ یہی ہے کہ تینوں گیت دھوم مچانے والے ہیں۔ لگتا ہے کہ تمہارے دماغ کی پائپ لائن میں جو رکاوٹ تھی دور ہو گئی ہے۔ اب اگلا لفافہ کب مل رہا ہے؟"

"جلد ہی۔" ہادی نے مختصر جواب دیا۔

"لیکن یہ چمتکار ہوا کیسے ہے؟ کہیں کوئی عشق وشق تو نہیں ہو گیا اس وینس والی کڑی سے۔"

"ایسا ہی سمجھ لیں شنو بھائی؟"

"اوئے تیرا بیڑا ترے۔ وہ تو شادی شدہ ہے نا۔"

"تو عشق کیا پوچھ کے ہوتا ہے شنو بھائی۔"

"پڑھو نے بتایا تھا کہ اس کے گھر والے بھی بڑے ڈھاڈے ہیں۔ اس کی نگرانی شگرانی کا چکر بھی تھا۔"

"گھر والے ڈھاڈے ہیں پر عشق بھی تو ڈھاڈا ہی ہوتا ہے نا یہ کسی کی کب سنتا ہے۔"

"پر ذرا ہاتھ ہولا رکھ یار! تجھ پر سرمایہ کاری ہوئی ہے تیرے بھنوں کی۔"

"آپ کا سرمایہ میرے عشق کرنے سے نہیں ڈوبے گا شنو بھائی! عشق نہ کرنے سے ڈوبے گا۔"

"کیا مطلب؟"

وہ مسکرایا۔ "عشق ختم...... تو گیت ختم۔"

"اچھا اچھا بھئی ٹھوکر عشق۔ پر گیتوں کو بریک نہیں لگنی چاہیے۔ اور اس سلسلے میں میری کسی مدد کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ ڈپٹی ہاشم سے رابطہ ہے نا تیرا؟"

"ہاں کبھی کبھی بات ہوتی ہے؟"

"تو بس ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بار پھر کہوں گا کہ ذرا ہاتھ ہولا رکھ کے۔ اپنا لاہور ہوتا تو اور بات تھی۔ مگر یہ پردیس ہے۔"

"عشق نہ پچھے ذات...... تے عشق نہ ویکھے دیس پردیس۔" ہادی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"یار! کہیں صوفی ہی نہ بن جانا۔ یہ کافیاں شافیاں ہٹ نہیں ہوتیں آج کل۔"

ہادی نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اسی دوران میں اسے گلزار کا خیال آ گیا۔ دو تین روز سے اس سے رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ہادی نے اس کا نمبر ملایا۔ وہ شاید کسی نائٹ کلب میں تھا۔ ڈرم کی دھما دھم تھی اور نقرئی قہقہے گونج رہے تھے۔ گلزار نے قدرے پرسکون جگہ پر جا کر ہادی کا فون سنا۔ "کہاں تک پہنچا تمہارا کام؟" ہادی نے پوچھا۔

"بس اسی کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔" وہ بولا۔

"اسی کے پیچھے لگے ہوئے ہو یا کسی لمبی سی لڑکی کے پیچھے لگے ہوئے ہو۔ اسے بیڈ روم تک لے جانے کے [illegible]"

"نہیں ہادی صاحب! آپ کے سر کی قسم۔ اگر آپ کے پورو خرچ ہو رہے ہیں تو کام بھی آپ کا ہو رہا ہے۔ بس آپ دو چار دن کا وقت دیں۔ بڑی کڑاکے دار خبر دوں گا آپ کو۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وقت زیادہ نہیں ہے۔" ہادی نے کہا پھر ذرا توقف سے بولا۔ "ان دنوں میں ارم سے رابطہ ہوا ہے تمہارا؟"

"نہیں جی! ان دنوں تو نہیں ہوا۔ وہ میرا فون ہی نہیں اٹھا رہی آج کل۔"

"چلو اگر رابطہ ہو تو اس سے جاننے کی کوشش کرو کہ حجاب کہاں اور کس حال میں ہے۔"

اس نے فون بند کیا اور صوفے کی نشست سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ گلزار سے کہہ رہا تھا کہ وہ ارم سے رابطہ کرے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ارم خود یہاں ہوٹل میں اس کے پاس آنے والی ہے اور یہ ملاقات اس کے لیے کچھ زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہونے والی۔ اس ملاقات سے وہ ایک نقصان اٹھانے والا تھا۔

○......◆......○

ارم کا ستارہ آج کل عروج پر تھا۔ سب کچھ اس کے حق میں جا رہا تھا۔ جلال نے بڑی بہن فوزیہ سے اس کی بات کرا دی تھی۔ آپا خانم ویسے ہی اس کی مٹھی میں تھیں۔ شادی کے راستے میں بظاہر اب کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔ رہی سہی کسر خود حجاب کی اپنی غلطی سے پوری ہو گئی تھی۔ اور یہ کوئی معمولی غلطی نہیں تھی۔ ارم جانتی تھی جلال اسے آسانی سے معاف نہیں کرے گا۔ وہ آج کل پرانے گھر میں تھی اور یقیناً جلال اس سے کڑی بازپرس کر رہا تھا۔ بہرحال یہ سب کچھ بھی ارم کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ جو کچھ بھی ہے جلال، حجاب کو مکمل طور پر کھونا نہیں چاہے گا۔ وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔ یعنی ارم کو دوسری بیوی بن کر رہنا پڑے گا۔ ارم کے نزدیک یہ ادھوری فتح تھی۔ مکمل فتح اس وقت ہوتی جب جلال اسے اپنی زندگی سے یکسر نکال دیتا۔

کافی ہاؤس والا واقعہ ارم کے لیے بڑا اہم موڑ ثابت ہوا۔ بعد ازاں جلال نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کافی ہاؤس تک کیسے پہنچی۔ ارم، گلزاری کا نام تو لے نہیں سکتی تھی۔ اس نے یہی بتایا تھا کہ اس کی ایک کلاس فیلو روبی نے حجاب کو دو بار ہوٹل واسکوڈے سے نکلتے دیکھا۔ وہ مکمل پردے میں تھی پھر بھی روبی کو شک ہو گیا کہ یہ حجاب ہے۔ یہ بھی جانتی تھی کہ ہادی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ روبی نے اسے بتایا اور پھر وہ خود ہی وہاں پہنچ گئی۔

بہرحال آج شام کو جلال دو روز کے لیے میلانو جا رہا تھا۔ واپسی پر نکاح وغیرہ کی تاریخ کے بارے میں فیصلہ ہونا تھا (ارم کے والدین سے ابتدائی بات چیت ہو چکی تھی۔ وہ بھی اتنا باحیثیت داماد کھونا نہیں چاہتے تھے جبکہ فی الحال بھی شادی پر تلی ہوئی تھی۔) ارم روانگی کے لیے جلال کے کپڑے وغیرہ تیار کر رہی تھی۔ اسی دوران میں جلال لیے ڈگ بھرتا اندر داخل ہوا۔ ارم نے شرمانے کی ایکٹنگ کی (تھوڑی بہت شرم آئی بھی۔) "آپ ایک دم ہی نازل ہو جاتے ہیں۔" وہ دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے اب گھڑیال بجا کر آیا کروں گا۔" وہ بولا۔ نگاہیں بدستور سیل فون کی اسکرین پر تھیں۔ پھر یکدم چونک کر اس نے فون بند کیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ "اپنی فرینڈ کو فون کیا تم نے؟ میرا مطلب ہے روبی کو؟"

"کس لیے؟"

"بندہ خدا! کیا کہا تھا تمہیں؟"

"ہاں...... وہ تو میں نے کل رات کو ہی کر دیا تھا۔ اس سے کہہ دیا ہے کہ ادھر اُدھر بات نہیں کرنی۔ وہ ایسی ہے تو نہیں لیکن......"

"لیکن کیا؟"

"وہ میری فرینڈ نہیں ہے جلال! صرف کلاس فیلو ہے۔ اب میں اس کے منہ پر پٹی باندھنے سے تو رہی۔ درخواست ہی کر سکتی ہوں۔ وہ کئی سوال پوچھ رہی تھی مجھ سے ہادی کے بارے میں اور باجی حجاب کے بارے میں بھی کہ یہ کیسے ملے...... کہاں ملے؟ پہل کس کی طرف سے ہوئی؟ میں نے بمشکل جان چھڑائی۔"

جلال کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے شیروانی کا بالائی بٹن کھولا۔ پھر کڑے لہجے میں بولا۔ "اسے سختی سے منع

کر دو ارم! اگر اس کی وجہ سے بات پھیلی تو اس کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ باقی میں نے ساری پوچھ گچھ کر لی ہے حجاب سے بھی۔ وہ دونوں صرف گھومنے پھرنے کی حد تک ساتھ رہے ہیں۔ تمہیں بھی پتا ہے کہ وہ کوئی آرٹیکل لکھ رہی ہے سولو ٹینکس پر......"

"ہاں پتا ہے جلال! وہ لکھ رہی ہے آرٹیکل۔" وہ ذرا چبا کر بولی۔

جلال کے فون کی بیل ہوئی۔ وہ سنتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ارم منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ "پتا نہیں ابھی کیا کیا آرٹیکل لکھنے ہیں آپ کی بیگم صاحبہ نے۔"

دو گھنٹے بعد جلال میلانو روانہ ہو چکا تھا۔ جلال کی موجودگی میں گھر کا ماحول ذرا گھٹا گھٹا رہتا تھا مگر اس کے بعد فضا ذرا ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی۔ اہلِ خانہ کے ساتھ ساتھ ملازم اور ملازمائیں بھی ایزی محسوس کرتے تھے۔ گاہے بگاہے قہقہے بھی سنائی دے جاتے تھے۔ فوزیہ اور ارم کھانے کی میز پر تھیں۔ ارم کی دو کزنیں آئی ہوئی تھیں۔ ظہیر کی ایک پھوپھی زاد بھی تھی۔ گپ شپ ہو رہی تھی۔ کھانے کی نئی ڈشز، کپڑوں کے نئے فیشن، ٹی وی اور فلم کی تازہ خبریں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی گفتگو جلال کی موجودگی میں تو نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی دوران میں ظہیر جھومتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ "یہ کون سی کتاب ہے ظہیر بھائی!" اس کی پھوپھی زاد آصفہ نے چہک کر پوچھا۔

"اس کا عنوان ہے شوہر کی خدمت کیسے کی جائے۔"

"تو یہ آپ کیوں پڑھ رہے ہیں۔ کیا آپ کا بیوی بننے کا ارادہ ہے؟" آصفہ نے کہا اور قہقہہ مارا۔

"نہیں بھئی۔ یہ میں اپنی معلومات کے لیے پڑھ رہا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں کہ فوزیہ میری خدمت ٹھیک سے کر رہی ہے یا نہیں۔"

"بس سب کچھ کتابوں سے ہی ڈھونڈا کریں۔ اپنی عقل سے کچھ نہ سوچیں۔" فوزیہ نے کہا۔

"بھئی کتابیں عقل مند لوگ ہی لکھتے ہیں اور پڑھتے بھی عقلمند لوگ ہی ہیں۔ ویسے بھی ہم ادبی بندے ہیں۔"

"ادب پر اتنا موٹا پا کم ہی دیکھا ہے ہم نے۔" فوزیہ نے شوہر پر چوٹ کی۔ سب ہنسنے لگے۔

آصفہ بولی۔ "ہاں ظہیر بھائی! ادب سے یاد آیا، آپ کے وہ شاعر دوست چلے گئے کہ یہیں ہیں۔"

"بھئی آخری خبریں آنے تک تو یہیں ہے۔ میں نے ارم سے کہا بھی ہے کہ اگر ملنا ہے تو جا کر مل لو۔ بہت ہاجس آدمی ہیں۔ اور نام ہے بھئی ان کا۔ سامنے بیٹھ کر غیرے سے تو ملتے ہی نہیں۔"

آصفہ نے ارم کی طرف دیکھا۔ "تو کیا خیال ہے ارم! ایک نشست ہو جائے شاعر صاحب کے ساتھ؟"

ارم سے پہلے ہی اس کی کزن ماہ نور بول اٹھی۔ "ٹھیک ہے چلتے ہیں بھئی۔ بلکہ ابھی چلتے ہیں۔ کون سا اتنا زیادہ وقت ہوا ہے۔ نو ہی تو بجے ہیں۔"

ارم ذرا سوچ میں پڑ گئی۔ اس طرح جانے سے جلال ناراض بھی ہو سکتا تھا مگر ایک جواز تو تھا وہ کہہ سکتی تھی کہ آصفہ وغیرہ کا پروگرام بن گیا اس لیے وہ بھی ساتھ چلی گئی۔ تاکہ کچھ سن گن لے سکے۔ یہ حضرت یہاں کیوں ٹکے

ہوئے ہیں اور کیا ارادے رکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اسے یقین تھا کہ خود جلال کے ذہن میں بھی یہ سوال ہوں گے۔

سیل فون ارم کے ہاتھ ہی میں تھا۔ اس نے جلال سے رابطہ کرنے کے لیے فون کیا۔ وہ بار کال کرنے کے باوجود کال ریسیو نہیں ہوئی۔ وہ شاید کسی میٹنگ میں تھا۔ یہ بھی اچھی بات تھی۔ جلال سے اجازت لینے کی اور کمل پوری ہو گئی تھی۔

وہ چاروں جیپ میں سوار ہوئیں اور ڈرائیور کے ساتھ ہوٹل داسکوڈے پہنچ گئیں۔ انہوں نے ہادی کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا کہ مبادا کوئی اڑچن پیدا ہو جائے۔ وہ سیدھی سیکنڈ فلور کے کمرہ نمبر 118 کے سامنے پہنچ گئیں۔ ان کی خوش قسمتی سے ہادی کمرے میں ہی تھا اور اکیلا تھا۔ وہ ارم اور دیگر لڑکیوں کو اپنے سامنے دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ بہرحال وہ مہمان تھیں۔ خوش خلقی کا مظاہرہ تو ہادی کو کرنا ہی پڑا۔ ارم نے صاف طور پر محسوس کیا کہ ہادی پریشان ہے۔ بال بکھرے بکھرے، آنکھیں سرخ اور لباس مڑا تڑا تھا۔ اس کیفیت کی وجہ ارم اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ جینئس شاعر حجاب کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ دوسری پوزیشن تھی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

ماہ نور چہکی۔ ”ہادی صاحب! آپ بہت بکھرے بکھرے ہیں کیا آپ پر کوئی غزل اُتر رہی تھی؟“

وہ زبردستی مسکرایا۔ ”اُتر تو رہی تھی لیکن اب اکٹھی تین چار نظمیں اُتر آئی ہیں۔“

سب ہنسنے لگیں۔ ماہ نور نے کہا۔ ”تین غزلیں ایک آزاد نظم۔“ اس کا اشارہ اپنی طرف تھا کہ وہ ذرا موٹی تھی۔

”ہادی صاحب! یہ آپ لکھ کس طرح لیتے ہیں۔ کیا اس میں محبت کا بھی کوئی عمل دخل ہوتا ہے؟“ آصفہ نے پوچھا۔

ہادی سے پہلے ارم بول اُٹھی۔ ”ہاں بھئی شاعری کے لیے عشق بہت ضروری ہوتا ہے بلکہ مجھے تو لگتا ہے ہادی صاحب اس وقت بھی حالتِ عشق میں ہیں۔“

ہادی نے ذرا چونک کر ارم کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ ”مذاق کر رہی ہوں ہادی صاحب! بُرا تو نہیں لگے گا۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ عشق کا الزام ہی لگا رہی ہیں۔ چوری چکاری کا تو نہیں۔“ وہ سب پھر ہنسنے لگیں۔

ارم ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”ویسے عشق میں چوری چکاری بھی آ جاتی ہے اور کبھی کبھی تو شاید ڈاکہ بھی۔“

ہادی نے گہری سانس لی۔ ”جی ہاں...... اسی لیے کہتے ہیں کہ حالتِ جنگ اور حالتِ عشق میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔“

نادیہ بولی۔ ”اچھا ہادی صاحب! مجھے یہ بتائیے کہ شاعری کے لیے صرف عشق کافی ہے یا اس کے ساتھ ناکامی بھی شرط ہے۔“

”عشق تو صرف عشق ہوتا ہے۔ کامیابی یا ناکامی کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ وہ بولا۔

”واہ واہ...... کیا بات کہی ہے۔ ایک دم کلاسیکل شاعر لگے ہیں آپ۔“ آصفہ نے خوش ہو کر کہا۔

مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی۔ اسی دوران میں ہادی نے لڑکیوں کے لیے آئس کریم بھی منگوا لی۔ جب وہ آئس کریم کھا رہے تھے تو ہادی کے سیل فون کی بیل ہوئی۔ کمرے میں ہر طرف چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ ہادی نے سیل فون ایک کشن کے نیچے سے ڈھونڈا اور کال سنی۔ سگنل شاید پورے نہیں آ رہے تھے۔ اس نے دو تین بار ہیلو کہا پھر بات کرتا ہوا باہر چلا گیا۔

قریب ہی ایک تپائی پر سگریٹ کے پیکٹ اور موبائل چارجر کے پاس ہادی کا ڈیجیٹل کیمرہ پڑا تھا۔ ارم نے یونہی کیمرہ اٹھا لیا تھا۔ وہ آن تھا۔ وہ تصویریں چیک کرنے لگی۔ درجنوں ہی تصویریں تھیں۔ یہ سب روم اور اس کے گردو پیش کے شاٹس تھے تفریح گاہیں، تاریخی مقامات، پارکس، کسی کسی تصویر میں ہادی خود بھی نظر آتا تھا۔ کچھ تصویریں اس کے ادبی دوستوں اور محفلوں کی تھیں۔

ہادی ایک قریبی بالکونی میں کھڑا فون پر بات کر رہا تھا۔ ارم تصویریں دیکھتی چلی گئی۔ روم کے بعد وینس کی تصویریں شروع ہو گئیں۔ وینس کی آبی شاہراہیں وہاں کے تفریحی مقامات، بازار، ایک تصویر دیکھ کر ارم بُری طرح چونکی۔ اسے لگا کہ یہ حجاب کی تصویر ہے۔ ہادی کے کیمرے میں حجاب کی تصویر اور اس انداز کی۔ اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے کیمرے کی اسکرین پر تصویر کو زوم ان کیا اور ششدر رہ گئی۔ یہ حجاب ہی کی تصویر تھی۔ لیکن حیران کن طور پر یہ تصویر پتلون اور شرٹ میں تھی۔ حجاب کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ یہ سائیڈ پوز تھا۔ وہ ایک طرف جھکی ہوئی کچھ دیکھ رہی تھی۔

”او گاڈ۔“ ارم کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑ گئے۔

آصفہ، ارم کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اس دوران میں وہ بھی تصویر دیکھ چکی تھی اور اس کے چہرے پر بھی حیرت نظر آ رہی تھی۔ ”یہ دیکھو بھئی یہ کیا سین ہے؟“ آصفہ نے ماہ نور اور نادیہ کو متوجہ کیا۔

ارم نے جلدی جلدی کچھ مزید تصویریں دیکھیں۔ مزید کہیں حجاب کی تصویر نہیں تھی۔ ہادی ابھی تک بالکونی میں کھڑا بات کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی گفتگو اختتامی مراحل میں ہے۔ ارم نے اپنا شولڈر بیگ کھولا۔ اس میں سے اپنا موبائل فون نکالا۔ ڈیجیٹل کیمرے کے ڈسپلے پر اس نے مطلوبہ تصویر کو اپنی ضرورت کے مطابق انلارج کیا۔

”یہ تو بڑی خاصے کی چیز ہے بھئی۔“ ارم نے کہا اور اپنے موبائل فون کے کیمرے کے ذریعے حجاب کی تصویر اپنے موبائل فون میں منتقل کر لی۔ رزلٹ بہت اچھا رہا۔

”یہ چپکے چپکے کیا چکر چل رہے ہیں ارم؟“ ماہ نور نے آنکھیں نچائیں۔

”مجھے کیا پتا۔“ ارم نے منہ بنا کر کہا۔

”لگتا ہے کہ جلال سے تمہاری شادی کو حجاب نے ہضم نہیں کیا۔ وہ ری ایکشن دینے کے موڈ میں ہے۔“

”ری ایکشن ساری ایکشن یہ تو تہلکہ مچ جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اندر خانے کوئی گڑبڑ ہو بھی چکی ہے۔ جلال بھائی شاید اسی لیے حجاب کو میکے سے واپس گھر نہیں لائے بلکہ پرانی کوٹھی لے گئے ہیں۔“ آصفہ نے خیال ظاہر

کیا اور سوالیہ نظروں سے ارم کو دیکھنے لگی۔

"مجھے تو کچھ پتا نہیں یار! ان سائیڈ کیا کر رہے ہیں یہ لوگ۔" ارم نے کہا۔

"اتنی بھولی نہ بنو۔ پتا تو بہت کچھ ہوگا تمہیں۔ بس ہم سے شیئر نہیں کر رہی ہو۔ لیکن ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں جانِ من۔" ماہ نور نے لقمہ دیا۔

"اچھا چپ ہو جاؤ۔ لگتا ہے وہ آ رہا ہے۔" ارم نے کہا اور Nikon کا کیمرہ واپس شیشے کی تپائی پر رکھ دیا۔ اس کے ذہن میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔

O.....❖.....O

ایسی باتیں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ چہ میگوئیاں تو کافی ہاؤس والے واقعے کے بعد ہی شروع ہو گئی تھیں اور ان چہ میگوئیوں کو ہوا دینے میں پس پردہ ارم ہی کا ہاتھ رہا تھا۔ مگر اب تو کھلم کھلا باتیں کی جا رہی تھیں۔ روم میں راٹھور خاندان کی تین چار فیملیاں رہائش پذیر تھیں۔ ولیہ خاندان کے بھی دو تین گھر تھے۔ ان سب کے ہاتھ ایک نہایت دلچسپ اور سنسنی خیز خبر آ گئی تھی۔ خبر میں کچھ تو سنسنی کا مواد واقعی موجود تھا۔ بہت سا مرچ مسالہ بھی لگا لیا گیا تھا۔ برملا کہا جا رہا تھا کہ پاکستان سے آنے والے شاعر..... محمد ہادی کے ساتھ حجاب کا باقاعدہ معاشقہ چل رہا ہے۔ حجاب اپنی دوست ماریہ کی شادی کے بہانے اسی سے ملنے وینس گئی تھی۔ وہاں وہ دونوں خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے۔ بعدازاں ہادی، حجاب کے پیچھے ہی پیچھے روم چلا آیا بلکہ جلال کے گھر تک بھی پہنچ گیا۔ یہاں ہوٹل وغیرہ میں بھی وہ دونوں مسلسل ملتے رہے ہیں۔

حجاب چونکہ الگ تھلگ درس والے گھر میں تھی اور اس نے فون بھی بند کر چھوڑا تھا اس لیے وہ اس تشویشناک صورت حال سے بے خبر تھی۔ اس بے خبری کے عالم میں وہ کل دل کڑا کر کے ڈرائیور کے ساتھ بازار گئی تھی۔ اس نے ارم کے لیے کچھ کامدار سوٹ خریدے تھے۔ یہ اپنے گلے پر اپنے ہاتھ سے چھری چلانے والی بات تھی لیکن اس کا خیال تھا کہ اس کا یہ عمل جلال کے اشتعال کو کم کرنے میں مدد دے گا۔ ویسے بھی جو کام اب کرنا تھا وہ تو کرنا ہی تھا۔ پھر اس میں تاخیر اور ہچکچاہٹ کا فائدہ؟ پچھلے دو تین روز میں بہت روئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ رو رو کر اس کا سر اور سینہ دونوں خالی ہو گئے ہیں۔ اب اس کے اندر ایک طرح کا ٹھہراؤ سا پیدا ہونے لگا تھا۔ وہی ٹھہراؤ جو اکثر و بیشتر ہاری ہوئی عورت کا سہارا بنتا ہے اور اسے بدترین حالات میں بھی زندگی کو جاری رکھنے کے راستے دکھاتا ہے۔

آج رات جلال آ رہے تھے۔ حجاب نے خود کو بمشکل کمپوز کیا۔ فریش ہو کر لباس تبدیل کیا۔ اس کی ہدایت پر شریفاں نے سندھی بریانی بنائی اور جلال کے پسندیدہ سیخ کباب تیار کیے۔ شریفاں کچھ خاموش خاموش تھی مگر شام کے بعد تک حجاب کو اس کا اندازہ نہیں ہوا۔ آٹھ بجے کے قریب جب حجاب کھانے کی میز سجا رہی تھی اور جلال کے آنے میں پون گھنٹہ باقی تھا، حجاب کو شریفاں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نظر آئی۔ وہ الماری میں سے چیچ نکالتے نکالتے رک گئی۔ کیا بات ہے شریفاں کوئی مسئلہ ہے؟ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ باقاعدہ سسکیاں لینے لگی۔ حجاب نے اسے اپنے ساتھ لگایا اور وجہ پوچھی۔ وہ پہلے تو خاموش رہی۔ پھر بولی۔

"باجی! دوپہر کو میں نے آپا خانم کو فون کیا تھا، وہ تو سو رہی تھیں۔ کلثوم (ملازمہ) سے بات ہوئی۔ وہ بڑی پریشان کرنے والی باتیں بتا رہی تھی۔"

"پریشان کرنے والی؟ کیا مطلب؟"

"وہ..... آپ کے بارے میں بتا رہی تھی جی! مجھے ڈھاڈا دکھ ہوا ہے۔ ان لوکاں کو تو بس باتیں بنانے کا بہانہ چاہیے ہوندا ہے۔"

"مجھے کھل کر بتاؤ شریفاں! کیا باتیں بنا رہے ہیں؟"

وہ آنسو پونچھ کر بولی۔ "مجھے تو اس کے پیچھے بھی اس بی بی ارم کا ہاتھ ہی لگدا ہے جی! وہ ہتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس نے باتیں مشہور کی ہیں جی! آپ کے اور ان ہادی صاحب کے بارے میں۔" شریفاں کی آواز لرز رہی تھی۔

حجاب کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ منہ خشک ہونے لگا وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ "مجھے تفصیل سے بتاؤ شریفاں۔"

"میرا دل کرتا ہے کہ منہ توڑ دوں ان سب کے۔ اللہ کرے ان کی زبان سڑے۔ کہتے ہیں آپ اور ہادی صیب پہلے سے ایک دوجے کو جانتے ہیں اور ہادی صیب آپ ہی سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ہادی صاحب نے چھوٹے بھائی جان ظہیر کو بھی چکر دیا۔ انہوں نے چھوٹے بھائی جان کو اس طرح بیوقوف بنایا کہ وہ ان کو اپنے گھر میں ہی لے آئے۔ بعد میں وڈے بھائی جان کو شک ہوا تو انہوں نے ہادی صیب کو گھر سے نکال دیا لیکن آپ دونوں پھر بھی باز نہیں آئے اور ہوٹل میں ایک دوجے سے ملتے رہے۔"

حجاب کا سر گھوم رہا تھا۔ "کون کر رہا ہے یہ باتیں؟" اس نے پوچھا۔

"سارے ہی کر رہے ہیں جی! مجھے تو لگدا ہے کہ وڈے بھائی جان تک بھی پہنچ گئی ہوں گی۔ یہ لوک کسی تصویر کی گل بھی کر رہے ہیں۔ آپ کی یہ تصویر ہادی صیب کے پاس سے ملی ہے۔ کہتے ہیں کہ بڑی بیہودہ تصویر ہے۔ میں تو مر کے بھی ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتی جی۔"

"تصویر..... کیسی تصویر؟" حجاب کی آواز حیرت آمیز دکھ سے کپکپا رہی تھی۔

"مجھے کیا پتا جی! میرا دل تو ہول رہا ہے۔ آپ کے لیے بڑی مصیبت بن جائے گی۔ مارنے والے کا ہتھ پکڑا جا سکتا ہے۔ پر بولنے والی کی زبان کو کیسے پکڑا جائے۔ وہ تو کمپیوٹر کی گل بھی کر رہے ہیں کیا کہتے ہیں جی اس سڑن ملکے کو؟ انٹرنیٹ۔"

"انٹرنیٹ؟"

"آہو جی کہتے ہیں کہ آپ کا اور ہادی صیب کا معاملہ انٹرنیٹ پر شروع ہوا تھا۔ بڑھتے بڑھتے گل یہاں تک پہنچا ہے۔ باجی آپ وڈے بھائی جان سے گل کریں فوراً اور ان باتوں کو رکوائیں جی یہ کوئی معمولی گل نہیں ہے اس طرح کسی کو بدنام کرنا۔"

حجاب کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اسے لگا کہ اس کا دل ڈوب رہا ہے۔ اس نے کرسی کا سہارا لیا اور بیٹھ گئی۔ یہ

سب کیا ہو رہا تھا۔ وہ پیچھے تو ہٹ گئی تھی۔ پسپا تو ہو گئی تھی۔ اب یہ لوگ اسے کہاں تک دھکیلنا چاہتے تھے۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ یہ جھوٹ کون تراش رہا ہے اور کس لیے؟ ظاہر ہے کہ شریفاں جھوٹ تو نہیں بول سکتی تھی۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں تو اس کی زبان تک آئی تھیں۔ اس کی نگاہوں میں اپنے ابو امی کے چہرے گھومے وہ تو پہلے ہی حالات کی سنگینی سے ڈرے سہمے تھے۔ ابھی تو وہ یہ سوچ رہی تھی کہ ان تک جلال کی دوسری شادی کی خبر کس طرح اور کس انداز سے پہنچائے کہ انہیں کم سے کم دھچکا لگے۔ (حالانکہ وہ اس معاملے سے یکسر بے خبر بھی نہیں تھے) اب یہ دوسری مصیبت کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ ابھی جلال کو فون کرے اور اس سے اس بارے میں بات کرے۔ پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ جلال اب چند منٹ میں پہنچنے ہی والا تھا۔

وہ بے چینی سے برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد جلال کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا اور حجاب کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔

جلال اندر آیا تو حجاب نے اسلام علیکم کہا۔ اس نے جواب دیا۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوا کرتا تھا۔ آج بھی چہرہ سنجیدہ تھا۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ اس کے کانوں تک وہ باتیں پہنچی ہیں یا نہیں جو ابھی شریفاں نے بتائی ہیں۔

"چینج کریں گے؟" حجاب نے پوچھا۔

"نہیں۔" جلال نے مختصر جواب دیا۔

"کھانا لگواؤں؟"

"نہیں ابھی نہیں۔ میں ذرا ایک فون کر لوں۔"

وہ فون والے کمرے میں چلا گیا۔ لینڈ لائن پر کسی سے پانچ دس منٹ بات کی۔ پھر باہر آ گیا۔ دونوں ڈرائنگ روم میں ہی صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ملازم باہر گیراج میں تھا۔ شریفاں کچن کی طرف جا چکی تھی۔ "میلانو میں کام ہو گیا؟" حجاب نے پوچھا۔

"ہوں۔" جلال نے مختصر جواب دیا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ "تم کیا کرتی رہی ہو؟"

"آج تو گھر میں ہی رہی ہوں۔ کل تھوڑی دیر کے لیے بازار گئی تھی۔"

"بازار۔"

"ہاں کچھ شاپنگ کی تھی۔" حجاب نے کہا اور اٹھ کر الماری سے کامدار جوڑوں والے ڈبے اٹھا لائی۔

"یہ کیا ہے؟"

"کپڑے۔" حجاب نے جواب دیا۔ اور ڈبے کھول کر جلال کو دکھانے لگی۔ جلال نے اٹھ کر دروازہ بند کیا اور حجاب کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے بتاؤ کیا چاہتی ہو تم؟"

اس کا انداز دیکھ کر وہ پوری جان سے لرز گئی۔ "م...... میں کچھ نہیں جلال!"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارے سوا اس دنیا میں نرے احمق اور گدھے بھرے ہوئے ہیں۔"

"جلال پلیز...... مجھ سے اس لہجے میں بات نہ کریں۔ م...... میں جانتی ہوں، میرے بارے میں باتیں بنائی جا رہی ہیں اور......"

"تیرے بارے میں باتیں بنائی جا رہی ہیں۔ تجھ پر الزام لگ رہے ہیں۔ سارے دشمن ہو گئے ہیں تیرے۔ بس ایک تُو ہی پاک صاف رہ گئی ہے یہاں پر۔ ایک تُو ہی عابدہ پروین ہے۔"

"آپ تحمل سے میری بات سنیں جلال۔"

وہ پھنکارا۔ "میں نے جو سننا تھا سن لیا ہے اور جو دیکھنا تھا وہ بھی دیکھ لیا ہے۔ یہ کیا کرتی پھر رہی ہے تُو...... یہ کیا ہو رہا ہے۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا جلال۔"

"کیا تُو اس حرامزادے سے مل نہیں رہی؟ اس کے ساتھ وینس میں سیر سپاٹے نہیں کرتی رہی؟ تم دونوں کے انٹرنیٹ پر رابطے نہیں رہے ہیں؟"

"یہ غلط ہے جلال! یہ جھوٹ ہے۔" وہ لرز کر بولی۔

ایک زناٹے کا تھپڑ حجاب کے گال پر پڑا اور اس کے خوبصورتی سے سنوارے ہوئے بال اچھل کر اس کے چہرے پر آ گئے۔ جلال نے ایک تصویر اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

"اور یہ بھی جھوٹ ہے...... یہ بھی فراڈ ہے۔"

حجاب نے دھندلائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی ریڑھ میں سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ پینٹ اور شرٹ میں اس کی تصویر تھی۔ پس منظر میں وینس کا ایک پل دکھائی دے رہا تھا۔

جلال دھاڑا۔ "یہ اس حرامزادے کے کیمرے سے ملی ہے جس کے ساتھ تُو نے وینس میں اور پتا نہیں کہاں کہاں مستیاں کی ہیں۔ لعنت ہے تجھ پر اور لعنت ہے اپنے والدین پر جنہوں نے تیرے جیسی بیٹی پیدا کی۔ ڈوب مر شرم سے۔ ایک طرف یہ پردہ داریاں، یہ دین داریاں ہیں اور دوسری طرف یہ گل چھرے۔ تُو بہروپن ہے۔ ناپاک عورت ہے۔" اس نے بیٹھے بیٹھے زور سے ٹانگ چلائی جو حجاب کے سینے پر لگی۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی کھانے کی میز پر جا گری۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے بڑی محنت سے جو میز سجائی تھی وہ درہم برہم ہو گئی۔ پلیٹیں گر کر ٹوٹ گئیں۔ گلاس فرش پر لڑھکتے نظر آئے۔ وہ اسے بیدردی سے مارنے لگا۔ وہ پکار رہی تھی۔ "جلال! میں نے کچھ نہیں کیا۔ جلال میری بات سنیں۔"

یقیناً مار دھاڑ اور رونے چلانے کی یہ ساری آوازیں ملازمین تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ان میں سے کون اندر آنے اور مداخلت کرنے کی ہمت کر سکتا تھا۔ وہ مکمل طور پر جلال کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے ایک واکنگ اسٹک اٹھائی اور اس سے حجاب کو پیٹنے لگا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے اس کے ماں باپ اور اس کے خاندان کو بدترین القابات سے نواز رہا تھا۔ یہ لمحے حجاب کے لیے قیامت سے کم نہیں تھے۔ کوئی اس کے جسم کو جیسے دہکتی ہوئی سلاخوں سے داغ رہا تھا۔ وہ چلا تو رہی تھی مگر آواز جیسے اس کے سینے کے اندر ہی گونج رہی تھی۔ آخر چھڑی ٹوٹ گئی۔ جلال نے اسے گردن سے پکڑا اور دھکا دے کر دیوار سے دے مارا۔ وہ لہراتی ہوئی کامدار جوڑوں کے ڈبوں پر جا گری۔ زرق برق لباس

بکھرتے نظر آئے۔

وہ گرجا۔ ”حرام زادی! شاپنگیں کرتی پھر رہی ہے۔ اس یار کو دکھانے کے لیے۔ اس کو رجھانے کے لیے۔ تیرے جیسی عورت کو تو چوراہے میں سنگسار کرنا چاہیے۔“

حجاب کا گلا خشک ہو کر بند ہو چکا تھا۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکی کہ یہ شاپنگ اس نے اپنے لیے نہیں اس کی ہونے والی بیوی کے لیے کی ہے۔ اس کے حکم کے مطابق۔ وہ نیم جان سی اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کی پشت پر انگارے دہک رہے تھے۔ جلال نے ایک اور ٹھوکر اس کے پہلو میں رسید کی اور گالیاں دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

وہ تصویر چند فٹ کے فاصلے پر ٹوٹی ہوئی پلیٹوں اور گلاسوں کے پاس پڑی تھی۔ حجاب نے اشک بار نظروں سے تصویر کو دیکھا۔ یہ اس کی تھی۔ وینس کی کسی گلی میں اُتاری گئی تھی۔ اگر یہ ہادی کے کیمرے سے نکلی تھی تو یقیناً اس نے چوری چھپے ہی ایسا کیا تھا۔ ہادی کے لیے اس کا رنج اور طیش کچھ اور بڑھ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس کے سامنے ہو اور وہ اس کا منہ نوچ لے۔

○.....❖.....○

ہادی ہوٹل واسکوڈے کے کمرے میں تھا۔ اس کی بے چینی میں کوئی بھی واضح کمی نہیں ہوئی تھی۔ حجاب سے اس کی آخری ملاقات تب ہوئی تھی جب جلال اسے کافی ہاؤس سے لے کر گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اس کی شکل دیکھ سکا تھا نہ آواز سن سکا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہاں کیا صورت حال ہے۔ ہادی کے ذہن میں آتا تھا کہ شاید صورت حال اتنی خراب نہ ہو جتنی وہ سوچ رہا ہے۔ دو روز پہلے ارم اور اس کی کزنز وغیرہ یہاں آئی تھیں۔ وہ بھی کچھ ہلکے پھلکے موڈ میں باتیں کرتی رہی تھیں۔ ان کے رویے سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ حجاب کی طرف کسی طرح کی ناگوار صورت حال موجود ہے۔ ظہیر کی طرف سے بھی کوئی ایسا ویسا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ ہادی اپنے ذہن میں اس خوش فہمی کو جگہ دے رہا تھا کہ شاید اس دن جلال واقعی اتفاق سے کافی ہاؤس آ پہنچا ہو اور یہ کہ شاید آج حجاب خود ہی اس سے رابطہ کر لے۔ یا کیا پتا خود ہی یہاں آن پہنچے۔ حجاب کو بھی پتا تھا کہ آج روم میں اس کا آخری دن ہے۔ کل اس نے فلورنس یا پیسا کا رخ کرنا ہے۔ سابقہ پروگرام کے مطابق آج حجاب نے آنا تھا اور ہادی کو الوداع بھی کہنا تھا۔ وہ صبح ہی نہا دھو کر تیار ہو گیا۔ پتا نہیں کیوں اسے یقین تھا کہ حجاب اس سے ملنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ڈھونڈ ہی نکالے گی۔ اور کچھ نہیں تو فون تو ضرور ہی کرے گی۔

ابھی تک اس نے روم سے جانے یا نہ جانے کا کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ چلا گیا تو اس کا دل و دماغ یہیں رہ جائے گا۔ وہ اپنا خالی، مٹی کا جسم لے کر جائے گا، جس میں زندگی کی کوئی اُمنگ ترنگ نہیں ہو گی۔ بلکہ شاید زندگی ہی نہ ہو گی۔ کوئی اتنی جلدی کسی کے جسم و جان پر قبضہ کر سکتا ہے۔ ہادی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے عشق و محبت کے گداز جذبے کے بارے میں سینکڑوں شعر کہے تھے۔ ہزاروں صفحات بھر دیئے تھے مگر عملی طور پر اس جذبے سے اس کا واسطہ پہلی بار پڑا تھا۔ اور اتنی شدت سے کہ وہ دنگ تھا۔ اسے اپنے سامنے ایک بند گلی بالکل صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کا دماغ چلا چلا کر کہہ رہا تھا کہ سفر ناممکن ہے۔ آگے بڑھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ رُک جاؤ۔ پلٹ

جاؤ۔ دم گھٹ جائے گا۔ مر جاؤ گے۔ بند گلی راستہ نہیں دے گی۔ مگر سب جانتے بوجھتے بھی وہ بے ساختہ قدم اُٹھاتا چلا جا رہا تھا۔ کسی انہونی کی خواہش نے دل کے اندر کہیں گہرائی میں گھات لگا رکھی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی چلتے رہو۔ تم نے سنا نہیں کبھی کبھی دیواریں راستہ دیتی ہیں۔ تم نے سنا نہیں کبھی کبھی پتھر پگھلتے ہیں اور کیا تم نے سنا نہیں کبھی کبھی پانیوں میں دیے جل اُٹھتے ہیں۔

اچانک اس کا جسم سنسنا اُٹھا۔ دروازے پر مدھم دستک ہوئی تھی۔ ”حجاب...... حجاب“ اس کے دل نے دیوانہ وار پکارا اور دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ اس نے دروازے کے Peep Hole میں آنکھیں لگائیں اور مایوسی ایک لہر بن کر اس کے سینے میں دوڑ گئی۔ وہاں حجاب کا دیور ظہیر نظر آ رہا تھا۔

اس نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔ ”اسلام علیکم ظہیر بھائی!“

”وعلیکم سلام“ ظہیر نے کہا۔ آج پہلی بار ہادی اس کے فربہ چہرے پر گہری سنجیدگی دیکھ رہا تھا۔ دونوں صوفوں پر بیٹھے۔ ظہیر نے سفید رومال نکال کر پیشانی سے پسینہ پونچھا۔

”کیا حال ہے ظہیر بھائی؟“

”بس ٹھیک ہوں۔ ایک ضروری بات کہنے آیا ہوں تم سے۔“

”جی جناب۔“

”پہلی بات تو یہ ہے ہادی! کہ میں تمہاری طرف سے بے حد مایوس ہوا ہوں۔ تم ایک فنکار ہو۔ فنکار تو اتنا سخت دل اور بے حس نہیں ہوتا۔“

”میں سمجھا نہیں ظہیر بھائی۔“

”میرے خیال میں اب تم یہ بھائی کا لفظ بھی نہ ہی کہو تو بہتر ہے۔ تم نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کے بعد اس کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔“ ظہیر کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

ہادی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ جلال صاحب نے تمہیں کچھ بتایا ہے۔“

وہ بھڑک کر بولا۔ ”جلال صاحب نے نہیں بتایا پورا خاندان بتا رہا ہے۔ تھو تھو ہو رہی ہے تم پر اور ساتھ ہی مجھ پر بھی۔ میں تمہیں مہمان بنا کر گھر لے گیا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ اندر خانے کیا چکر چلے ہوئے ہیں یہاں۔“

”تم غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو ظہیر۔“

”پلیز خاموش ہو جاؤ۔ پلیز...... میرا منہ نہ کھلواؤ۔ ورنہ بات بہت بڑھ جائے گی۔“ وہ بلند آواز میں بولا۔

”مگر...... کچھ پتا تو چلے۔“

”تمہیں سب پتا ہے اور مجھے بھی پتا ہے۔ بس ان باتوں کو ڈھکا ہی رہنے دو تو بہتر ہے۔“ ظہیر نے بہت گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بھائی جلال سخت غصے میں ہیں۔ اگر غصے میں ان سے کوئی الٹا سیدھا کام ہو گیا تو مزید بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تمہارے حق میں بھی اور شاید ہمارے حق میں بھی بہتر یہی ہے کہ تم فوراً روم سے چلے جاؤ۔ میں تمہیں کوئی دھمکی نہیں دے رہا۔ سمجھو تمہارے خیر خواہ کی حیثیت سے تمہاری منت

کر رہا ہوں۔ اگر کہتے ہو تو تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ دیتا ہوں۔ یہ دیکھو۔"

آخر میں ظہیر کا لہجہ قدرے نرم ہو گیا اور اس میں گزارش کی جھلک آ گئی۔

ہادی کے اندر بھی اُبال آتے آتے رہ گیا۔ وہ بھی ذرا سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ظہیر بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ جو کہتے ہیں ویسا ہی ہوگا۔ آپ اس طرح مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ مجھے صفائی کا موقع نہیں دینا چاہتے نہ دیں۔ مگر میں اتنا ضرور کہوں گا ....."

"تم جو کہنا چاہتے ہو ہادی! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ بس حالات اس وقت اتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ غلطی چھوٹی ہے یا بڑی۔ میں نہیں کہہ سکتا مگر اس کا جو نتیجہ نکلا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ میری ریکوئسٹ ہے کہ تم چلے جاؤ۔"

ہادی نے ایک بار پھر طویل سانس لی اور بولا۔ "میں تو پہلے ہی سامان باندھ کے بیٹھا ہوا ہوں۔ [illegible] اور بیگ پڑا ہے۔ کل صبح دس بجے میں نے نکل جانا ہے [illegible] کے لیے۔"

ظہیر نے ایک بار پھر سفید رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھا۔ ہادی کے پیک سامان کی طرف دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھیک ہے ہادی! میں چلتا ہوں۔ امید ہے کہ تم اپنے وعدے کا پاس کرو گے۔"

"آپ بے فکر رہو۔"

ظہیر خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔ جیسے ایک بگولا آئے اور چلا جائے۔

ہادی اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ اسے اپنی پیشانی پر پسینے کی نمی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران [illegible] کا میوزک بج اُٹھا۔ ہادی نے فون اُٹھایا۔ یہ شریفاں کا نمبر تھا۔

"ہیلو۔" شریفاں کی دبی دبی آواز سنائی دی۔

"ہیلو شریفاں! کیا بات ہے۔"

شریفاں کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر سرگوشی جیسی گلوگیر آواز میں بولی۔ "صیب جی! یہ کیا ہو گیا ہے۔ میرا تو دل [illegible] رہا ہے۔ باجی کی حالت میرے توں دیکھی نئیں جاندی۔"

"کیا ہوا ہے اسے؟"

"صیب جی! یہ پچھو کیا نئیں ہوا؟"

"کچھ پتا تو چلے۔"

وہ توقف سے بولی۔ "وڈے بھائی جان نے باجی سے بہت زیادہ جھگڑا کیتا ہے۔ مارا ہے ان کو وہ کل سے بھوکی پیاسی بس روندی جا رہی ہیں۔ یہ سب کیوں ہوا صیب جی؟ ایسا نئیں ہونا چاہیدا سی۔ چھوٹے منہ سے وڈی گل نئیں کرنا چاہندی پر آپ کو کچھ سوچ لینا چاہی دا سی۔"

"شریفاں! مجھے لگتا ہے کہ بات کا بتنگڑ بنایا جا رہا ہے۔"

"بات ہے تو بتنگڑ بنا ہے نا جی۔ پوری برادری وچ باتیں ہو رہی ہیں۔ باجی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں

رہیں۔ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ جانتے ہی ہوں گے۔ عورت وچاری کی عزت شیشے سے زیادہ کچی ہوتی ہے۔ اور یہ شیشہ ٹوٹ گیا ہے باجی جی کے لیے۔"

ہادی نے کہا۔ "شریفاں! مجھے نہیں پتا کہ تم لوگ کیا سوچ رہے ہو۔ سچ صرف اتنا ہے کہ حجاب میرے ساتھ تین چار دفعہ گھومنے کے لیے نکلی ہے۔ میں شہر دیکھنا چاہتا تھا اور وہ شہر کے بارے میں اچھی طرح جانتی ہے اور اس کے بارے میں کچھ لکھ بھی رہی تھی۔ اس کے علاوہ ہمارے درمیان کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ میں حجاب کے گھر والوں کے سامنے بڑی سے بڑی قسم کھا سکتا ہوں۔"

"آپ کے کہنے سے کچھ نئیں ہو گا صیب جی! گل بہت آگے نکل گئی ہے۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ آپ دونوں میں بہت پہلے سے جان پہچان ہے۔ آپ کمپیوٹر پر گل بات کرتے رہے ہیں۔ اور آپ صرف باجی حجاب سے ملنے کے لیے ہی پاکستان سے اتھے آئے ہیں۔ باجی شادی کے بہانے دوجے شہر گئی تھی تو آپ سے ملنے گئی تھی۔ انہوں نے کہیں سے باجی کی ایک فوٹو بھی ڈھونڈ لی ہے۔ یہ فوٹو آپ نے ہی اُتاری ہوئی ہے۔"

"[illegible] نے اُتاری ہوئی ہے۔"

"ہاں جی! آپ کے کیمرے سے نکلی ہے وہ فوٹو۔ اس میں باجی کے سر پر چادر ہے نہ دوپٹہ۔ انہوں نے پتلون پہنی ہوئی ہے۔ یہ سب بہت بھیڑا ہوا ہے صیب جی! پتا نئیں اب کیا بنے گا۔"

ہادی کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ حجاب کی ایک تصویر تو اس کے کیمرے میں موجود تھی۔ سینکڑوں دوسری تصویروں کے درمیان کہیں پڑی تھی یہ تصویر حجاب کے گھر والوں تک کیسے پہنچی؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس کے ساتھ ہی پورے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ تین چار دن پہلے ارم اور اس کی [illegible] یہاں اس سے ملنے یہاں کمرے میں آئی تھیں۔ کہیں انہوں نے تو کیمرے سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی۔ اس نے تھوڑا سا سوچا اور اسے یقین ہونے لگا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ اس دن لاہور سے والدہ کی کال آ گئی تھی۔ وہ کال سنتا ہوا باہر بالکونی میں چلا گیا تھا۔ شاید آٹھ دس منٹ لگ گئے تھے۔ اس دوران میں ارم نے یا اس کی کسی ساتھی نے کام دکھایا تھا۔ کیمرے میں اس تصویر کو دیکھ کر کسی سیل فون وغیرہ میں محفوظ کر لیا گیا تھا۔

یہ سارے خیالات بس دو چار سیکنڈ میں اس کے ذہن سے گزر گئے۔ شریفاں ناراض لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "صیب جی! وڈے بھائی جان غصے کے بڑے تیز ہیں۔ آپ کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔ آپ کے لیے چنگا ہی ہے کہ اب یہاں سے چلے جائیں۔"

ہادی نے کہا۔ "شریفاں! تم اس وقت [illegible] والے گھر میں ہو؟"

"ہاں جی ادھر ہی ہوں۔"

"کیا تم ایک دفعہ صرف ایک دفعہ میری بات اپنی باجی جان سے کرا سکتی ہو؟"

"توبہ کریں جی! کیسی گل کر رہے ہیں آپ؟ میری چمڑی اُدھڑ جائے گی۔ ویسے بھی میں آپ کو بتا دوں۔ باجی سے گل نہ کر کے آپ فائدے میں رہیں گے۔ وہ بھی بہت غصے میں ہیں۔ آپ سے بڑی سخت گل کریں گی۔"

''چلو سخت ہی کرے لیکن......''

''نہیں صیب جی!'' اس نے تیزی سے بات کاٹی۔ ''یہ اب نہیں ہو سکتا۔ میں تو بس اتنا کہنا چاہندی ہاں۔ آپ ساڈے علاقے کے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر اپنا پنڈ اپنے لوگ یاد آتے تھے۔ پر جو ہوا بہت بُرا ہوا۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ چلے جائیں یہاں سے۔''

اس سے پہلے کہ ہادی مزید کچھ کہتا۔ شریفاں تیزی سے بولی۔ ''اچھا کوئی اس پاسے آ رہا ہے۔ میں بند کرتی ہوں۔ رب راکھا۔''

فون بند ہو گیا۔ ہادی سکتہ زدہ سا بیٹھا رہا۔ حالات اس کی توقع سے کہیں زیادہ خراب تھے اور یقیناً اس خرابی میں اس کا اپنا کردار بہت زیادہ تھا۔ حجاب کے بار بار کے انکار کے باوجود وہ اس سے ملنے پر اصرار کرتا رہا اور ایک طرح سے اس کو جذباتی و اخلاقی دباؤ کا شکار کیا۔ تصویر والی غلطی بھی سراسر اس کی اپنی ہی تھی۔ اس نے تصویر اتاری اور مزید غلطی یہ کی کہ کئی ہفتے گزرنے کے باوجود اسے کیمرے میں ہی رہنے دیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی اس طرح تصویر تک پہنچے گا۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

اسے اب جانے کا بھاگنے کا مشورہ دیا جا رہا تھا۔ مگر وہ کیسے بھاگ سکتا تھا۔ وہ تو زنجیروں میں جکڑا گیا تھا۔ یہ زنجیریں عشق صادق کی ایسی دھات سے بنی تھیں جنہیں کبھی کوئی پگھلا سکا ہے نہ توڑ سکا ہے۔ یہ دکھائی نہ دینے والی زنجیریں بظاہر دھاگے سے کمزور ہوتی ہیں مگر اتنی مضبوط ہوتی ہیں کہ اپنے قیدی کو کھینچ کر موت کے منہ میں بھی لے جائیں تو وہ کسمسا نہیں سکتا۔ ہادی بھی یہاں سے جانے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ صرف اور صرف حجاب کی مصیبت کے بارے میں سوچ رہا تھا، اور یہ سوچ رہا تھا کہ اس مصیبت کو کیسے کم کیا جا سکتا ہے۔

O......❖......O

وہ رات اس نے جیسے زہریلے کانٹوں پر لوٹتے ہوئے گزاری۔ اگلے روز صبح پانچ بجے وہ اپنے کسی بھی دوست احباب کو آگاہ کیے بغیر ہوٹل سے چیک آؤٹ کر گیا۔ اس نے اپنا سیل فون بھی آف کر دیا تھا۔ بظاہر وہ اس شہر کو چھوڑ رہا تھا لیکن اصل میں صرف علاقہ بدل رہا تھا۔ دن نو بجے تک وہ روم سنٹرم کے گنجان علاقے میں ایک غیر معروف ہوٹل میں منتقل ہو چکا تھا۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل صاف ستھرا تھا۔ کسی اسپینی باشندے کا تھا۔ عملہ بھی زیادہ تر اسپینش ہی تھا۔ ہادی کے دل و دماغ میں آگ سی بھڑکی ہوئی تھی۔ ارم کا چہرہ بار بار اس کے تصور میں آتا تھا اور نفرت کی ایک بلند لہر اُٹھتی تھی۔ یہ عورت حجاب کی دشمنی میں بہت آگے نکل گئی تھی۔

دفعتاً گلزاری کا خیال ہادی کے ذہن میں آیا۔ اس نے سیل فون آن کیا۔ اس پر پہلے ہی گلزاری کا میسج آیا ہوا تھا۔ ''کال می۔''

ہادی نے اس کا نمبر ملایا۔ فوراً ہی گلزاری کی باریک آواز سنائی دی۔ ''ہیلو ہادی صاحب! آپ کہاں تھے۔ میں نے کافی فون کیے۔ آپ کے ہوٹل کے نمبر پر بھی کال کی۔ پتا چلا کہ آپ صبح سویرے نکل گئے ہیں۔ آپ کو تو دس بجے جانا تھا شاید۔''

''ہاں ..... پروگرام تبدیل ہوا ہے۔''

''اب کہاں ہیں آپ؟''

''سمجھو روم کے آس پاس ہی ہوں۔ بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال تم بتاؤ۔ کیوں کال کر رہے تھے؟''

''تھوڑی نیوز ہے جی! ارم کے بارے میں۔ پچھلے سال ارم سے میری بہت ہی کم ملاقات ہوئی ہے۔ اس دوران میں وہ کیا کرتی رہی ہے۔ اس کا کچھ کچھ کھوج اب مل رہا ہے۔ پچھلے سال وہ ایک آرٹس یونیورسٹی سے ایف اے کر رہی تھی۔ لیکن پتا چلا ہے کہ اس نے اپنا آخری سمسٹر فریز کرا دیا تھا۔ اس کی وجہ اس کی بیماری تھی۔ کم از کم یونیورسٹی کے ریکارڈ میں تو یہی بات بتائی گئی ہے۔ لگتا ہے کہ بیماری والی بات ٹھیک ہی ہے۔ کیونکہ ارم کی ایک دوست سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ چار پانچ ماہ یونیورسٹی سے غیر حاضر رہی۔ اس دوران میں ایک دو بار فون پر اس سے بات ہوئی تو وہ کافی کمزور محسوس ہو رہی تھی۔ اسے سینے یا گلے کی کوئی انفیکشن تھی جس کے بارے میں اس نے کھل کر کچھ نہیں بتایا۔''

''تم سے بھی اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔'' ہادی نے گلزاری سے پوچھا۔

''نہیں جی! اور اس سے مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ کوئی گڑبڑ معاملہ تھا۔ میں اس کی پوری ٹوہ لگا رہا ہوں جی۔ بس ایک دو دن میں، میں کسی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا۔''

''ایک دو دن کا مطلب ایک دو دن ہی ہو تو اچھا ہے۔ سمجھو کہ ارجنٹ قسم کا کام ہے۔''

''آپ محبت سے بول لیتے ہیں بس یہ قسم ہی قسم ہے جی۔ یقین کریں آج کل مجھے کھانا پینا بھولا ہوا ہے۔ اب بھی آپ ہی کے کام پر لگا ہوا ہوں۔ ایک کافی مہنگا کلب ہے۔ وہاں گھستا پڑا ہے۔ وہ اطالوی لڑکا اسٹیل آیا ہوا ہے یہاں جو یونیورسٹی میں ارم کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ اس کا پورا نام اسٹل گی وڈ ہے۔''

''خرچے وغیرہ کی فکر نہ کرو گلزاری! بس رزلٹ اچھا نکلنا چاہیے اور جلدی۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں جناب عالی!'' گلزاری نے سراپا عجز و انکسار بن کر کہا۔

وہ صحیح معنوں میں کرائے کا ٹٹو تھا۔ جتنا زیادہ بھاڑا، اتنی زیادہ وفاداری اور محنت۔

ہادی نے فون بند کر دیا اور صوفے پر نیم دراز سا ہو کر دراز ہو گیا۔ ارم کے بارے میں کئی سوال ذہن میں اُبھر رہے تھے لیکن یہ سارے سوال ایک گمبھیر پریشانی کے نیچے دب گئے۔ یہ حجاب کی پریشانی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ حجاب کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی۔ کیا گزر رہی ہو گی اس پر۔

O......❖......O

حجاب دو تین دن سے دریں والے گھر میں خاموش پڑی ہوئی تھی۔ شریفاں بہت اصرار کر کے اسے ایک دو لقمے کھلا دیتی تھی۔ دوبارہ جلال کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ بس اس نے اتنا کہا تھا کہ مار پیٹ کے اگلے روز شریفاں کو فون کیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ فلاں الماری میں فرسٹ ایڈ کی چیزیں پڑی ہیں۔ اگر حجاب کو کہیں مرہم پٹی کی ضرورت ہے تو کر دے۔

حجاب کو ہرگز خواہش نہیں تھی کہ جلال خود یہاں آئے۔ بلکہ وہ تو گیٹ کے قریب کسی گاڑی کا ہارن سن کر بھی ڈر جاتی تھی کہ کہیں یہ جلال کی گاڑی نہ ہو۔ یہ کیسی ستم ظریفی تھی۔ ایک بیوی جس کو اپنے شوہر کے قدموں کی آہٹ کا انتظار ہونا چاہیے۔ اس آہٹ سے دہشت زدہ تھی۔ یہ بات اب اچھی طرح حجاب کی سمجھ میں آ رہی تھی کہ اس گھر میں اس کی زندگی بدتر بلکہ بدترین ہو جائے گی۔ اگر وہ یہاں رہے گی تو بے حد حقیر صورت میں۔ تو پھر وہ کیا کرے؟ کس طرف جائے؟ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ ناقابلِ برداشت حبس بڑھتا جا رہا تھا اور تازہ ہوا کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر اپنی جان لینا حرام نہ ہوتا تو شاید وہ اس بارے میں بھی سوچنا شروع کر دیتی۔ ان تین دنوں میں اس کے ابو امی کی طرف سے بھی کوئی خبر نہیں تھی نہ کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ پتا نہیں ان پر کیا گزر رہی تھی کہتے ہیں کہ ٹوٹی ہوئی بانہیں گردن کی طرف ہی آتی ہیں۔ حجاب بھی غم کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ اسے اپنوں کی شدید ضرورت تھی۔ وہ جنہیں اپنے دل کا حال بتانا چاہتی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اب چھپانے کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ان کے سامنے اپنے سارے زخموں سے پردہ اٹھا دے اور پھر ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

پہلے اس نے فون کرنا چاہا لیکن پھر ارادہ بدل دیا۔ صورتِ حال اتنی بگڑی ہوئی تھی کہ فون کرنا بے معنی سا محسوس ہوا۔ اس نے شریفاں کو بتایا کہ وہ امی کے گھر جا رہی ہے۔ ان کی طبیعت خراب ہے۔ بلایا ہے۔

"کب تک آ جائیں گی باجی؟"

"ابھی کچھ پتا نہیں۔"

ملازم ٹیکسی لے آیا۔ حجاب اس گھر کی طرف روانہ ہو گئی جو مصیبتوں سے بھری اس دنیا میں اس کا واحد ٹھکانا تھا۔ اس کا دل شدت سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ امی ابو اور بھائی تک کیا باتیں پہنچی ہیں اور ان کی Feelings کیا ہیں۔ وہ بس یہی دعا کر رہی تھی کہ امی ان سارے حالات سے بے خبر ہوں۔ ان کی طبیعت پہلے ہی بگڑی ہوئی تھی۔

دن کے گیارہ بجے تھے جب وہ گھر میں داخل ہوئی۔ ملازم نے سلام کیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ "سب خیریت تو ہے نا؟" حجاب نے سہم کر پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"امی کہاں ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہیں جی! شاید سو رہی ہیں۔"

حجاب اندرونی حصے میں داخل ہوئی۔ کوئی دکھائی نہیں دیا۔ تپائی پر ایک شولڈر بیگ پڑا ہوا تھا۔ جس سے حجاب کو اندازہ ہوا کہ اس کی پھپھو بھی آئی ہوئی ہیں۔ ان کا نام زاہدہ تھا۔ حجاب دھڑکتے دل سے امی والے کمرے کی طرف گئی۔ دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا۔ یقیناً پھپھو بھی اندر ہی موجود تھیں۔ وہ گھر کے ڈرائنگ روم میں سے گزر کر اسٹڈی والے کمرے کی طرف آ گئی۔

"فیصل...... فیصل! کہاں ہو بھئی؟" اس نے چھوٹے بھائی کو پکارا۔

وہ تو نہیں آیا لیکن واش روم کی طرف سے ابو نمودار ہو گئے۔ حجاب نے ان کا چہرہ دیکھا اور دہل گئی۔ وہاں دنیا بھر کی سنجیدگی سمٹ آئی تھی۔ آنکھوں میں ایک ایسی بیگانگی تھی جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ٹھٹکے ہوئے انداز میں ان کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جب وہ اچانک مڑے اور تیز قدموں سے اسٹڈی روم میں داخل ہو گئے۔ اپنے پیچھے انہوں نے دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ لگا اس کے بالائی حصے کا شیشہ ٹوٹ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے وہ اپنے ابو کی طرف لپکی۔

"ابو جی! ابو جی!" اس نے کرب میں ڈوب کر کہا اور دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ اندر سے بولٹ تھا۔ وہ رو رہی۔ کسی ایسی بچی کی طرح جو چوٹ کھا کر آئی ہو اور اپنے باپ سے اپنا درد بیان کرنا چاہتی ہو۔ "ابو جان دروازہ کھولیں۔ پلیز ابو جان!" اس نے کہا اور دستک دینے لگی۔

اندر یکسر خاموشی تھی۔ وہ ہولے ہولے دستک دیتی رہی اور پکارتی رہی۔ "ابو جی! دروازہ کھولیں میری بات سنیں۔ ایک بار میری بات سن لیں۔" کوئی جواب نہیں آیا۔ آہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ جب جب اسے چوٹ لگی جب جب کوئی کھلونا ٹوٹا تھا۔ جب جب اسے کسی دکھ نے گھیرا تھا۔ اس نے اپنے ابو کو پکارا تھا۔ وہ تڑپ کر اس کی طرف آئے تھے۔ کبھی گود میں اٹھایا۔ کبھی سینے سے لگایا اور کبھی ماتھا چوما تھا۔ آج وہ ابو دروازہ کیوں نہیں کھول رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ایک چھوٹی سی بچی بن جائے۔ ایسی معصوم زبان میں پکارے کہ اس کے ابو دروازہ کھول دیں۔

وہ ان کی ٹانگوں سے چمٹ جائے۔ ان سے کہے۔ "ابو میرا کوئی قصور نہیں۔ پھر بھی مجھے مارا گیا ہے۔ ابو مجھے چوٹ لگی ہے۔ مجھے درد ہو رہا ہے۔"

وہ اسے گود میں اٹھا لیں۔ اسے پچکاریں ان کے سینے سے لگ کر وہ سب کچھ بھول جائے یکایک اسے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سامنے فیصل کھڑا تھا۔ وہ تیز سرگوشی میں بولا۔

"یہ کیا کر رہی ہیں باجی! اُدھر امی کے کمرے تک آوازیں جا رہی ہیں۔ وہ ابھی ابھی سوئی ہیں۔"

حجاب دروازے کے سامنے سے اٹھی اور سسکتی ہوئی اپنے چھوٹے بھائی کے گلے لگ گئی۔ فیصل کے انداز میں گرمجوشی نہیں تھی۔ اس کے بازو بے جان رہے۔ وہ کراہی۔ "فیصل! میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ تم تو جانتے ہو تمہاری بہن کیسی ہے۔ کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟ بتاؤ کیا وہ کر سکتی ہے؟"

فیصل خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے بمشکل اتنا ہی کہا۔ "آپ کو ابھی یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کو پتا ہی ہے امی کی طبیعت کتنی خراب ہے۔"

"تو میں کہاں جاؤں فیصل! تم ہی بتاؤ کہاں جاؤں۔"

"میں آپ کو کیا بتاؤں؟ لیکن اگر امی کو ان حالات کی بھنک بھی پڑ گئی تو وہ زندہ نہیں رہ سکیں گی۔"

"اچھا ..... مجھے بتاؤ فیصل کیا تم بھی ان باتوں پر یقین کرتے ہو جو میرے بارے میں کہی جا رہی ہیں؟"

اس سے پہلے کہ فیصل جواب میں کچھ کہتا۔ سامنے دروازے میں پھپھو زاہدہ کی صورت نظر آئی۔ حجاب کو دیکھ کر

ان کے چہرے پر لکیروں کا جال سا پھیل گیا۔ بچپن میں جب وہ اپنی بڑی بڑی سفید آنکھوں سے حجاب اور فیصل وغیرہ کو گھورتی تھیں اور کسی بات پر جھڑکتی تھیں تو وہ بالکل سہم جایا کرتے تھے۔ آج بھی حجاب کی کچھ یہی کیفیت ہوئی۔ انہوں نے سرسراتی آواز میں کہا۔ ''کب آئی ہو تم؟''

فیصل نے کہا۔ ''ابھی پانچ دس منٹ پہلے۔''

انہوں نے عینک کے پیچھے سے ایک تیز نگاہ حجاب پر ڈالی اور تحکم سے بولیں۔ ''ادھر آؤ میرے ساتھ۔'' اس کے بعد وہ فیصل سے مخاطب ہوئیں۔ ''تم امی کے پاس جاؤ۔''

حجاب نے ایک نظر اسٹڈی کے بند دروازے کی طرف دیکھا اور پھر کسی معمول کی طرح پھپھو کے پیچھے چل دی۔ وہ اسے لے کر چھوٹی سیڑھیوں کی طرف آ گئیں۔ سیڑھیوں کا دروازہ لاک تھا وہ اسے کھولنے لگیں۔ اسی دوران میں حجاب کی نگاہ سامنے کمرے میں گئی۔ یہ وہی بیٹھک کی دیوار گیر تصویر والا کمرہ تھا۔ حجاب کی نگاہ تصویر پر پڑی کوئی شخص جیسے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج اس کی آنکھوں میں حجاب کو دکھ کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ اس نے جیسے خاموش کی زبان میں حجاب سے کہا۔ ''تم نے اب سب کچھ دیکھ لیا نا حجاب! یہاں چھوٹی سی جسارت کو بھی بغاوت کا نام دیا جاتا ہے۔ تم سے بھی شاید وہی غلطی ہوئی جو مجھ سے ہوئی تھی۔ تم نے بھی مار کھا کر پیچھے ہٹتے ہٹتے کہیں ذرا سے قدم جمانے چاہے اور یہی تمہارا ناقابل معافی گناہ بن گیا۔

پھپھو اسے لے کر بالائی منزل کے ایک کمرے میں آ گئیں اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ گرجیں۔ ''اب کیا کرنے آئی ہو یہاں؟ ماں کی جان لینے آئی ہو؟ کوئی کسر رہ گئی تھی جواب پوری کرنی ہے؟''

وہ بلک پڑی۔ ''پھپھو! میں بے قصور ہوں۔ مجھ پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میں کیسی لڑکی''

''ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ تمہیں جانتے ہیں۔ لیکن جو کچھ سامنے آ رہا ہے اسے کیسے جھٹلائیں کس منہ سے انکار کریں۔ تُو نے کالک ملی ہے ہم سب کے منہ پر۔ تیرا باپ مسلسل رو رہا ہے تین دن سے۔ تیری ماں تیرے دُکھ میں پہلے ہی پڑی ہوئی ہے بستر پر۔ اب اور کیا چاہتی ہے تُو...... اور کیا چاہتی ہے؟'' انہوں نے آخری الفاظ اتنے زور سے کہے کہ پورے کمرے میں گونج سنائی دی۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''پھپھو! اگر آپ بھی مجھے گناہگار سمجھتی ہیں تو پھر اپنے ہاتھوں سے مجھے ختم کر دیجیے میری جان لے لیں۔ میں آپ سب کو اپنا خون معاف کرتی ہوں۔ پلیز پھپھو مار دیں مجھے۔''

''رونے چلانے سے جھوٹ سچ نہیں بن جائے گا۔ مجھے بتاؤ تم۔ کیا تم وینس میں اس لڑکے سے ملتی نہیں رہی ہو۔ کیا تم چوری چھپے یہاں ہوٹل میں اس کے پاس نہیں جاتی رہی ہو؟ تم نے نئی چادر خریدی، نئے جوتے اور بیگ لیا تا کہ کوئی تمہیں اس کے ساتھ دیکھ کر پہچان نہ سکے۔ تم نے اپنے شوہر کو دھوکا دیا، ہم سب کو دھوکا دیا۔ یہاں ماں سے یہ کہہ کر جاتی تھی کہ شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں اور وہاں اس کے ساتھ ہوٹلوں میں کھانے کھاتی تھی۔ کیا تم نے وینس میں ساری شرم حیا، اُتار کر پتلون اور شرٹ میں تصویریں نہیں بنوائیں۔ کس کس بات کو جھٹلاؤ گی تم...... تمہارا کس کس بات پر پردہ ڈالیں گے ہم۔ تم نے ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔''

وہ صوفے سے اُٹھ کر قالین پر بیٹھ گئی۔ اس نے پھپھو کے گھٹنوں پر سر رکھ دیا۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''پھپھو! مجھ سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن اتنی بڑی نہیں جتنی مجھے سزا دی جا رہی ہے۔ کسی نے میری بات سنی ہی نہیں۔ کسی نے مجھے صفائی کا موقع ہی نہیں دیا۔''

''کیا صفائی پیش کرے گی تُو کیا رہ گیا ہے تیرے پاس کہنے کو۔'' پھپھو نے اپنے گھٹنے جھٹک کر اسے دور ہٹانے کی کوشش کی۔

وہ ان کے گھٹنوں سے چمٹے چمٹے بولی۔ ''پھپھو! میں نے اس گھر میں بہت کچھ سہا ہے۔ جتنا آپ لوگوں کو پتا ہے اس سے دس گنا زیادہ جھیلا ہے۔ کبھی اُف نہیں کی لیکن پھپھو! میں کیا کروں۔ جو آخری ظلم مجھ پر ڈھایا جا رہا تھا وہ مجھ سے نہیں جھیلا گیا۔ مجھے خود اپنی ہی سمجھ نہیں آتی تھی کہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ شاید مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن یہ مجھ سے ہوا ہے پھپھو! میں اپنی غلطی مانتی ہوں۔ لیکن مجھے اس غلطی پر مجبور کر دیا گیا۔ اس بندے نے مجھے دھکیل دھکیل کر دیوار کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ اپنی سوچوں پر میرا اختیار ہی نہ رہا۔ آپ اسے جرأت کہہ لیں۔ مزاحمت کہہ لیں یا بغاوت مگر یہ ہوا مجھ سے۔ لیکن میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں۔ میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس کے لیے مجھے کسی کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں ہادی صاحب کے ساتھ گھومی پھری ضرور ہوں لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے میں فیصل کے ساتھ گھوموں یا آپ کے ساتھ گھوموں۔ مرد تو سب کچھ کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے کیا عورت کے لیے اتنی سی رعایت بھی نہیں۔''

''لیکن تُو کیوں گھومی پھری۔ کیا بن گئی تھی تیری جان پر؟ کیا ہمارے خاندان میں پہلے کبھی ایسا ہوا ہے۔ بغیر کسی کی اجازت کے تُو ایک غیر مرد کے ساتھ خود کو نقاب میں چھپا کر پارکوں اور ہوٹلوں میں پھرتی رہی۔ کون قبول کرے گا اسے۔''

''پھپھو! جن دنوں میں وینس گئی۔ ان دنوں مجھے پہلی بار پتا چلا تھا کہ جلال اور ارم میں تعلق ہے۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے لیے دنیا میں سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اتنی گھٹن تھی پھپھو! اتنی گھٹن تھی کہ کیا بتاؤں۔ مجھے لگتا تھا کہ میری سانس رُک گئی اور میں تڑپ رہی ہوں۔ میرا دل چاہا کہ میں کچھ دنوں کے لیے سب کچھ بھول بھال جاؤں۔ کوئی اور لڑکی بن جاؤں۔ کچھ اور ہو جاؤں۔ کھلی ہوا میں کھل کر سانس لوں۔ شاید بے موت مرنے سے بچ جاؤں۔ وہ جو تصویر آپ نے میری دیکھی ہے ان ہی دو تین دنوں میں اُتاری گئی ہے۔ میں مانتی ہوں یہ میری غلطی تھی۔ میں کیا بتاؤں پھپھو! مجھے جب جب ارم اور جلال کے بارے میں کوئی بات پتا چلتی تھی۔ مجھے کچھ ہو جاتا تھا۔ میں جلال سے تو کچھ نہیں کہہ پاتی تھی مگر میرے اندر ایک شدید گھٹن پیدا ہو جاتی تھی۔ اس گھٹن سے نکلنے کے لیے میں ہاتھ پاؤں چلاتی تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے۔ شاید یہ بھی ایک ردِعمل ہی تھا کہ میں چند بار ہادی صاحب کے ساتھ گھومنے پھرنے کے لیے نکلی۔ وہ بہت شریف بندے ہیں۔ میں امی ابو کی قسم کھاتی ہوں پھپھو! میرے اور ان کے درمیان کچھ نہیں ہے۔''

''کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے واویلا کرنے سے وہ داغ دھل جائے گا جو تمہارے اور ہم سب کے چہروں پر لگا

ہے۔ عورت کی عزت کتنی جلدی برباد ہوتی ہے یہ سب کچھ پتا ہے اور تمہاری عزت برباد ہو چکی ہے۔"

"کیوں برباد ہو چکی ہے پھپھو!" وہ بلکی۔ "مجھے اتنی سزا دیں جتنی میں نے غلطی کی ہے۔ میں نے چوری کی ہے تو میرا ہاتھ کاٹ دیں، مجھے پھانسی تو نہ چڑھائیں۔"

"تُو نے چوری نہیں کی۔ تُو نے ڈاکہ ڈالا ہے۔ اور اس ڈاکے میں تجھ سے ہم سب کی عزت کا خون ہوا ہے۔" پھپھو نے بے حد دُکھ سے کہا۔ "کیا تُو ننھی سی بچی تھی۔ کیا تجھے پتا نہیں تھا کہ یہ مردوں کی دنیا ہے۔ یہاں عورتوں کی غلطیوں کو معاف کرنے کا رواج نہیں ہے۔ ان کو سزا دینے کے لیے بہانے ڈھونڈے جاتے ہیں، اور تُو نے تو ایک ایسا بہانہ دیا کہ جس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا۔ جب تجھے پتا تھا کہ تُو جلال کو اس کے ارادے سے نہیں روک سکتی۔ پھر اپنے اندر بغاوت کے جراثیم کیوں پیدا ہونے دیئے تُو نے؟ جب تیرے پر کٹے ہوئے تھے تو پھر کیوں پھڑ پھڑائی۔ خود کو لہولہان کیا اور ہم سب کو بھی۔ تجھے پرلے درجے کا بیوقوف اور احمق نہ کہیں ہم؟"

"میں جانتی ہوں۔ مجھ سے بہت بُرا ہوا پھپھو! لیکن اب بتائیں میں کیا کروں۔ میں پھر کہتی ہوں۔ اگر میرے مرنے سے کچھ بہتر ہو سکتا ہے تو میں اسی وقت جان دینے کو تیار ہوں۔"

"جان دینا آسان ہوتا ہے، زندگی جینا مشکل۔ اب یہ زندگی جیسی بھی ہے اس کا سامنا کر۔"

"مجھے راستہ بتائیں پھپھو! مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ اب اس گھر میں میرے لیے تکلیف اور ذلت کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھ سے بڑا بیوقوف کون ہے۔ جلال اب شادی بھی کرے گا اور مجھے جوتے کی نوک پر بھی رکھے گا۔ وہاں میرے ساتھ بہت بُرا ہونے والا ہے۔ میں ان دیواروں میں گھٹ کر مر جاؤں گی۔"

"اس لیے تو کہہ رہی ہوں۔ مرنا آسان ہوتا ہے زندہ رہنا مشکل۔"

اسی دوران میں دروازے پر دستک ہوئی۔ "کون؟" پھپھو نے پوچھا۔

"میں ہوں فیصل!" باہر سے مدھم آواز سنائی دی۔

پھپھو زاہدہ نے دروازہ کھولا۔ فیصل نے دھیمے لہجے میں کچھ کہا۔ پھپھو زاہدہ حجاب سے مخاطب ہو کر بولیں۔

"تیرے ابو بلا رہے ہیں مجھے ابھی آتی ہوں۔ تُو نیچے نہ آ جانا واویلا کرنے کے لیے۔"

دروازہ زور سے بند کر کے وہ نیچے چلی گئیں۔ حجاب کو لگ رہا تھا کہ وہ آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہے۔ بالکل بے سہارا۔ بے خانماں۔ سینے میں اس کا دل چڑیا کی طرح پھڑک رہا تھا۔ یہ در و دیوار جو بچپن سے اس کے ساتھی تھے ایک دم اجنبی لگنے لگے تھے۔ جیسے وہ بھی اس سے خفا ہو چکے ہوں۔ اس کا جی چاہا کہ نیچے چلی جائے۔ ابو کی ٹانگوں سے لپٹ جائے۔ مگر پھپھو حکم دے گئی تھیں یہیں رہنے کا۔

پھپھو کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہوئی۔ ان کی سفید آنکھوں میں غم کی پرچھائیاں پہلے سے گہری تھیں اور بردبار چہرے کی لکیروں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے دروازہ دوبارہ اندر سے بند کیا۔ ٹھہری آواز میں بولیں۔

"حجاب! کل شام جلال آیا تھا یہاں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تمہارے ابو کے پاس بیٹھا رہا۔ اس نے بہت کچھ کہا جو ہمیں سننا

پڑا، ہم اس کے سامنے بولنے کے قابل کہاں ہیں۔ قرضے کی وجہ سے پہلے بھی نہیں تھے۔ اب تو کوئی کسر ہی نہیں رہ گئی۔ تیرے ابو کے دل پر بڑا بوجھ ہے۔ مجھے تو ڈر ہے انہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

"میرے ابو جی کو کچھ نہ ہونے دیجیے پھپھو! وہ پہلے ہی دُکھوں کے مارے ہوئے ہیں۔" وہ ان کے گھٹنے پکڑ کر سسکنے لگی۔

اس نے پھپھو کے چہرے پر پہلی بار قدرے نرمی کے آثار دیکھے۔ ان کی سفید آنکھوں میں نمی سی تیر گئی۔ وہ بولیں۔ "بیٹی! میں تیری منت کرتی ہوں۔ جو کچھ بھی ہے لیکن تُو واپس اپنے گھر چلی جا۔ یہی ایک راستہ ہے جس سے ہماری رہی سہی عزت بچ سکتی ہے۔ میں جانتی ہوں تیرے لیے بہت مشکل ہوگا لیکن اگر ہم سب کی بھلائی چاہتی ہے تو یہ کر گزر۔"

"پھپھو لیکن......"

"لیکن سے آگے انکار شروع ہوتا ہے بیٹی! انکار نہ کر۔ یہ دیکھ میں تیرے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد شوہر بیویوں کے منہ پر فوراً طلاق کے تین طمانچے مار دیتے ہیں لیکن جلال تجھے اب بھی رکھنے کو تیار ہے۔ یہ موقع گنوا دیا تو بہت پچھتانا پڑے گا۔ جا کر اس کے پاؤں کو ہاتھ لگا لے اور اس کی چھت کی پناہ لے لے۔ یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہے۔"

حجاب نے سر اُٹھا کر پھپھو کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ وہ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دل فگار لہجے میں کہا۔ "پھپھو! میرے ابو جی کیا کہتے ہیں؟"

"وہ بھی یہی کہتے ہیں بیٹی۔"

آنسو دھاروں کی طرح حجاب کی آنکھوں سے نکلے اور نیل زدہ رخساروں پر پھیلنے لگے۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ پھر حجاب اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ پھپھو نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ آہستہ آہستہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ وہ خاموشی سے ان کا کندھا بھگوتی رہی کچھ دیر بعد شکست خوردہ انداز میں بولی۔ "ابو جی سے کہیں ایک بار مجھ سے مل لیں۔"

"ابھی نہیں صاحب! ابھی وہ بہت پریشان ہیں۔ کچھ دن بعد میں خود ملواؤں گی تمہیں ان سے۔"

وہ ایک آہ بھر کر رہ گئی۔ پھر بولنے سے دیا ہوئی۔ "اچھا مجھے ایک بار امی کی صورت تو دیکھ لینے دیں۔"

وہ ذرا تذبذب کے بعد بولیں۔ "چل تُو ادھر بیٹھ۔ میں نیچے سے ہو کر آتی ہوں۔ پھر تجھے بتاتی ہوں۔"

وہ نیچے چلی گئی۔ حجاب اپنے ہی گھر میں غیروں کی طرح سکڑی سمٹی بیٹھی رہی۔ اس کا گھر کون سا تھا۔ یہ والا در اس کا کوئی بھی نہیں۔ کیا عورت کا اپنا گھر کوئی بھی نہیں ہوتا۔ کیا وہ زندگی کا بیشتر حصہ اپنے گھر کے بغیر ہی گزار دیتی ہے۔

چند منٹ بعد پھپھو آئیں اور اسے لے کر نیچے آ گئیں۔ "ایک بار پھر کہیں کوئی دکھائی نہیں دیا۔" وہ دوا کھا کر سوئی ہوئی ہیں۔ بس دروازے سے ہی دیکھ لو۔" پھپھو نے سرگوشی کی۔

کمرے کے دروازے کو نیم وا کر کے اس نے امی کو دیکھا۔ وہ کروٹ لے کر لیٹی ہوئی تھیں۔ برسوں کی بیمار نظر

آتی تھیں۔ گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر دواؤں کی بھرمار تھی۔ اس نے اپنی سسکی بمشکل روکی۔ آنکھیں آنکھوں میں ماں کی پیشانی چومی اور پلٹ آئی۔

O......❖......O

درس والا گھر یا پرانا گھر اب ایک زنداں تھا اور وہ اس کی قیدی تھی۔ اس زنداں کا داروغہ کون تھا۔ شاید وہی شخص جو تین برس پہلے اسے بڑی شان سے بیاہ کر لایا تھا۔ زنداں تو بہرحال زنداں ہوتا ہے لیکن جب قیدی فرار ہونے کی کوشش کرتا ہے اور پکڑ کر دوبارہ زنداں میں ڈالا جاتا ہے تو اس کی سزائیں مزید کڑی ہو جاتی ہیں۔ حجاب سے بھی تو یہی قصور ہوا تھا۔

حجاب نے خود کو درس والے گھر کی دیواروں تک محدود کر لیا۔ اس نے سیل فون مستقل طور پر بند کر دیا تھا۔ لینڈ لائن فون کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھالی تھی۔ سات آٹھ روز تک اسے کچھ خبر نہیں ہوئی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ جلال کے قدم بھی گھر میں نہیں پڑے تھے۔ نویں روز جلال گھر میں آیا۔ اس کے پاس کچھ کاغذات تھے۔ ایاب لہجے میں نے کچھ رسمی کلمات ادا کیے اور پھر کاغذات حجاب کے سامنے رکھ دیے۔ وہ مفتوح تھی۔ لڑائی ہار چکی تھی۔ اسے اپنا شہر فاتح کے حوالے کرنا تھا۔ اس نے خاموشی سے دستخط کر دیے۔

تین روز بعد شریفاں ہی کی زبانی اسے پتا چلا کہ جلال نے ارم سے نکاح کر لیا ہے اور اب وہ اس گھر میں مسز جلال ہے۔ نکاح میں دونوں طرف کے بیس تیس افراد ہی شریک ہوئے تھے۔ کہا جا رہا تھا کہ بعد میں کسی وقت ولیمے کی دعوت کی جائے گی۔ ارم نے اس گھر میں اپنے لیے وہی کمرہ چنا تھا جس کا چناؤ پہلے بھی حجاب کے دل کا حصہ کرتا رہا تھا۔ وہ شکست کے آداب جانتی تھی۔ اسے معلوم تھا اسے اب بہت کچھ جھیلنا پڑے گا۔

آٹھ دس روز بعد جب جلال کا کچھ ذاتی سامان درس والے گھر میں آیا تو حجاب حیران ہوئی۔ یہ جلال کے کپڑے تھے، اس کے جوتوں کے چند جوڑے، واش روم کا سامان اور اس طرح کی دیگر اشیاء۔ سامان لانے والے ملازمین نے بتایا کہ رات کو جلال صاحب تشریف لائیں گے، کھانا بھی ادھر ہی کھائیں گے۔

نو بجے کے لگ بھگ جلال آ گیا۔ اس کے موڈ کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بہرحال وہ آگ بگولا یا پیچ پا نہیں تھا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں کچھ دیر باغیچے میں چہل قدمی کرتے رہے۔ حجاب نے لرزتی آواز میں اسے شادی کی مبارک باد دی۔ جلال کی باتوں سے پتا چلا کہ اس نے ہفتے میں تین دن یہاں اور تین دن نئے گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔

وہ اس پر اعتراض کرنا چاہتی تھی۔ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے وہ اپنی نو بیاہتا بیوی کو وقت دے لیکن اعتراض کرنے، بلکہ شاید بولنے کا حق بھی وہ کھو چکی تھی۔

جلال پورے تین دن درس والے گھر میں رہا۔ لیکن اس سے حجاب کو کوئی خوشی نہیں ملی خوشی تو دور کی بات ہے وہ ایک عجیب سے درد بھرے تناؤ کا شکار رہی۔ وہ خود کو ایک بیوی سے زیادہ قیدی سمجھ رہی تھی۔ ایک ایسی قیدی جسے کسی شرمناک جرم میں سزا ملی ہو اور جس کی نگاہیں جیل حکام کے سامنے ہر وقت جھکی رہتی ہوں۔ یہ کیا احساس تھا؟

کیا سوچیں تھیں؟ وہ اپنے اندر ہی جیسے لہولہان ہوتی رہتی تھی۔ اس نے وینس میں ہادی سے ملاقات کے حوالے سے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا تھا وہ جلال نے خاموشی سے سن لیا تھا لیکن اعتبار نہیں کیا تھا اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

باہر کے حالات کی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک دن جلال کے دو تین خشک جملوں سے بس اسے اتنا پتا چلا تھا کہ اس کی امی کی طبیعت اب بہتر ہے ان کے ٹیسٹ بھی ٹھیک آئے ہیں۔

تین دن کے بعد جلال کی آمد بند ہو گئی۔ اب ایک بار پھر وہ تھی اور شریفاں تھیں۔ حجاب نے شریفاں کو سختی سے ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ باہر کی کوئی خبر اسے نہیں دے گی۔ اسی نے شریفاں کا سیل فون بھی اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ اسے شک تھا کہ شاید ہادی کے پاس شریفاں کا نمبر موجود ہے اور وہ اس نمبر پر رابطے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اب وہ ہادی کا خیال بھی ذہن میں لانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے نفرت سی ہو گئی تھی اس کے تصور سے۔ نماز کے بعد بھی وہ باقاعدگی سے یہ دعا کرتی تھی کہ وہ یہاں سے جا چکا ہو اور اب کبھی پلٹ کر اپنی صورت نہ دکھائے۔ وہ اپنے آپ کو بھی کوستی تھی کہ ایک ہیجانی کیفیت کے زیر اثر وہ اپنی حدود کو بھول گئی۔ ہادی کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی اور فراموش کر گئی کہ دل میں سچائی بھی ہو تو ظاہری عمل لوگوں کو انگلیاں اٹھانے کا موقع دیتا ہے اور مرد و زن کی بے جا قربت میں شر کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہادی کا اس سے بار بار رابطہ کرنا، اس کے گھر تک پہنچ جانا اور فوٹوگراف کے حوالے سے اس کی غفلت یہ سب چیزیں حجاب کو دکھ دیتی تھیں اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی تھی کہ شاید عورت کے معاملے میں سب مرد ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر کسی وقت وہ خود بھی اپنا تجزیہ کرنے بیٹھ جاتی۔ اسے لگتا کہ اس کے دل و دماغ کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس میں ایک اہم کردار بینش والے دردناک واقعہ کا بھی ہے۔ اس غیر انسانی کے اثرات نے اندر ہی اندر اس میں جڑ پکڑی اور جب باہر کے حالات بھی دگرگوں ہوئے تو اس کے اندر مزاحمت کی چنگاریاں چمک اٹھیں۔ وہی حقیقت کہ انسان کے اندر کے جذبے بھی نہ کبھی کسی نہ کسی طور اپنا اظہار ضرور کرتے ہیں۔

چوتھے روز جلال نے دوبارہ درس والے گھر آنا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ بھی تین دن اس کے پاس رہ کر وہ واپس نئے گھر چلا گیا۔ یہ سب دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت تھی۔ لیکن دھوپ بھی جلانے والی اور چھاؤں بھی۔ حسب توقع تین دن گزرنے کے بعد جلال کی آمد پھر شروع ہو گئی۔ وہ ہر وقت ڈری رہتی تھی کہ کہیں باتوں باتوں میں پھر کوئی نازک موضوع نہ چھڑ جائے۔ مگر شکر تھا کہ جلال ماضی قریب کی کسی بات کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ اس مرتبہ وہ اس کے لیے کچھ تحفے بھی لایا تھا۔ کچھ جوڑے کپڑوں کے تھے۔ ایک راڈو گھڑی تھی۔ اس مرتبہ وہ ہوٹل میں کھانا کھانے بھی گئے۔

یہ ساری دلکش باتیں تھیں۔ لیکن ان کے پیچھے جو وجہ تھی وہ بھی حجاب اچھی طرح جانتی تھی۔ اور اس وجہ نے جلال کی ان مہربانیوں کو بالکل بے معنی کر دیا تھا۔ وہ اپنے فلسفے کے مطابق اپنی دونوں بیویوں میں عدل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بے شک اسے ایسا کرنا چاہیے تھا اور خدا کا حکم بھی یہی تھا مگر اس عدل کی بنیادی شرط "محبت" اس سارے عمل میں سے اوجھل تھی۔ اور یہی کمی اس سارے عمل کو کھوکھلا و بے معنی کرتی تھی۔ ایک دن حجاب نے ہمت کر

کے کہہ دیا، آپ کہیں گھومنے پھرنے نہیں جائیں گے۔ میرا مطلب ہے۔ شادی کے بعد ارم کی خواہش ہو گی چھٹیاں کہیں گزارنے کی۔

''کیا مطلب؟''

''اسے لے جائیں کہیں۔''

''اس میں تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔ مجھے جب جانا ہوگا، چلا جاؤں گا۔'' جلال نے خشک لہجے میں کہا۔ پھر اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور جو کپڑے میں لایا تھا۔ ان میں سے کسی کو چھویا تک نہیں تم نے۔ کیا پسند نہیں آئے؟''

''نن..... نہیں..... ایسی بات تو نہیں ہے۔''

''تو پھر کیا وجہ ہے۔''

وہ کہنا چاہتی تھی، وجہ یہی ہے کہ دل مر گیا ہے لیکن ایسا کہنا ممکن نہیں تھا۔ وہ بولی ''ٹھیک ہے مم..... پہن کر آتی ہوں۔''

''نہیں..... اب ضرورت نہیں۔'' وہ جلے بھنے لہجے میں بولا اور اٹھ کر لان کی طرف چلا گیا۔

چوبیس پچیس روز بعد ہی وہ کھچاؤ نمایاں ہونے لگا جس کا ہونا بالکل منطقی تھا۔ جب حجاب والے تین دن شروع ہوتے تھے تو پہلا دن تو قدرے بہتر گزرتا تھا۔ گھر میں اور بیڈ روم میں بھی جلال کا موڈ قدرے بہتر تھا۔ لیکن دوسرے دن شام ہوتے ہوتے ایک طرح کی بیزاری جلال کے انداز میں نمایاں ہونے لگتی تھی۔ وہ جیسے واپسی کی گھڑیاں گننے لگتا تھا۔ طبیعت میں جھنجلاہٹ سی آ جاتی تھی۔ تیسرا دن وہ یکسر خراب موڈ میں گزارتا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے نکلنے کی بہت جلدی ہوتی تھی۔

وہ روم کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ہلکی بارش کے بعد موسم نکھرا ہوا تھا۔ حجاب کے تین دن آج شروع ہوئے تھے۔ جلال رات نو بجے پہنچ گیا۔ مگر آتے ہی اس کے فون کی بیل ہونے لگی۔ وہ فون سنتے سنتے اوپر چھت پر چلا گیا۔ حجاب جانتی تھی یہ ارم کی کال ہوگی۔ یہ کال دس پندرہ منٹ سے پہلے ختم نہیں ہوئی۔ وہ پہلے بھی فون کر لیتی تھی مگر اب اس کی کالیں لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ حجاب کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی تو وہ کرنے کے قابل کہاں تھی۔ وہ آداب شکست جانتی تھی اور مانتی بھی تھی۔

جلال کا حکم تھا کہ آج کھانا باہر کھائیں گے، وہ تیار ہو جائے۔ ساڑھے نو بجے کے قریب وہ تیار ہونے کے لیے چلی گئی۔ جلال کا لایا ہوا ایک نیا سوٹ بڑی دیر تک ہاتھوں میں پکڑے کھڑی رہی۔ اسے لگا کہ یہ لوہے کا لباس ہے اور آگ کی طرح تپا ہوا ہے۔ خود پر جبر کر کے اس نے اسے پہنا پھر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف آئی۔ اس نے سوچا کاش کوئی ایسا میک اپ ہو جو اس کے چہرے کو چھپا لے۔ خاص طور سے اس تاثر کو چھپا لے جو زنداں کے دارو غہ کو دیکھ کر نادم قیدی کے چہرے پر آتا تھا۔

وہ تیار ہو کر کمرے میں پہنچی تو جلال بستر پر نیم دراز تھا۔ ٹی وی دیکھتے دیکھتے وہ سو گیا تھا۔ لگتا تھا کہ پچھلے تین دن نے اسے کافی تھکا دیا ہے۔ وہ کافی دیر تک اس کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے اسے کندھے سے ہلایا۔ ''جلال..... جلال۔''

اس نے نیند میں بیزاری سے کچھ کہا اور کروٹ بدل لی۔ وہ دیر تک صوفے پر بیٹھی رہی۔ پھر کامن روم میں جا کر شریفاں سے باتیں کرنے لگی۔

شریفاں نے کہا۔ ''بھائی جان کے سر میں درد تھا۔ گولی بھی کھائی ہے انہوں نے۔ بارہ بجے کے قریب حجاب بھی نائٹی پہن کر بیڈ روم میں چلی گئی، اور بہت ہولے سے جلال کے پہلو میں لیٹ گئی۔ وہ اسے جگانا نہیں چاہتی تھی۔

صبح جلال کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ حجاب سے پہلے ہی جاگ گیا تھا۔ جونہی حجاب اٹھی اور بازو اوپر اٹھا کر اپنے بالوں کو باندھنا شروع کیا۔ وہ اندر آ گیا۔ ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ غصے سے بولا۔ ''کیا ہو گیا تھا رات کو۔ تم نے جگایا ہی نہیں۔''

''میں نے جگایا تھا جلال! آپ اٹھے نہیں۔''

''غلط کہہ رہی ہو تم۔'' وہ پھنکارا ''سو رہا تھا مر تو نہیں گیا تھا۔ تمہارا ویسے ہی ارادہ نہیں تھا جانے کا۔ بہانے ڈھونڈتی ہو تم۔ سوگ منا رہی ہو تم پتا نہیں کس کس پیارے کا۔''

''جلال! میں قسم کھاتی ہوں کہ.....''

''قسم مت کھا۔'' وہ گرجا۔ ''جھوٹی ہے تُو ہمیشہ جھوٹ ہی بولے ہیں تُو نے۔ اب بھی جھوٹ بول رہی ہے۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ سب دیکھتا ہوں۔ پرانے یارانے لہولہان کر رہے ہیں تیرے دل کو۔''

''خدا کے لیے جلال الزام مت لگائیں مجھ پر۔''

''یہ بیجا یہ الزام ہے۔ بہتان ہے۔'' وہ دانت پیس کر بولا پھر طیش میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''الو کی پٹھی، حرام زادی، یہ بہتان ہے؟'' اس کا پہلا تھپڑ اتنا زور دار تھا کہ حجاب لڑھک کر قالین پر جا گری۔ اس کے بعد جیسے اسے کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔ لاتیں، تھپڑ، گھونسے، اتنے تواتر سے اس کے جسم پر پڑے کہ وہ بھول گئی، جسم کے کون سے حصے کا دفاع کرے اور کون سا اس کی بے رحمی کے سامنے کھلا چھوڑ دے۔ اس کی نائٹی سامنے سے پھٹ گئی۔ زیریں لباس نظر آنے لگا۔ وہ گری ہوئی تھی۔ جلال نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ اس کو لگا کہ سانس رک جائے گا اور وہ مر جائے گی۔ اس کا منہ بے ساختہ کھل گیا اور وہ سانس کے لیے تڑپنے لگی۔ یہی وقت تھا جب شریفاں روتی چلاتی اندر آئی اور جلال کے قدموں میں گر پڑی لیکن اس کی دوراُفتادہ آواز حجاب کے کانوں میں پڑی۔

''وڈے بھائی جان! معاف کر دیں۔ مر جائے گی۔ ختم ہو جائے گی۔''

اس کی نگاہیں دھندلا رہی تھیں۔ بس اتنا پتا تھا کہ وہ سانس کے لیے تڑپ رہی ہے اور اس کی گردن پر ایک بے رحم پاؤں ہے۔ پھر وہ موت کے منہ سے پلٹ آئی۔ گردن پر سے دباؤ ختم ہو گیا۔ اُکھڑی ہوئی ہوا دیوانہ وار سینے میں داخل ہوئی اور اسے زندگی کی طرف واپس کھینچنے لگی۔ وہ بے تحاشہ کھانستے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ اسے ابکائیاں آ گئیں۔ معدہ تو کل دوپہر سے خالی تھا ورنہ وہ سب کچھ اُلٹ دیتی۔ جلال کی گرجتی آواز اس کے کانوں کو مجروح کر رہی تھی۔ تُو

ان چیزوں کے لائق ہی نہیں ہے۔ تجھے راس ہی نہیں ہے، یہ عزت اور یہ آرام، تُو بس ماتم کر، سوگ منا اپنے باقی سوتوں کا۔ اس نے زور سے ہاتھ مارا اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی آرائش کی اشیاء چاروں طرف بکھر گئیں۔ پھر اس نے وارڈ روب کھولی۔ اس میں سے تنے سوٹ نکال نکال کر قریبی برآمدے میں ڈھیر کر دیے۔ وہ جیسے غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے پرفیوم کی ایک بڑی بوتل توڑ کر ان کپڑوں پر چھڑکی اور لائٹر سے آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس نے لیڈیز راڈو گھڑی، حجاب کا موبائل، چارجر اور اس طرح کی کئی چیزیں آگ میں پھینک دیں۔

شریفاں، چوکیدار طارق، ڈرائیور رمضان، ڈرے سہمے کھڑے تھے۔ جلال نے ایک الماری میں سے کچھ پرانے کپڑے نکالے اور حجاب کے سامنے پھینکتے ہوئے دھاڑا۔ "یہ پہن اور اپنے منہ پر لعنت بھیج کر بیٹھی رہ کمرے کے اندر تُو اسی لائق ہے تُو اس قابل ہی نہیں ہے کہ تجھے کمرے سے نکالا جائے۔ تیرے جیسی بے اعتباری عورتوں کے لیے یہی حکم ہے کہ ان کو کمروں میں بند رکھا جائے۔ وہ پیار سے نہیں مار سے سیدھی ہونے والی ہوتی ہیں۔ میں تجھے کروں گا سیدھا...... میں کروں گا۔"

وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ برآمدے میں جلتے کپڑوں میں ابھی تک چھوٹے بڑے شعلے حرکت کر رہے تھے۔

O......❖......O

ہادی غرابے ہوٹل میں تھا۔ اس کے دل کی حالت عجیب تھی۔ ملازمہ شریفاں سے حجاب کی حالت زار کا سن کر اس کا چین سکون غارت ہو گیا تھا۔ حجاب کا خیال تو پہلے بھی ایک پل اس سے جدا نہیں ہوتا تھا لیکن اب تو اسے حجاب کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ یہ دیوانہ کر دینے والی سوچیں تھیں۔ وہ کہاں ہو گی، کیا کر رہی ہو گی، اس کے بارے سوچ رہی ہو گی، کیمرے میں رہ جانے والی تصویر بھی اس کے ذہن سے نکلتی نہیں تھی۔ یہ بڑی غلطی کی تھی اس نے۔

وہ یہاں سیر و تفریح کے لیے آیا تھا۔ جگہ جگہ گھومنا چاہتا تھا۔ دنیا کے عجائبات دیکھنا چاہتا تھا لیکن ہوا کیا تھا۔ وینس کی اس رات میں اس نے ایک لڑکی کو دیکھا تھا اور باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ اب اس کا ویزا ختم ہونے میں بمشکل تین دن بچے تھے۔ شینو بھائی کے کہنے پر ڈپٹی انسپکٹر ہاشم کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح ویزے کی ایکسٹینشن ہو جائے۔

ابھی تک کوشش کے باوجود اسے حجاب کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ شریفاں کا سیل فون بھی مسلسل بند جا رہا تھا۔ حجاب کے والدین کے گھر جانا اب اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ پچھلی دفعہ بھی حجاب بہت ناراض ہوئی تھی۔ یہ بے خبری اور دوری ہادی کے دل و دماغ میں تہلکہ مچا رہی تھی۔ اسے ایک ایسے کرب کا احساس ہوتا تھا جس کا اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ تاہم ایک بات تھی۔ کرب کی اس بدترین صورت حال میں سے ایک چیز اچھی برآمد ہو رہی تھی۔ یہ شاعری تھی۔ وہی شاعری جو کافی عرصے سے روٹھ چکی تھی۔ اب بڑے تواتر سے اس کے زخمی دل پر دستک دے رہی تھی۔ اس نے پچھلے دو تین ہفتوں میں کوئی ڈیڑھ درجن گیت لکھے تھے اور شینو بھائی کو ارسال کیے تھے۔ شینو بھائی اس صورت حال پر بے انتہا خوش تھے۔ وہ ایک البم کی ریکارڈنگ شروع کرانے والے تھے اور دوسرے کی کاغذی تیاری کر رہے تھے۔ ویسٹرن یونین کے ذریعے وہ بھاری بھرکم رقوم بھی انہوں نے ہادی کو ارسال کر دی تھیں۔

اب بھی ہادی کے ہاتھ میں حجاب کا دیا ہوا پارکر قلم تھا۔ وہ ایک نظم مکمل کر رہا تھا۔ اس طویل نظم کا خلاصہ کچھ اس طرح تھا۔

میں نے جب پہلی بار اسے دیکھا تو وہ نہروں کا شہر تھا
وہ ایک طلسمی رات تھی
مجھے یہی لگا کہ میں ہزاروں برس سے اسے جانتا ہوں
ہزاروں سال سے میں اس کی روشن پیشانی پر
اور سحر انگیز مسکراہٹ پر گیت کھلا رہا ہوں
ہزاروں سال گزرے ہیں جب سے وہ میرے سنہری سپنوں میں آ رہی ہے
محبت سے مسکرا رہی ہے
کیا ایسا ہو سکتا ہے کیا اس زندگی سے پہلے بھی کوئی زندگی موجود تھی؟
اگر تھی تو کیا میں وہاں پلٹ سکتا ہوں
جہاں میری طرح اس کے دل میں بھی پیار کا سمندر موجزن تھا
یہ بے خبری نہ تھی، یہ دوریاں نہ تھیں۔

ہادی جب بھی نظم، غزل یا گیت وغیرہ لکھتا تھا اس کی اندرونی تڑپ کچھ کم ہو جاتی تھی لیکن آج یہ نظم لکھ کر تڑپ کچھ اور بڑھ گئی۔ کیا مرض میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اتنے میں کمرے کے دروازے پر نازک سی دستک ہوئی۔ یس کم ان اس نے کہا۔

ایک اطالوی لڑکی نہایت چست منی اسکرٹ میں دروازے پر نظر آئی۔ وہ کافی حسین تھی۔ "مے آئی کم ان" وہ دلربا انداز میں بولا۔

"یس۔" ہادی نے کہا۔

وہ اندر آ گئی۔ اور سراپا دعوت بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ چپ تھی مگر اس کا سارا جسم پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اس شب میں اور اس کمرے میں میری ساری رعنائیاں برائے فروخت ہیں۔ ان ہوٹلوں میں ایسی کچھ پیشکشوں سے اکثر پالا پڑتا رہتا تھا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"نو تھینک یو۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"او کے۔" اس نے خوش دلی سے کہا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کر دیا۔

ہادی نے نیا سگریٹ سلگایا۔ مگر اب سگریٹ سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ پتا نہیں دل و دماغ کی کیفیت کیا تھی کہ اس نے وہ کام کیا جو شاذ و نادر ہی کرتا تھا، اس نے روم سروس کے ذریعے الکحل کا آرڈر دے دیا۔ چند منٹ بعد باوردی ملازم شمپین کی سفید بوتل لیے آن موجود ہوا۔ ساتھ میں روسٹ چکن کے پیس تھے۔ ہادی نے بوتل کھول

لی آتش سیال گلاس میں انڈیلا لیکن پتا نہیں کیوں اسے ہونٹوں تک نہیں لے جا پایا۔ اسے یہ سب کچھ کبھی بھی اچھا نہیں لگا تھا اور اب تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں رہ رہ کر حجاب کا چہرہ آ رہا تھا۔ جب وہ وینٹی کن کے ایک پارک میں اسے اپنی دوست بینش کی غم انگیز کہانی سنا رہی تھی اس نے شراب کا ذکر بڑے نفرت انگیز انداز میں کیا تھا۔ فیروز کی شراب نوشی کا بتاتے ہوئے اس کی پیاری سی ناک پر کراہت کی بہت سی سلوٹیں اُبھر آئی تھیں۔

ہادی کچھ دیر سوچنے کے بعد بستر سے اُٹھا اور واش روم میں جا کر بوتل واش بیسن میں اُلٹ دی۔

کچھ ہی دیر بعد وہ بے دم سا پھر بستر پر لیٹا تھا۔ بات صرف الکحل کی ہی نہیں تھی پچھلے ایک دو ماہ میں بہت تبدیلیاں آئی تھیں اس میں۔ ہر وہ چیز جو حجاب کو بُری لگی تھی اسے بُری لگنے لگی تھی۔ کسی وقت تو اسے یوں لگتا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں مثلاً بولنے، مسکرانے، اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے میں بھی حجاب کی پسند ناپسند کا خیال رکھنے لگا ہے۔ اس کا وجود ویسے غیر محسوس طور پر اس کے وجود میں گم ہو رہا تھا۔ یہ عشق کی پتا نہیں کون سی پرت تھی کہ شاید عشق جب میں ...... میں نہیں رہتا تو بننا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ لیٹا رہا اور سوچتا رہا۔ وہی بے مثال، روشن پیشانی، وہی دلکش مسکراہٹ جو اسے ہر طرف سے گھیر لیتی تھی۔ اور وہ ہزار سال سے اس مسکراہٹ کو جانتا تھا۔ یہ کتنا انوکھا جذبہ تھا، یہ کتنا طاقتور تھا۔ پوری کائنات کو اپنے مدار پر حرکت دے سکتا تھا۔ دیکھا جاتا تو ہادی کو کیا حاصل نہیں تھا۔ وہ ابھی دس منٹ کے اندر، دنیا کی بہترین آسائشیں اور رنگینیاں اس کمرے میں موجود کر سکتا تھا لیکن وہ لڑکی جو اس کی تھی بھی نہیں۔ جو پتا نہیں کہاں بیٹھی تھی، اس کی تمام ڈوریاں اپنے ہاتھوں میں لے چکی تھی۔ وہ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ کچے دھاگے سے بھی کچی یہ ڈوریاں، دنیا کے مضبوط ترین بندھن کا روپ دھار چکی تھیں۔ یہ وہ بندھن تھا جو اسے لاہور سے چل کر یہاں آیا تھا۔

ہادی کے ذہن میں جب جب حجاب کی بے بسی کا خیال آتا تھا، تب تب ارم کی کامرانیوں کا خیال بھی آتا تھا۔ حجاب کی محبت کے ساتھ ارم سے نفرت بھی اتنی ہی شدت سے اُبھری تھی۔ اس کی عیار چمکیلی آنکھیں، ہادی کے سینے میں شعلے سے بھڑکا دیتی تھیں۔

اس وقت اس کی سوچ کا دھارا ارم کی طرف تھا جب فون کی بیل ہوئی۔ یہ اس کا نیا نمبر تھا جو صرف شیخو صاحب اور اس کے گھر والوں کو معلوم تھا یا پھر اٹلی میں گلزاری کو معلوم تھا۔ یہ گلزاری کی کال تھی۔ اس کی آواز جوش سے لرز رہی تھی۔ "ہادی صاحب! بڑی کڑاکے دار اطلاع ہے۔ ارم کے سلسلے میں مکمل بریکنگ نیوز مل گئی ہے۔"

"زبردست..... کیا معلوم ہوا؟"

"ایسے نہیں سر! ملاقات کا شرف بخشئے۔ کہاں ٹھہرے ہیں آپ؟"

گلزاری کے منہ سے جیسے رال ٹپک رہی تھی۔ ظاہر ہے تگڑی خبر کے بدلے وہ تگڑے انعام کی توقع کر رہا تھا اور انعام فون پر تو نہیں مل سکتا تھا۔

ہادی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے گلزاری۔ تم روم میں برانٹ اسکوائر پر پہنچ جاؤ۔ جانتے ہو نا؟"

گلزاری نے اثبات میں جواب دیا۔

ہادی بولا۔ "مین روڈ پر کافی بڑا آئس کریم پارلر ہے سوزے کے نام سے۔"

"یس سر...... یس سر! میں سمجھ گیا۔"

"میں وہاں کھڑا ہوں گا۔ مجھے وہاں پہنچنے میں بیس پچیس منٹ لگیں گے۔"

"ٹھیک ہے جناب! میں آ رہا ہوں۔" گلزاری نے کہا۔

"قریباً ایک گھنٹے بعد وہ دونوں لب سڑک اس آئس کریم پارلر میں بیٹھے تھے۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ یہ ویک اینڈ کی رات تھی، اس لیے روم چنچل حسینہ کی طرح چمک رہا تھا، تھرک رہا تھا اور جھوم رہا تھا۔

تمہید کے بعد گلزار نے انکشاف انگیز آواز میں کہا۔ "ہادی صاحب! ارم قریباً ایک سال پہلے ایک پرائیویٹ کلینک "وکٹوریہ فورنا" سے ابارشن کرا چکی ہے۔ وہ پچھلے سال ستمبر کی چوبیس سے اٹھائیس تاریخ تک کلینک میں باقاعدہ داخل رہی ہے۔ میرے پاس ڈاکومینٹری ثبوت موجود ہیں۔"

اس نے دو تین پیپر نکال کر ہادی کے سامنے رکھ دیئے۔

ہادی نے پیپر دیکھے۔ یہ واقعی زبردست انکشاف تھا۔ پیپر انگلش میں تھے اس لیے ہادی کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ یہاں باقاعدہ ارم چودھری کا نام اور اس کے دیگر کوائف لکھے تھے۔ پری اور پوسٹ آپریشن ٹریٹمنٹ کا ریکارڈ بھی تھا۔ ان پیپرز کے مطابق ارم قریباً چار ماہ کی حاملہ تھی اور کسی وڈ نامی اطالوی بوائے فرینڈ کے ساتھ کلینک میں آئی تھی۔

گلزاری نے واقعی کارکردگی دکھائی تھی۔ مختلف کلیوز کا سہارا لے کر اس گمنام کلینک تک جا پہنچا تھا جہاں ایک سال پہلے ابارشن کرایا گیا تھا۔ درحقیقت یہی وہ بیماری تھی جس کا ذکر یونیورسٹی کے ریکارڈ میں بھی تھا لیکن وہاں چھاتی اور گلے کی انفیکشن وغیرہ کی بات کی گئی تھی۔

ہادی نے ایک گہری سانس لی۔ پیپرز پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا۔ "او کے مسز ارم جلال! تم سے حساب کتاب کرنے کا وقت آ گیا ہے۔"

O......O

ارم کو دل کی مراد مل گئی تھی۔ ایک طرح سے اس نے حجاب کو شکست فاش دی تھی لیکن ابھی وہ سمجھتی تھی کہ فتح مکمل نہیں۔ فتح مکمل تو تب ہوتی جب جلال اسے اپنی زندگی سے بھی نکال دیتا۔ اسے طلاق دے دیتا۔ لگتا تھا کہ وہ اس حد تک جانے کو تیار نہیں۔ شاید وہی عورت کی ملکیت والا جذبہ زیادہ سے زیادہ عورتوں کو اپنے دائرہ اختیار اور حق استعمال میں رکھنا۔ کئی کئی عورتوں کا حرم بنا لینا۔

خیر موجودہ صورت حال بھی کچھ ایسی بُری نہیں تھی۔ ارم جانتی تھی کہ حجاب کی زندگی پھولوں کا نہیں، کانٹوں کا بستر ہے۔ کپڑوں کو آگ لگانے والے تازہ واقعے کے بعد تو حجاب کی زندگی مزید مشکل ہونے والی تھی۔ وہ جلال کی نفرت کی نوک پر آ چکی تھی اور اب اس سے باقی لونڈی والا سلوک متوقع تھا۔ (کپڑوں کو آگ لگانے والی خبر ملازمین کے ذریعے ہی لیک آؤٹ ہوئی تھی)

نو بج چکے تھے۔ جلال کے آنے میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ وہ نہا دھو کر کپڑے بدل چکی تھی۔ سرخ ستارہ

ساڑھی، طلائی بُندے، ڈائمنڈ کا وزنی ہار اور کلائیوں میں پھولوں کے گجرے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی نظر سنگِ مرمر کے بڑے گلدان پر پڑی۔ چند ماہ پہلے حجاب یہ وینس سے لائی تھی اور بڑے اہتمام سے یہاں سیڑھیوں کے پاس سجایا تھا۔ اب ارم اسے یہاں سے ہٹا دینا چاہتی تھی۔ اس نے ایک ایک کر کے گھر میں سے ایسی بہت سی اشیاء اٹھوا دی تھیں جو خاص حجاب نے رکھی تھیں۔ ایک خم دار صوفہ، کامن روم کا سنہری فون سیٹ اور دہلی خاندان کے کسی استاد کاریگر کی بنائی ہوئی منقش تپائی جو ٹی وی لاؤنج میں بڑی شان سے رکھی گئی تھی۔ یہ گلدان بھی ارم کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ یہ جلال کو بھی اچھا لگتا ہے اور اگر اس نے ہٹانا چاہا تو شاید جلال روکے گا۔

سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے جیسے نفرت کی ایک بلند لہر ارم کے سینے سے اٹھی۔ شاید وہ اپنے آپ کو روک لیتی مگر کچھ غلطی بے چارے گلدان سے بھی ہوئی تھی۔ ارم کی ساڑھی کا پلو گلدان میں رکھے آرٹی فیشل پلانٹ سے الجھ گیا۔ ارم کو تو جیسے بہانہ درکار تھا۔ اس نے پلو کو اتنی جھنجلاہٹ سے چھڑایا کہ گلدان کا گرنا لازم ٹھہرا۔ وہ چھناکے سے لڑھکا اور پھر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

ملازمہ کلثوم اور آپا خانم تیزی سے اندر آئیں۔ اس وقت ارم بیٹھی گلدان کے ٹکڑے اکٹھے کر رہی تھی۔ "ہائے اللہ چوٹ تو نہیں لگی میری بچی کو۔" آپا خانم نے دلار سے کہا۔

ارم نے نفی میں سر ہلایا۔ یہی وقت تھا جب جلال بھی آ گیا۔ چند لمحے سیڑھیوں کے نچلے سرے پر ساکت کھڑا رہا پھر چڑھ کر اوپر آ گیا۔ "اچھا چھوڑو ارم! ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔ اب ہاتھ زخمی نہ کر لینا۔" وہ بولا۔

ملازمہ بھی ٹوکری لے کر آ گئی تھی۔ وہ ٹکڑے سمیٹنے لگی۔ ارم نے افسردہ لہجے میں بتایا کہ کس طرح اس کا پلو الجھا اور گلدان گر گیا۔

جلال اسے لے کر کمرے میں آ گیا۔ "تم نے نماز پڑھ لی؟" اس نے پوچھا۔

"جی ہاں!" وہ سر پر پلو درست کر کے بولی۔ تب اس نے مصنوعی حیرت سے دیوار پر آویزاں کیلنڈر پر نظر ڈالی اور جلال کو دیکھ کر بولی۔ "آج تو آپ کو باجی حجاب کی طرف جانا تھا۔"

"نہیں...... اِدھر ہی رہوں گا۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن کیوں جلال؟" وہ پیشانی پر سلوٹیں ڈالتے ہوئے بولی۔ (حالانکہ درس والی کوٹھی میں جو کچھ ہوا وہ سب اسے ڈرائیور عثمان کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔)

"بس کہہ دیا نا۔ نہیں جانا۔"

ارم نے شیروانی کے بٹن کھولنے میں اس کی مدد کی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا تو وہ عقب میں کھڑی ہو کر اس کے کندھے دبانے لگی۔ وہ اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ اپنے جسم کا بیشتر ہیجان خیز گداز جلال کے جسم میں منتقل کر رہی تھی۔

"ایک بات کہوں، بُرا نہ مانیے گا۔" وہ بولی۔

"کہو۔"

"آپ باجی کو اس طرح تنہا نہ چھوڑیں۔ انہیں آپ کی ضرورت ہے۔ وہ ٹوٹی ہوئی ہیں اور بندہ اندر سے ٹوٹا ہوا ہو تو کوئی غلطی بھی کر سکتا ہے۔"

"کیا خود پر تیل چھڑک لے گی وہ؟" جلال نے جھنجلا کر کہا۔

"نہیں جلال! میں اور بات کر رہی ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ......" وہ جان بوجھ کر خاموش ہو گئی۔

جلال نے پلٹ کر ذرا غصے سے دیکھا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا ہو۔ تمہیں پتا ہے مجھے ادھوری بات پسند نہیں۔

وہ اس کے سینے کے بالوں پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں آپ کو پریشان کرنا نہیں چاہتی لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ یہاں سے گیا نہیں ہے۔ یہیں کہیں منڈلا رہا ہو گا۔ وہ کہیں باجی سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کرے۔ ہم اس کی دیدہ دلیری دیکھ ہی چکے ہیں۔ یہاں ہمارے گھر تک پہنچ گیا اور مہمان بن کر خدمتیں کراتا رہا۔ پھر باجی کے ماں باپ کے گھر پہنچ گیا۔ مجھے نہیں لگتا وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑے گا۔ ایسے بندے اچھی بھلی عورت کی مت مار دیتے ہیں۔ مجھے پتا ہے پہلے بھی باجی کا اتنا قصور نہیں ہو گا۔ اسی نے انہیں ورغلایا اور اتنی بڑی مصیبت میں ڈالا ہم سب کو۔"

جلال بے چین سا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ارم کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ظہیر کہہ رہا تھا وہ جا چکا ہے یہاں سے۔ شاید اٹلی گیا تھا۔ اب تو اٹلی سے بھی دفع ہو چکا ہو گا۔"

"پتا نہیں کیوں جلال! مجھے ایسا نہیں لگتا۔ اور میں آپ کو ایک دوسری بات بھی بتا دوں جو شریفاں ہے نا یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ یہ جانتی ہے سب کچھ۔ باجی کی رازدار کی طرح ہے۔ ڈرائیور عثمان کل بتا رہا تھا کہ شریفاں کا فون آج کل اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ اس نے باجی کو دیا ہوا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"وہ فون باجی نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ پتا نہیں کیوں؟ اس کے ساتھ ہی ارم نے دراز میں سے ایک پرانا سا فون نکالا۔ اس میں ایک پرانی سم تھی۔ اس نے جلال کے سامنے ہی شریفاں کا نمبر پریس کیا۔ بیل جاتی رہی۔ مگر کسی نے اٹھایا نہیں۔ تیسری چوتھی کوشش پر دوسری طرف سے بھرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ہیلو کون؟" یہ حجاب کی آواز تھی۔ اسپیکر چونکہ آن تھا اس لیے یہ آواز جلال نے بھی سنی۔ ارم نے فون بند کر دیا۔ جلال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

اس نے ارم سے فون لے کر دوبارہ نمبر پریس کیا۔ مگر اب فون بند ہو چکا تھا۔

ارم نے کہا۔ "میں آپ کو یقین سے کہتی ہوں جلال! یہ شریفاں ٹھیک نہیں ہے۔ باجی حجاب نے تو اسے بعد میں ملک والی کوٹھی بلایا ہے یہ پہلے ہی وہاں جانے کے لیے پھڑپھڑا رہی تھی بڑا دل لگتا ہے اس کا باجی کے آس پاس۔"

جلال کا موڈ بری طرح غارت ہو چکا تھا۔ چائے پی کر وہ اسٹڈی میں چلا گیا۔ وہاں سے پندرہ بیس منٹ بعد نکلا تو کہیں جانے کے لیے تیار تھا۔ "ہائے اللہ! ابھی تو آئے ہیں اب کہاں جائیں گے۔" ارم سینے پر بنارسی پلو درست کر کے ادا سے بولی۔

"ذرا کام ہے۔" جلال نے مختصر جواب دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

"دیکھیں میری بات سنیں۔ باجی سے کوئی ایسی ویسی بات نہ کیجیے گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چند قدم پیچھے گئی۔ "کھانا تو گھر میں کھائیں گے نا جلال۔"

"شاید" اس نے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ بھنایا ہوا تھا۔

اس کے جانے کے بعد ارم نے ایک لمبی سانس لی اور لگژری صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

قریب ہی پلیٹ میں سیب اور سیاہ انگور پڑے تھے اس نے انگور کا ایک چھوٹا سا گچھا اٹھایا اور لیٹے لیٹے ہی انگور کے دانے منہ میں گرانے لگی۔ دو چار منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کے فون پر بیل ہوئی۔ نامعلوم نمبر تھا۔ ذرا تذبذب کے بعد اس نے کال ریسیو کر لی۔ "ہیلو کون؟" اس نے پوچھا۔

جواب میں ایک بھاری آواز سنائی دی۔ "آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے حق میں بہت بہتر ہوگا کہ آپ فون بند نہ کریں اور نہ اپنے اردگرد کسی کو اس کے بارے میں بتائیں۔"

"آپ..... ہیں کون؟" وہ ذرا غصے سے بولی۔ اسے آواز کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی۔

"آپ کے آس پاس کوئی موجود تو نہیں۔"

"نہیں۔"

"میں محمد ہادی بول رہا ہوں۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ یہاں آپ کے لیے ایک مسئلہ ہے۔ کافی سیریس مسئلہ۔"

ارم کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

O......❖......O

حجاب ورس والے گھر میں تھی۔ وہ بس ایک دو کمروں تک ہی محدود رہتی تھی۔ اپنی سخت تذلیل کے بعد نوکروں چاکروں سے آنکھ ملانا اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ صرف ایک شریفاں تھی جو اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی اور اس کے درد کو محسوس بھی کرتی تھی۔ چند روز پہلے شریفاں کا موبائل فون حجاب نے اپنی تحویل میں لے کر بند کر دیا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ہادی اس نمبر پر رابطے کی کوشش نہ کرے۔ مگر اس سے شریفاں کے لیے بڑی مشکل ہو گئی تھی۔ پاکستان سے اس کی کال آتی رہتی تھی۔ گجرات میں اس کی بہن کے ہاں بچہ ہوا تھا اور بہن بیمار تھی۔ وہ گاہے بگاہے شریفاں سے رابطہ کرتی رہتی تھی۔ شریفاں کی درخواست پر حجاب شام کے وقت ایک دو گھنٹے کے لیے اس کا فون کھلا دیتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے بھی فون کھلا ہوا تھا جب اس پر کسی نامعلوم نمبر سے کال آئی تھی۔ شریفاں نہانے کے لیے باتھ روم میں گھسی ہوئی تھی۔ تیسری چوتھی کال پر حجاب نے فون اٹھایا اور ایک دو بار ہیلو کہا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی بات کیے بغیر فون بند کر دیا گیا۔

کہیں یہ ہادی تو نہیں تھا؟ یہ سوچ کر حجاب کا دل دہل گیا۔ نفرت آمیز طیش کی ایک لہر اس کے سینے میں پیدا ہوئی۔ اس نے تہیہ کیا کہ اب وہ کبھی کوئی کال ریسیو ہی نہیں کرے گی۔

اچانک شریفاں گھبرائی ہوئی سی کمرے میں داخل ہوئی۔ "وڈی باجی! بھائی جان آئے ہیں۔" اس نے چھنسی چھنسی آواز میں اطلاع دی۔

حجاب کے ہاتھ پاؤں میں چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ آج کل جلال کی آمد سے اس کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔ میاں بیوی کا محبت اور احترام کا رشتہ، خوف اور تذلیل کے رشتے میں بدل چکا تھا۔ حجاب نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ جلال کی ہمر جیپ پورچ میں کھڑی تھی۔ جلال اگلا دروازہ کھول رہا تھا۔ پچھلے دروازے سے ہنی کی ملازمہ کلثوم نکلی اور اب ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ یہ پتا نہیں کیوں آئی تھی جلال کے ساتھ؟

شریفاں نے یونہی وقت گزاری کے لیے ٹی وی لگا رکھا تھا۔ حجاب نے کہا۔ "شریفاں! ٹی وی بند کرو اور دیکھو کمروں میں کوئی فالتو لائٹ آن نہ ہو۔"

"لائٹس تو میں نے بند کر دی ہیں جی۔" شریفاں نے کہا۔

"ایک نظر کچن میں دیکھ لو۔ کوئی چولہا کھلا نہ ہو۔" حجاب نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ جلال کو ایسی کوتاہیاں سخت ناپسند تھیں۔

شریفاں ٹی وی آف کر کے جلدی سے کچن کی طرف چلی گئی۔ دو تین منٹ بعد جلال آن وارد ہوا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ہی حجاب سمجھ گئی کہ آج پھر موڈ ابتر ہے وہ بغیر کسی تمہید کے بولا۔ "شریفاں کہاں ہے؟"

"کچن میں ہے شاید۔" حجاب نے نظریں ملائے بغیر کہا۔

"شریفاں..... او شریفاں!" جلال نے گرج کر آواز دی۔

وہ دو سیکنڈ بعد ہانپی کانپی ہوئی سامنے تھی۔ بدقسمتی سے قریبی باتھ روم کی کوئی ٹونٹی کھلی تھی اور پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ جلال گرجا۔ "یہ پانی کیوں گر رہا ہے۔"

"میں..... میں بھول گئی تھی صیب جی!" شریفاں بوکھلا کر بولی اور پھر لپک کر باتھ روم کی ٹونٹی بند کر آئی۔ جلال اسی طرح تنا کھڑا تھا۔ "کہاں رہتا ہے تمہارا دماغ آج کل۔" وہ گرجا۔

"میں کچن میں تھی صیب جی!"

"کچن میں تھی یا اپنی سہیلی صاحب کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی پر کوئی لچر ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔"

"سہیلی! کون سہیلی جی؟"

"یہی جو تیرے سامنے کھڑی ہے۔ تیری ہمراز، تیری لنگوٹن۔" جلال کا اشارہ حجاب کی طرف تھا۔

"جی....." وہ ہکلا کر رہ گئی۔

وہ حجاب سے مخاطب ہوا۔ "اس کا فون تم نے اپنے پاس رکھا ہوا ہے؟"

"فون.....؟ ہاں جی..... وہ میں نے....."

ابھی حجاب کی بات ادھوری تھی کہ وہ پھر شریفاں سے مخاطب ہو کر گرجا۔ "کیوں فون دے رکھا ہے تُو نے اسے؟"

"میں نے تو نہیں دیا جی! اصل وچ..... اصل وچ....."

''اصل وچ تُو شیطان کی بچی ہے۔ حرامزادی ہے تُو۔ پوری حرامزادی ہے۔'' جلال گرجا۔

شریفاں سرتاپا لرز رہی تھی۔ مگر گالی اس سے برداشت نہیں ہوئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پہلے کی طرح زرد رہا۔ اس نے ہمت کر کے جلال کی طرف دیکھا۔ ''صیب جی! میں بے قصور ہوں۔ آپ ماں پیو کی گالی تو نہ دیں۔''

''بولتی ہے۔ آگے سے بولتی ہے۔ بدنسل، کتے کی بچی۔'' جلال اس کی طرف بڑھا اور مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا۔ مگر پھر رُک گیا۔ اس نے دائیں طرف جا کر ایک دروازہ کھولا اور دھاڑتے ہوئے ڈرائیور عثمان کو آواز دی۔

''عثمان...... عثمان......''

چند سیکنڈ بعد عثمان ہاتھ باندھے سامنے کھڑا تھا۔ جلال نے شریفاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ واپس جا رہی ہے اپنے گھر۔ ابھی جا رہی ہے۔ اس کا سامان اُٹھا کر گاڑی میں رکھو۔ جلدی کرو۔''

ڈرائیور عثمان نے ادب سے اثبات میں سر ہلایا اور اس کمرے کی طرف بڑھ گیا جہاں شریفاں کا سامان رکھا تھا۔ شریفاں سر جھکائے کھڑی تھی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ سارا جسم لرز رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن پھر شاید سمجھ گئی کہ بولنے کا نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔ وہ مڑی اور کمرے سے نکل گئی۔

اس دوران میں حسبِ معمول جلال کے سیل فون پر کوئی کال آ گئی۔ وہ کال ریسیو کرتا اور برہم لہجے میں کاروباری باتیں کرتا ہوا ٹیرس کی طرف چلا گیا۔ حجاب پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ اس کی چھٹی حس، نئے حوادث کی آمد کی خبر دے رہی تھی۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ ابھی کچھ دیر پہلے شریفاں کے نمبر پر جو کال آئی تھی، وہ سارا اسی کا شاخسانہ ہے۔

صرف دس منٹ بعد شریفاں سر جھکائے درس والے گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

حجاب جانتی تھی کہ شریفاں کے بغیر اس گھر میں اس کا دم گھٹ جائے گا مگر وہ اسے روک نہیں سکتی تھی۔ اس کے لیے حکم جاری ہو چکا تھا اور اس حکم کو بدلا نہیں جا سکتا تھا۔

''رب راکھا باجی!'' حجاب کے پاس سے گزرتے ہوئے شریفاں نے ہولے سے کہا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر مردہ قدموں سے سیڑھیاں اُتر گئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے شریفاں، جلال کے تھپڑ کی زد میں آنے والی تھی۔ بلکہ یہ ایک تھپڑ نہ ہوتا۔ یقیناً اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش ہو جاتی۔ مگر عین وقت پر جلال نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ پاکستان نہیں امریکا ہے۔ یہاں ملازم کو مارنا بہت مہنگا پڑ سکتا ہے۔ مار کھانے کے بعد شریفاں پولیس کو کال کر دیتی تو جلال کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ وہ اپنی ملازمہ کو تو نہیں مار سکتا تھا لیکن اپنی بیوی کو مارنے میں اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ اسے بے دریغ پیٹ لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے شکنجے میں ہے۔ کہیں اس کی شکایت نہیں کرے گی۔ وہ ازدواجی رشتے کے ساتھ ساتھ معاشی پھندے میں بھی پھنسی ہوئی تھی۔

اور تھوڑی دیر بعد یہ بات ثابت بھی ہو گئی کہ حجاب کو مارنے اور اس کی تذلیل کرنے میں جلال کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ فون پر اپنی بات چیت وہ ختم کر چکا تھا اور اب غصے میں بھرا کامن روم کے صوفے پر بیٹھا تھا۔ حجاب اسے بتانا چاہتی تھی کہ شریفاں کا فون اس نے کیوں اپنے پاس رکھا تھا۔ لیکن بہت سی دیگر باتوں کی طرح یہ بات بھی اس کے گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ اس کیفیت کی وجہ یقیناً جلال کا غیض و غضب ہی ہوا کرتا تھا۔ جونہی شریفاں اور ڈرائیور عثمان رخصت ہو گئے۔ جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ وہ حکمیہ انداز میں حجاب سے بولا۔

''چلو نیچے آؤ۔'' اس کے ساتھ ہی وہ سیڑھیاں اُترنے لگا۔

حجاب کچھ بھی سمجھ نہ پائی تھی۔ پھر بھی جلال کے پیچھے جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ وہ اس کے پیچھے ہی سیڑھیاں اُترنے لگی۔ پتا نہیں، وہ اسے کہاں لے جا رہا تھا۔ سیڑھیاں اُتر کر وہ گراؤنڈ فلور پر پہنچے۔ یہاں سے ایک کوریڈور نکلتا تھا۔ وہ چند قدم کوریڈور میں گئے۔ پھر حجاب کی رگوں میں خون جم سا گیا۔ وہ اسے بیسمنٹ میں لے جا رہا تھا۔ پر کیوں؟

''چلو......'' اس نے کہا اور نیچے جاتی سیڑھیوں کا دروازہ کھول دیا۔

''کیا بات ہے جلال......'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''بتاتا ہوں...... نیچے چلو۔'' وہ پھنکارا۔

وہ لرز کر رہ گئی۔ مگر قدم آگے بڑھانے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ اسے سیڑھیاں اُتار کر بیسمنٹ میں لے آیا۔ یہاں ٹائیلوں کا فرش تھا۔ درمیانے درجے کی آرائش بھی کی گئی تھی۔ فرنیچر، پردے، اے سی وغیرہ سب کچھ مہیا تھا ہوا کی آمد و رفت کا عمدہ انتظام بھی موجود تھا۔

''اب تم یہاں رہو گی۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

وہ پوری جان سے لرز گئی۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جلال؟''

''تم ایک بے اعتباری عورت ہو۔ میں تمہیں آزاد رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا بہت بے عزتی سہہ چکا ہوں اب مجھ سے اور برداشت نہیں ہوگا۔'' وہ واپس جانے کے لیے مڑا۔

حجاب تڑپ کر بولی۔ ''لیکن اب نیا کیا ہو گیا ہے جلال! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں میرے ساتھ......؟''

وہ جاتے جاتے ٹھٹک گیا۔ گھوم کر کہنے لگا۔ ''کنگھی کا ایک دندانہ ٹوٹے تو باقی دندانے ٹوٹتے زیادہ دیر نہیں لگتی۔ تم اب بے حیائی کی ہر حد تک جا سکتی ہو۔''

وہ سسک پڑی۔ ''جلال! ایسے الزام نہ لگائیں مجھ پر۔ مجھ سے ایک غلطی ہوئی ہے پر اس کی سزا تو نہ دیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ اپنے ہاتھوں سے مجھے مار دیں۔ میری جان لے لیں۔''

''چپ رہو۔'' وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ بیسمنٹ کی دیواریں لرز گئیں۔ ''پھر وہی بات...... میں الزام لگا رہا ہوں تجھ پر۔ بہتان باندھ رہا ہوں تیری نیک سیرتی پر۔ بے حیا، بے غیرت۔'' وہ شیر کی طرح اس پر جھپٹ پڑا۔

ایک بار پھر وہی کچھ ہوا جو چند دن پہلے اوپر کمرے میں ہوا تھا۔ اس پر تھپڑوں اور ٹھوکروں کی بارش ہو گئی۔

''جلال......'' وہ خوف اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں چلائی۔

اس کے چلانے نے جلال کو مزید بھڑکا دیا۔ اس نے حجاب کو اس کے بالوں سے پکڑا اور گھما کر دیوار پر دے مارا۔ وہ نیم جان ہو کر بستر پر گر گئی۔ وہ دھاڑا ”تو ان آسائشوں، ان نعمتوں کے قابل ہی نہیں ہے۔ بدقسمت ہے تو اور وہ بھی بدبخت ہیں جنہوں نے تجھے جنا ہے۔ نیچ ذات کے ہو۔ نیچ خون ہے تم لوگوں کا۔ چکی پیسنے اور گھاس کاٹنے والوں کی اولاد میں سے ہو۔ میں جانتا ہوں تیرے بڑوں کو اور اب تجھے بھی اچھی طرح جان گیا ہوں۔ تجھے آرام کی گرانی ہو رہی ہے۔ پیسے کی ریل پیل نے تیرے پنڈے کو گرم کیا ہوا ہے۔ اس لیے عاشق ڈھونڈ رہی ہے۔ تیری طرح سیدھا کروں گا تجھے۔ تیر کی طرح۔“ وہ پھنکارا۔

اس نے کمرے میں رکھا ہوا فریج کھولا۔ اس میں کھانے پینے کی کئی اشیاء رکھی تھیں۔ جوس، فروٹس، اسنیکس وغیرہ۔ اس نے یہ چیزیں نکال نکال کر فرش پر پھینک دیں۔ بیکار کر دیں۔ پھر وہ بپھرا ہوا ٹیلیفون سیٹ کی طرف گیا۔ اس کو نیچے پٹخ کر توڑ دیا۔ اس نے ساری درازیں کھول کر الٹ پلٹ کر دیں۔ غالباً دیکھ رہا تھا کہ کوئی موبائل فون تو موجود نہ ہو۔ تب وہ حجاب کی طرف آیا۔ اس پر چڑھ دوڑا۔ اس کے قیمتی کپڑے پھاڑ دیئے۔ ایک ایک تار جدا کر دیا۔ وہ عریاں ہو گئی اور رونے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔ اس نے اس کے گلے سے ہار اور کانوں سے بندے بھی کھینچ کر پھینک دیئے اور اس کے عریاں جسم پر تھوک کر باہر نکل گیا۔ زمین و آسمان حجاب کی نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ وہ جیسے زہرناک ہواؤں میں معلق تھی۔ جلال کا لعاب دہن اس کے کندھے پر گرا تھا اور اب رینگتا ہوا سینے کی طرف آ رہا تھا۔ اسے لگا یہ رقیق، لیس دار مادہ، ایک تیزاب ہے جو اس کو جھلساتا چلا جا رہا ہے۔ اس نے عریانی چھپانے کے لیے بستر کی چادر اپنے گرد لپیٹ لی۔

چار پانچ منٹ بعد وہ پھر دندناتا ہوا بیسمنٹ میں داخل ہوا۔ اس نے کسی ملازمہ کا بوسیدہ جوڑا حجاب کے مارا اور پھنکارا۔ ”تو اس کے قابل ہے۔ بلکہ شاید اس کے قابل بھی نہیں ہے۔ اب تو وہی پہنے گی جو میں پہناؤں گا اور وہی کھائے گی جو میں کھلاؤں گا۔ میں تیرے پنڈے کی گرمی کم کر دوں گا۔ بالکل ٹھنڈی ٹھار اور نرم ہو جائے گی۔ کان میں ڈالنے کے قابل۔“

وہ غیض و غضب میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔ چند سیکنڈ بعد حجاب نے باہر سے دروازہ بولٹ ہونے کی آواز سنی۔ اسے یوں لگا جیسے سینے میں اس کی سانس پھنس گئی ہے۔ وہ جلال کو پکارنا چاہتی تھی مگر پکار بھی نہ سکی۔ اسی طرح بیڈ شیٹ میں لپٹی کروٹ لیے پڑی رہی۔ گھٹنے پیٹ سے لگے ہوئے تھے۔ اس کے جسم پر انگارے سے دہک رہے تھے۔ یہ ان طمانچوں کے انگارے تھے جو جلال نے اس پر برسائے تھے۔ عریاں جسم پر انگاروں کی جلن کم نہیں ہوئی۔ مگر تیزاب کی جلن تو بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور حجاب کے کومل بدن پر تیزاب بھی لعاب دہن کی صورت میں سرک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد حجاب نے محسوس کیا کہ بیسمنٹ کے دروازے سے باہر جلال کسی سے باتوں میں مصروف ہے۔ غالباً یہ ملازمہ کلثوم ہی تھی۔ وہ درشت لہجے میں اسے حجاب کے متعلق کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر آہنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہدایات بہت سخت ہیں۔

تو کیا وہ اسے یہاں بند کر کے چلا جائے گا۔ دو تین دن کے لیے یا چار پانچ دن کے لیے؟ ”او خدایا! وہ کیسے رہ پائے گی۔“ بند کمروں سے اسے ہمیشہ خوف آتا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ اپنے گرد بستر کی چادر درست کی اور لڑکھڑاتی ہوئی دروازے تک پہنچ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا اور فریادی لہجے میں پکاری۔

”دروازہ کھول دیں جلال! دروازہ کھول دیں۔“

وہ پکارتی رہی اور دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کی سانس واقعی رکنے لگی۔ وہ کھڑکی کی طرف لپکی لیکن کھڑکی نام کی کوئی چیز یہاں نہیں تھی۔ وہ پھر دروازے کی طرف آئی۔ جلال اور کلثوم کو پکارنے لگی مگر یہ سب بے سود رہا۔ وہ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھ گئی۔ وقفے وقفے سے آواز دیتی رہی، دروازہ بجاتی رہی۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ پھر وہ بے دم سی ہو کر وہیں پھولدار ٹائیلوں کے فرش پر لیٹ گئی۔ دروازے کے قریب لیٹنا اسے نسبتاً بہتر تھا۔ شاید دروازے کی درزوں میں سے تازہ ہوا اندر آ رہی تھی۔

یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا تھا۔ وہ کس دلدل میں پھنسی جا رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی جسارت کی اتنی بڑی سزا......؟

O......✤......O

ہادی شاہ نزار کے علاقے میں ایک گمنام کیفے میں بیٹھا تھا۔ وہ ارم کا انتظار کر رہا تھا اور اسے یقین تھا، وہ ضرور آئے گی۔ ٹیلیفون پر ہونے والی گفتگو کے آخر میں اس نے ارم کو ایک ایسا اشارہ دیا تھا جس نے اس کی سٹی گم کر دی تھی۔ وہ یہ ہامی بھرنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ کل دوپہر اس سے اس کیفے میں ملے گی۔

ہادی نے ایک بار پھر رسٹ واچ پر نگاہ دوڑائی۔ 12 بجے کا وقت تھا اب 12 بج کر 20 منٹ ہو چکے تھے۔

ہادی ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار تھا۔ اس کی درخواست پر ڈپٹی انسپکٹر ہاشم نے اپنے ایک ماتحت تھامس کو بھی اس کیفے میں بھیج دیا تھا۔ وہ سادہ لباس میں ہادی سے تیسری چوتھی میز پر موجود تھا اور چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ وقت گزاری کے لیے ہادی نے شیخو صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے مخصوص پنجابی لہجے میں اوپر تلے دو اچھی خبریں دیں۔ پہلی یہ کہ اٹالین سفارت خانے کی طرف سے ہادی کو ایمرجنسی ویزا مل گیا تھا۔ دوسری اہم خبر یہ تھی کہ ہادی کے گانوں کے نئے لانچ ہونے والے البم نے سیل کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ شیخو صاحب بہت خوش تھے اور مسلسل خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

قریباً ساڑھے بارہ بجے تھے جب ارم تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے ایک نیلے رنگ کا اسکارف اوڑھ رکھا تھا۔ جس میں بے بس چہرے کی ٹکیا نظر آتی تھی۔ ایک شال نے اس کے بالائی جسم اور لباس کو ڈھانپ رکھا تھا۔ پاؤں میں جوگر شوز تھے۔ ہال میں نگاہ دوڑانے کے بعد وہ سیدھی اس گوشے میں پہنچ گئی جہاں ہادی موجود تھا۔

دونوں میں رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ آج پہلی بار ہادی کو ارم کی آنکھوں کی چمک ماند نظر آئی۔ رنگ بھی کچھ پھیکا سا تھا۔ یہ تاثر دیکھ کر اسے راحت محسوس ہوئی۔

”کیا پئیں گی؟“ ہادی نے پوچھا۔

”ہادی صاحب! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ وہ کھردرے لہجے میں بولی۔

"ہاں...... مجھے بھی لگتا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔ ورنہ آپ ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گی۔" ہادی نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

ہادی نے اطمینان سے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافہ ارم کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں ان تین پرنٹس آؤٹ کی کاپیاں تھیں جو گلزاری نے پرائیویٹ کلینک وکٹوریہ فورٹا سے حاصل کیے تھے۔

پرنٹ آؤٹ دیکھنے کے بعد ارم کی حالت پتلی ہو گئی۔ اس کے ہاتھوں میں واضح طور پر کپکپاہٹ دکھائی دینے لگی۔ رنگ بھی مزید پھیکا پڑ گیا۔

"یہ...... سب کیا ہے؟" وہ ہکلائی۔

"دیکھیں مسز ارم! آپ نے خود کہا ہے کہ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں۔ پھر اسے فضول باتوں میں ضائع مت کریں۔ میرے پاس ٹھوس ثبوت موجود ہیں۔ آپ کی وہ ازدواجی زندگی چند روز میں ختم ہو سکتی ہے جو آپ بڑی چالاکی سے چھپائی ہے۔"

"تو تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟" وہ آپ سے تم پر اتر آئی۔

"میں بلیک میل کرنا چاہتا نہیں ہوں۔ کر رہا ہوں اور یہ اوچھے ہتھکنڈے تم نے خود شروع کیے ہیں ارم چودھری! اس لڑائی میں تمہیں ہر اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ لڑنے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ کچھ اور سوچو۔" ہادی نے زہریلے لہجے میں کہا۔

وہ یک ٹک ہادی کی طرف دیکھتی رہی پھر شاید سمجھ گئی کہ ہادی نرا شاعر ہی نہیں۔ ان لوگوں میں سے ہے جو بات کرتے ہیں تو اسے عملی جامہ بھی پہنا دیتے ہیں۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے لرزاں آواز میں کہا۔ "تو تم یہ سب حجاب کے لیے کر رہے ہو۔ اس کے کہنے پر...... اس کی خواہش کے مطابق۔"

"اس بے چاری کو ان باتوں کا پتا بھی نہیں۔ وہ ایسی ہوشیار چالاک ہوتی تو تمہارے پھندوں میں پھنستی ہی نہیں۔ جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا ہے، کسی اور کے ساتھ کیا ہوتا تو وہ تمہاری جان لے لیتا۔" ہادی کے لہجے میں آگ تھی اور تپش پورے جسم میں پھیلتی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کے لب و لہجے نے ارم کو ہلا دیا۔ اس نے اسکارف درست کرتے ہوئے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ چند سیکنڈ تک الفاظ منتخب کرنے کے بعد بولی۔ "کیا چاہتے ہو تم؟"

ہادی نے اس کے ہاتھ سے کاغذات واپس لیتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ حجاب کے خلاف ہر طرح کی سازشیں بالکل بند کر دو۔ ایک دم فل سٹاپ ورنہ پچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

"میں نے کوئی سازش نہیں کی۔"

"میرے کیمرے سے حجاب کی تصویر نکال کر پورے خاندان میں پھیلانا تمہاری سازش نہیں محبت تھی۔ اور اس طرح کی محبتیں، تم نے بہت کی ہیں حجاب سے۔ اب ان کا بدلہ چکانے کا وقت آ گیا ہے۔ میں پھر کہوں گا تم اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ تم سب کچھ جانتی ہو اور میں بھی۔ اب میرے اور تمہارے درمیان ایک نیا رشتہ وجود میں آیا ہے۔ تمہیں وہ کچھ کرنا پڑے گا جو میں کہوں گا۔"

وہ ذرا سنبھل کر بولی۔ "میں اس کے لیے زیادہ دور تک نہیں جا سکتی مسٹر ہادی! اگر مجھے دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگاؤ گے تو پھر بہت کچھ ختم ہو جائے گا۔"

اس نے دلیری سے بات کی تھی مگر اس کی آواز کا کھوکھلا پن ہادی کو صاف محسوس ہوا۔ وہ اتنی بڑی بازی نہیں کھیل سکتی تھی جس کی پہلی چال میں ہی اسے جلال الدین کو کھونا پڑتا۔

ہادی سگریٹ سلگا کر زہریلے انداز میں مسکرایا۔ "میں تمہیں دھکیل کر دیوار سے لگاؤں گا ارم چودھری! اور اگر ضرورت پڑی تو تمہیں دیوار سمیت گرا بھی دوں گا۔ میں بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔ اگر یقین نہیں تو آزما کر دیکھ لو۔" ہادی کے سینے میں دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے اور رگوں میں لہو کی جگہ آگ حرکت کرنے لگی تھی۔ اسے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ ساری توانائی حجاب کی بے پناہ محبت کی بخشی ہوئی ہے۔ بے پناہ اور انوکھی محبت۔ جو کسی رکاوٹ کو نہیں مان رہی تھی۔ جو آگ اور برف کے سات سمندروں پر سے گزرنے کا حوصلہ اپنے اندر رکھتی تھی اور اس سے بھی بڑا حوصلہ اس محبت میں یہ تھا کہ وہ خود کو قربان کر کے بھی حجاب کا بھلا چاہتی تھی۔

اس محبت سے پیدا ہونے والی غیر معمولی توانائی نے ارم چودھری جیسی خرانٹ لڑکی کو دو چار منٹ میں ہی مسمرائز کر دیا۔ بالآخر وہ مری مری آواز میں بولی۔ "دیکھو ہادی صاحب! میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا کوئی بدخواہ ان پیپرز کے ذریعے مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہر حال میں خوامخواہ کی ٹینشن اور جھگڑے سے بچنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"فی الحال تو کچھ زیادہ نہیں چاہ رہا۔"

وہ بات کاٹنے والے انداز میں کہنے لگی۔ "میں بار بار کسی تناؤ کا شکار ہونا نہیں چاہتی۔ نہ ہی بار بار آپ سے رابطہ کر سکتی ہوں۔ آپ کیا چاہتے ہیں۔ مجھے ایک ہی بار بتا دیں اور...... اور اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آپ ان پیپرز وغیرہ کو بنیاد بنا کر میرے لیے پھر کوئی پریشانی پیدا نہیں کریں گے۔"

"کوئی ضمانت نہیں۔" ہادی نے بے لچک لہجے میں کہا۔ "اگر کوئی ضمانت ہے تو وہ میں خود ہوں۔ تمہیں میری زبان پر یقین کرنا پڑے گا۔ ہاں اتنا میں بتا دیتا ہوں کہ اس یقین کی وجہ سے تم کبھی پچھتاؤ گی نہیں۔ اور ایک دوسری بات کوئی شرط میرے سامنے نہ رکھو۔ تم شرط والی بات کرتی ہو تو میرا میٹر گھومنے لگتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی طریقے سے ہوگا جس طریقے سے میں چاہوں گا۔ میری سب سے پہلی اور اہم ترین ڈیمانڈ یہی ہے جو میں نے ابھی تمہیں بتائی ہے۔ حجاب کے خلاف اب کوئی اور کمینگی نہ دکھانا۔" ہادی نے آخری الفاظ ادا کیے تو اس کی انگلی ارم کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

اس کے ہونٹ بے ساختہ کپکپائے لیکن وہ کچھ بول نہ سکی۔ ماتھے پر پسینہ تھا اور پوری طرح نروس نظر آ رہی تھی۔ ہادی نے دو کولڈ ڈرنکس منگوائے۔ وہ اپنے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کو کنٹرول کرتے ہوئے چسکیاں لینے لگی۔ کیفے کے دروازے پر ایک شخص سیڑھیوں پر بیٹھا گٹار بجا رہا تھا۔ اس کی خوبصورت دھن سے متاثر ہو کر ایک لڑکی اور لڑکے نے رقص شروع کر دیا۔

وہ کچھ دیر اس کی طرف متوجہ رہے۔ دھن ختم ہوئی تو لوگوں نے گٹارسٹ کے ہیٹ میں سکے وغیرہ پھینکے۔

ہادی نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ ارم چودھری! جہاں تک میں سمجھا ہوں۔ تم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہو۔ جلال اور حجاب میں ٹھیک ٹھاک دوری پیدا ہو گئی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق تو اس گھر میں رہنا اب حجاب کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ شاید حجاب کے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت ہے۔ مگر پھر بھی وہ برداشت کر رہی ہے۔ اس کے والدین کی طرف سے بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہو رہا۔ وہ اتنا کیوں ڈر رہے ہیں جلال سے۔ کیا اس کے پیچھے کوئی بات ہے۔ کوئی خاص وجہ؟"

"وجہ تو سب کے سامنے ہے۔ اگر میں کہوں گی تو تمہیں غصہ لگے گا۔"

"لیکن مجھے لگتا ہے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے۔"

"سچی بات کہوں...... تو مانو نہ مانو...... حجاب نے جلال کا اعتماد ہی مجروح نہیں کیا ان کو مالی طور پر بھی لوٹا ہے۔"

"مالی طور پر؟"

"جی ہاں...... ان کے ابو انکل فیاض نے بہت پیسہ کھایا ہے جلال سے۔ شادی کے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔ واپسی کے لیے مسلسل جھوٹے وعدے کرتے رہے ہیں۔ جلال قانونی کارروائی کا ارادہ کر لیں تو چار دن کے اندر انکل فیاض پولیس کی کسٹڈی میں نظر آئیں گے۔"

ہادی کو ارم کی بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے تفصیل جاننا چاہی۔ پہلے تو وہ اِدھر اُدھر کی ہانکتی رہی۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ یہ راز افشانی اس کے لیے کوئی مشکل پیدا کرے گی لیکن ہادی کے اصرار پر وہ بتانے پر آمادہ ہو گئی۔ اس کی باتوں سے ہادی پر انکشاف ہوا کہ نہ صرف حجاب کے والدین کا گھر گروی ہے بلکہ اس کے والد جلال کے پونے لاکھ یورو سے زیادہ کے مقروض ہیں اور مارک اپ ڈال کر یہ رقم اور بڑھ جاتی ہے۔

کسی کتاب میں پڑھا ہوا یہ فقرہ ہادی کے ذہن میں گھومنے لگا۔ "داماد کے سامنے تو بیٹی والوں کے سر ویسے ہی جھکے ہوئے ہیں لیکن اگر بیٹی والے داماد کے مقروض بھی ہوں تو سر جھکانے والا یہ بوجھ کئی گنا وبڑھ جاتا ہے۔"

اس کے دل و دماغ میں ہلچل تھی۔ اب اسے اس سارے دباؤ اور خوف کی سمجھ زیادہ اچھے طریقے سے آنے لگی تھی جو جلال کے حوالے سے حجاب کے میکے میں موجود تھا۔ وہ ابھی ارم سے کچھ اور سوال بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر اس انکشاف کے بعد باقی سوال غیر اہم لگ رہے تھے۔

اس نے ویٹر کو بل کے لیے کہنے کے بعد ارم سے پوچھا۔ "مجھے ابھی تم سے کچھ اور ضروری باتیں کرنی ہیں۔ جلال آج کل کتنے بجے گھر لوٹتا ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "نو بجے کے قریب۔"

"اور جاتا کتنے بجے ہے؟"

"آٹھ بجے صبح۔" اس کے لہجے میں شگفتگی تھی۔

"میں پرسوں صبح آٹھ اور رات نو بجے کے درمیان کسی بھی وقت تم سے فون پر رابطہ کروں گا۔ مجھے کوئی ایسا نمبر

بتاؤ جو بالکل محفوظ ہو تمہارے لیے۔"

○ ..... ❖ ..... ○

حجاب کا بُرا حال تھا۔ پچھلے چوبیس گھنٹوں سے اس نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ رو رو کر اور پکار پکار کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اس نے کسی نوکرانی کا وہی بوسیدہ لباس پہن رکھا تھا جو جلال نے اسے مہیا کیا تھا۔ آج صبح اسے ناشتہ دیا گیا تھا۔ یہ ناشتہ لانے والی بٹی کٹی کلثوم ہی تھی۔ تاہم اس نے بیسمنٹ کا دروازہ پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ دروازے میں اندر کی طرح باہر کی طرف بھی دروازے سے جھانکنے والی زنجیر لگی ہوئی تھی اس زنجیر کی وجہ سے دروازہ بمشکل چھ سات انچ تک ہی کھل سکا تھا۔ اس خلا میں سے کلثوم نے سوکھی روٹی، انڈے کا آملیٹ اور چائے کا کپ اندر کھسکا دیا تھا۔ اور حجاب کی منت سماجت کی پروا کیے بغیر دروازہ فوراً بند کر دیا تھا۔ یہ ناشتہ بارہ گھنٹے بعد بھی جوں کا توں پڑا تھا۔

"میں کیا کروں میرے اللہ! یہ مجھے کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے۔ مجھے معاف کر دے میرے مالک! مجھ پر رحم فرما۔ میرے ماں باپ پر رحم فرما۔" وہ تکیے میں سر دے کر گڑگڑائی۔

اسی دوران میں دروازے پر پھر آہٹیں سنائی دیں۔ وہ جلدی سے اُٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ اس بار بھی دروازہ پورا نہیں کھلا تھا۔ دوسری طرف کلثوم کا کرخت چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے نیپکن میں لپٹی ہوئی روٹی، پانی کی بوتل اور سالن کی پلیٹ اندر کھسکا دی۔ اس میں آلو گوبھی کا سالن تھا۔ حجاب، کلثوم کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بلکی۔ "خدا کے لیے کلثوم! مجھے یہاں سے نکال لو۔ میری سانس بند ہو جائے گی۔ مجھ پر رحم کرو کلثوم۔"

وہ روکھے پن سے بولی۔ "میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر مجھے گناہگار کیوں کرتی ہیں باجی! ہاتھ جوڑنے ہیں تو ان کے سامنے جوڑو جن کی عزت خراب ہوئی ہے آپ کی وجہ سے۔ جو لوگوں کے طعنے سن رہے ہیں۔"

"میں نے کچھ نہیں کیا کلثوم! میں بے گناہ ہوں۔ مجھ پر بہتان باندھے جا رہے ہیں۔ تم تو ایک عورت ہو۔ عورت کو پہچانتی ہو۔ کیا تمہیں لگتا ہے میں کچھ ایسا کر سکتی ہوں گی؟"

"کسی کے ماتھے پر کچھ نہیں لکھا ہوتا باجی! آپ کسی بندے سے ہوٹلوں میں ملتی رہی ہیں۔ اس کے کیمرے میں سے آپ کی غلط تصویریں نکلی ہیں۔"

"کوئی غلط تصویریں نہیں ہیں کلثوم! صرف بازار میں اُتاری ہوئی ایک تصویر ہے۔ جو اس نے مجھے بتائے بغیر اُتاری تھی اور کچھ نہیں ہے کلثوم! کچھ بھی نہیں ہے۔" آخری تین چار الفاظ وہ اتنے زور سے بولی کہ اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔ اتنی کوشش کے باوجود اس کی بیٹھی ہوئی آواز بمشکل کلثوم کے کانوں تک پہنچی ہوگی۔

"ماں باپ سے سگا اور کوئی نہیں ہوتا باجی! جب تمہارے ماں باپ کے پاس تمہاری صفائی نہیں ہے تو اور کسی کے پاس کیا ہوگی۔ سب کہہ رہے ہیں کہ تمہارے میکے والوں نے تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔"

"یہ سب غلط ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ رائی کے پہاڑ بنائے جا رہے ہیں۔ مجھے کسی نے دھکے نہیں دیے اور میں نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا۔"

"باجی! تمہاری گناہگاری یا بے گناہی کا فیصلہ تو تمہارے سر کے سائیں نے کرنا ہے۔ مجھے بتانے سے کوئی

فائدہ نہیں ہے۔ میں تو حکم کی بندی ہوں۔ میں تو بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ کھانا کھالو اور حوصلہ رکھو۔ پہلے بھی تو جو عظیم والے کام کیے ہی ہیں نا تم نے۔"

"خدا کے لیے کلثوم! مجھے کوئی فون لا دو۔ میں جلال سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے ویسے مار دیں اس طرح کمرے میں بند نہ کریں۔ میں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔ انہوں نے جب آنا ہے خود ہی آنا ہے۔" اس نے خشمگیں انداز میں کہا اور حجاب کے چہرے کے سامنے دروازہ جھٹکے سے بند کر دیا۔ حجاب ہذیانی انداز میں پھر چلانے لگی۔ یہ کمرہ جیسے تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی دیواریں موت کی پرچھائیوں کی طرح حجاب کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی۔ وہ ہمیشہ بند جگہوں سے خوف کھاتی تھی۔ بچپن میں ایک دفعہ والدہ نے کسی بات پر سرزنش کے طور پر اسے باتھ روم میں بند کر دیا تھا اور خود اپنے کام سے چھت پر چلی گئی تھیں۔ اس نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ بے ہوش ہونے کو تھی۔ اس کی زبان پر صرف ایک ہی نام تھا۔ "ابو جی! ابو جی!" اور ابو جی نے اس کی پکار سن لی تھی۔ انہوں نے اسے باتھ روم سے نکالا تھا۔ گود میں اُٹھایا تھا۔ اس واقعے کے بعد ابو کئی دن امی سے سخت خفا رہے تھے۔

آج ان جاں گسل لمحوں میں اسے نہ جانے کیوں پھر ابو جی ہی یاد آئے۔ وہ دل ہی دل میں انہیں پکارنے لگی۔

"ابو جی! میری مدد کو کوئی نہیں آ رہا۔ کوئی مجھے اس تاریکی سے نہیں نکال رہا۔ آج پھر میری جان پر بن گئی ہے ابو جی! مجھے یہاں سے نکال لیں۔ ورنہ پھر کبھی میری صورت نہ دیکھ سکیں گے۔ آپ نے کبھی مجھے اتنا رونے نہیں دیا تھا۔ آج کیوں میرا رونا نہیں سن رہے۔ کیوں آپ بھی منہ پھیر کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ اپنی بیٹی پر اعتماد نہیں رہا؟ اپنے خون پر شک کرنے لگے ہیں؟ ایسا نہ کیجیے ابو جی! آپ ہی نے تو کہا تھا آپ کبھی میری انگلی نہیں چھوڑیں گے۔ جب اماں بن جاؤں گی تب بھی نہیں۔ میں ابھی دادی اماں نہیں بنی۔ ابھی ماں بھی نہیں بنی۔ ابھی میں نے جینا بھی شروع نہیں کیا۔ میں مر رہی ہوں۔ کیا آپ مجھے مرنے دیں گے۔ اسی طرح بے بسی سے......"

اچانک اسے محسوس ہوا کہ دروازے کی طرف آنے والے زینوں پر پھر آہٹ ہوئی ہے۔ کوئی نیچے اتر رہا تھا شاید...... کون ہو سکتا تھا۔ اس کے ابو جی؟ جو اپنے ناتواں جسم کو گھسیٹتے ہوئے یہاں پہنچ گئے تھے۔ اس کا بھائی نبیل جسے اپنی پیاری باجی کی پکار کھینچ لائی تھی۔ یا پھر ڈاکٹر انکل عطا جو اسے بیٹیوں کی طرح ہی چاہتے تھے یا پھر ماموں جو بیمار رہتے تھے۔ وہ سرتاپا سماعت بن گئی۔ وہیں لیٹی لیٹی امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ کوئی دروازے پر پہنچا۔ آہٹ ہوئی۔ پھر اندازہ ہوا کہ دروازے کو باہر سے مقفل کیا جا رہا ہے۔ تالا لگائے جانے کی آوازیں بڑی بے رحم تھیں۔ وہ ایک بار پھر دروازے پر پہنچ گئی۔ آہ و بکا کرنے لگی۔ مگر سننے والے کان تو شاید بہرے ہو چکے تھے آنے والا سیڑھیاں چڑھ کر واپس چلا گیا۔

وہ گٹھڑی سی بن کر کروٹ کے بل پھر دروازے کے پاس ہی لیٹ گئی۔ سانس کی آمد و رفت مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں سن ہو رہے تھے۔ شاید وہ مر رہی ہے۔ اس نے سوچا۔ دماغ پر دھند چھانے لگی۔ اسے لگا کہ وہ فرش سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ ہوا میں معلق ہو رہی ہے۔ ایک تاریک اور سرد ہوا میں۔ اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پتا نہیں وہ کب تک اسی طرح پڑی رہی۔ دل کے کسی دور دراز گوشے سے صدا آ رہی تھی، اب یہاں کوئی نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا۔

وہ غنودگی اور بیداری کی کوئی درمیانی کیفیت تھی۔ یہ خواب نہیں تھا۔ یا شاید جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ اس سے غنودہ تصورات نے اسے ایک عجیب منظر دکھایا۔ اسے لگا کہ دروازے کا قفل کھلا ہے۔ پٹ وا ہوئے۔ اس کے ابو داخل ہو گئے۔ سفید براق لباس میں۔ سفیدی مائل بال سلیقے سے پیچھے کی طرف جمے ہوئے آنکھوں پر عینک کی چمک۔ دبلا پتلا سینہ مگر تنا ہوا۔ اور شانے سیدھے۔ وہ مستحکم قدموں سے چلتے اس کے پاس آئے۔ جھک کر اس کا ماتھا چوما اور بڑی آسانی سے اسے گود میں اُٹھا لیا۔ اسے اس طرح اُٹھائے اُٹھائے وہ باہر نکلے۔ کلثوم دم بخود کھڑی رہی۔ جلال کے گارڈز نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے لے کر گھر کے وسیع لان کی طرف بڑھے۔ وہاں بے لوگوں کی آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ شاید سینکڑوں لوگ جمع تھے۔ ابو نے اس کے کان میں کہا۔ "جو تمہارے دل میں ہے کہہ دو۔ بلند آواز سے کہہ دو۔ کسی سے ڈرنا نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بوڑھا ہوں مگر بے بس نہیں ہوں میری بچی۔"

اور واقعی اس میں ایک عجیب توانائی بھری گئی۔ اس کے سینے میں مدتوں سے جکڑی ہوئی صدائیں اس کی آواز بن کر اس کے ہونٹوں سے نکلنے کے لیے بیتاب ہو گئیں۔

ابو نے اسے اتارا اور وہ اپنے پاؤں پر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ وسیع لان کھچا کھچ بھرا تھا۔ ایک بہت بڑے سنہری سٹیج پر ایک نورانی صورت والے بزرگ منقش کرسی پر بیٹھے تھے۔ ان کی سیدھی سفید داڑھی ان کے سینے پر لہرا رہی تھی۔ ان کے پہلو میں جلال بھی ایک شاندار کرسی پر براجمان تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈیجیٹل تسبیح تھی۔ اس کی نظر ہجوم کی اگلی صف پر پڑی۔ یہاں اس کے اور جلال کے کئی عزیز و اقارب موجود تھے۔ دائیں طرف جلال کا بھائی فیروز بیٹھا تھا۔ سرخ و سپید صفاچٹ چہرہ نکھرا اور خیال پہنے ہوئے ہاتھ میں وہسکی کا جام تھا، دونوں اطراف نیم عریاں لڑکیاں تھیں۔

ہجوم دیکھ کر حجاب دم بخود ہو گئی۔ ابو نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "میں یہاں ہوں تمہارے ساتھ ہوں ... جاؤ۔" اس کے قدموں کی لرزش جاتی رہی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر آ گئی۔ سفید براق داڑھی والے بزرگ نے کہا۔ "ہاں بیٹی! تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔"

"ہاں محترم بزرگ۔" وہ صاف توانا آواز میں بولی۔ "لیکن پہلے اس شخص کو سٹیج سے اُتاریں اور اس شخص کے پہلو میں بٹھائیں جو اگلی صف میں دائیں طرف بیٹھا ہے۔"

"کیا مطلب؟ یہ تو جلال الدین ہیں۔ روم کی مسلم کمیونٹی کے ایک معزز شخص!"

"لیکن میری شرط یہی ہے محترم بزرگ۔ میں تب ہی کچھ بولوں گی جب یہ سٹیج سے اُتر کر اپنے بھائی کے پاس بیٹھے گا۔"

کچھ بحث و تمحیص کے بعد جلال کو سٹیج سے نیچے اُترنا اور بھائی کے پہلو میں بیٹھنا پڑا۔

حجاب بلند آواز میں بولی۔ ''محترم بزرگ! میرے شوہر جلال کو دوسری شادی کا حق تھا مگر عیاشی کا حق نہیں تھا۔ اس نے شادی کی رعایت کو صرف اور صرف اپنی عیش و عشرت کے لیے استعمال کیا ہے اور اس سلسلے میں ہر اخلاقی ہدایت کو نظر انداز کیا۔''

محترم بزرگ بولے۔ ''لیکن بیٹی! اگر یہ شخص شادی کرنے کے بعد دونوں بیویوں میں مساوات برقرار رکھتا ہے تو پھر اعتراض کی گنجائش کم رہ جاتی ہے۔''

''یہی تو بات ہے محترم بزرگ۔'' وہ دلیری سے بولی۔ ''اس نے جن ہدایات کو نظر انداز کیا ہے ان میں یہ مساوات اور انصاف والی شرط بھی ہے۔ اس سے پوچھیں یہ دونوں بیویوں میں صرف برائے نام مساوات بھی کتنے دن قائم رکھ سکا ہے۔ اس سے پوچھیں میرے محترم! ایک مہینے کے اندر اندر اس نے اس مساوات کا حلیہ بگاڑ دیا۔ تین دن میری طرف تین دن دوسری بیوی کی طرف۔ یہ کتنے روز اس طریقے پر چل سکا ہے۔ بس اس کا نام تھا۔ اس نے اس مساوات کی ایک جانب تھپڑ اور ٹھوکریں رکھ دیں اور دوسری طرف محبتیں اور نوازشیں۔''

''کیا ایسا ہوا جلال الدین؟'' محترم بزرگ نے پوچھا۔

جلال نے کھڑے ہو کر کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز پھنس گئی۔ اس کے گلے میں کھانسی کا پھندا سا لگ گیا۔ وہ بولے بغیر بیٹھ گیا۔

حجاب بے باکی سے بولی۔ ''یہ جھوٹا ہے محترم بزرگ! ہر لحاظ سے جھوٹا ہے۔ اس نے اپنی تفریح طبع کے لیے دوسری شادی کی ہے اور ہو سکتا ہے کہ تیسری بھی کرے، جس طرح اس کے پیر طریقت صاحب نے تین شادیاں کر رکھی ہیں۔ یہ منافق لوگ ہیں محترم بزرگ۔ ان کی زبان پر کچھ دل میں کچھ ہوتا ہے۔ میرے شوہر جلال کو بھی بار بار کہتا ہے کہ مومن کے لیے دنیا ایک قید خانہ ہے۔ اس کی اصل زندگی تو آخرت میں شروع ہو گی۔ اس کا اس زندگی پر بھروسہ نہیں ہے محترم بزرگ! اگر ہوتا تو پھر شاید اس کی موجودہ زندگی میں قید خانے کی زندگی والی جھلک ہوتی۔ اس سے پوچھیں محترم بزرگ! یہ کیسا قید خانہ ہے جس میں بہترین لذتیں اور راحتیں بھی موجود ہیں۔ بے شمار دولت بھی ہے اور مزید دولت کی شبانہ روز ہوس بھی ہے۔ اگر یہ قید خانہ ہے تو پھر اس دنیا کی نارمل زندگی کیا ہو گی؟''

محترم بزرگ نے جلال سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''کیا تم ایسی بات کہتے رہے ہو؟ اور اس حقیقت کو بھولے ہو گے مومن کے لیے دنیا ایک قید خانہ ہے؟''

جلال نے کھڑے ہو کر بولنا چاہا مگر آواز ایک بار پھر گلے میں اٹک کر رہ گئی شدید کھانسی کے سبب وہ دہرا ہو گیا اور بیٹھ گیا۔

حجاب کی آواز کچھ اور بلند ہو گئی۔ وہ گرج کر بولی۔ ''یہ کہتا رہا ہے محترم بزرگ! اور ایسی اور بھی بہت سی باتیں کہتا ہے جن پر عمل نہیں کرتا۔ اس کا دنیا دار بھائی فیروز بدنام ہے لیکن حقیقت میں شاید فیروز میں اور اس میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ فیروز شراب پیتا ہے، یہ شراب نہیں پیتا لیکن اسے دولت اور اختیار کا نشہ ہے۔ فیروز دنیا کے بہترین کھانے کھا کر کام و دہن کی لذت حاصل کرتا ہے۔ یہ بھی اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔ بظاہر یہ حرام حلال کی تمیز رکھتا ہے لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو اسے بھی کوئی تمیز نہیں۔ فیروز جدید فیشن کے کپڑوں پر ماہانہ ہزاروں خرچ کر ڈالتا ہے۔ یہ شلوار قمیص اور شیروانی ہی اتنی مہنگی بنواتا ہے کہ حساب برابر ہو جاتا ہے۔ فیروز نت نئی عورتوں کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔ اس نے ایک خاص دائرے میں رہ کر یہ سہولت حاصل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ یہ اور اس جیسے لوگ نکاح کو آڑ بنا لیتے ہیں۔ فیروز دنیا میں گھومتا پھرتا ہے۔ سیر سپاٹے پر لاکھوں خرچ کرتا ہے۔ اس نے اور اس کے پیر صاحب نے تبلیغی دوروں کی آڑ میں یہ شوق پورا کیا ہوا ہے۔ آپ غور سے دیکھتے چلے جائیں میرے محترم بزرگ، آپ کو ان دونوں میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آئے گا اور دنیا ..... دنیا پھر بھی اس بے چارے کے لیے ایک قید خانہ ہے۔ یہ قیدی نہیں ہے بزرگوار! قیدی تو میں ہوں یہ تو داروغہ ہے۔''

''داروغہ ہے؟ کیا مطلب؟''

''یہ اس قید خانے کا داروغہ ہے جس کو یہ گھر کہتا ہے اور جس کو بیوی کہتا ہے وہ قیدی ہے۔ اس جیسے لوگ نکاح کے بول پڑھوانے کے بعد اپنا حق سمجھتے ہیں کہ اپنی بیوی کو اپنی مرضی سے جینے پر مجبور کر دیں یہ چاہتے ہیں اس کا سارا وجود بے دم ناپید ہو جائے۔ اس کا حال اور مستقبل صرف اور صرف ان کے گرد گھومے۔ وہ روئے تو ان کے لیے ہنسے تو ان کی اجازت سے۔ یہ قیدی اور داروغہ کا رشتہ نہیں تو پھر کیا ہے محترم بزرگ! یہ مارتے ہیں اور رونے بھی نہیں دیتے۔ میں نے بھی بس تھوڑا سا رونے کی جسارت کی تھی۔ چند دن اپنے داروغہ کی مرضی کے بغیر کھلی ہوا میں سانس لیا تھا۔ میں مانتی ہوں یہ بھی میری غلطی تھی۔ لیکن میں گناہگار نہیں ہوں جناب! میری یہ سزا نہیں ہے جو مجھے دی جا رہی ہے۔''

اچانک حجاب نے دیکھا کہ جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔ بول نہیں پا رہا تھا مگر اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار حجاب کی طرف آیا۔ اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھ کر حجاب پر جھپٹا۔ اس کے ہاتھ میں لمبے چمکدار پھل کا چاقو تھا۔ حجاب کے والد سینہ تان کر اس کے سامنے آ گئے۔ بیٹی کے سامنے دیوار بن گئے۔ اسٹیج پر موجود لوگوں نے جلال کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ طیش سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس کے مسلح گارڈز بھی اسٹیج پر چڑھ آئے۔ انہوں نے اس کی مدد کی۔ لوگ تتر بتر ہو گئے۔ جلال نے پہلا وار حجاب کے سینے پر کیا جو اس کے ابو نے اپنے کمزور جسم پر جھیلا۔ پھر دوسرا، پھر تیسرا اور چوتھا۔ اس کے ابو گر گئے۔ دھکا لگنے سے وہ بھی کئی فٹ اونچے اسٹیج سے نیچے جا گری۔ اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اسے لگا وہ مر رہی ہے۔ اوپر اسٹیج پر کہرام سا مچا ہوا تھا۔ جلال نیچے آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کسی بھی وقت وہ نیچے اتر کر اس کا پیٹ چاک کر سکتا تھا یا پھر اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر اس کی سانس کی ڈور توڑ سکتا تھا۔ اس کے ابو نہیں تھے۔ اب اسے کس نے بچانا تھا۔ اب کوئی نہیں تھا۔ کوئی نہیں تھا لیکن یہ کیا تھا؟ اس نے ڈوبتی نظروں سے دیکھا۔ دور ایک سایہ سا حرکت کر رہا تھا۔ حجاب کو لگا وہ اس کی مدد کرنا چاہ رہا ہے۔ مدد کے لیے آ رہا ہے۔ وہ کون تھا؟ وہ کون تھا؟

○.....❖.....○

ہادی سخت بے چین تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ حجاب کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ کوشش کے باوجود وہ فرقان سے رابطہ نہیں کر سکا تھا۔ حجاب کے والدین کے گھر میں بھی اس کا فون سنا نہیں گیا تھا۔ فیصل نے کال ریسیو

کی تھی اور اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ گلزاری کی زبانی ہادی کو صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ شریفاں کو ورس والے گھر سے واپس نئے گھر بھیج دیا گیا ہے اور ورس والے گھر میں چوکیدار کے علاوہ ایک نیا گارڈ بھی بھیج دیا گیا ہے۔

حجاب کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں ہادی کا اہم کردار تھا۔ کبھی کبھی تو وہ عرق ندامت میں ڈوب جاتا تھا۔ اس کی غلطیوں میں تصویر والی غلطی بھی شامل تھی۔ وہ حجاب سے عشق کرنے لگا تھا یہ بڑا انوکھا سا عشق تھا اور وہ جانتا تھا کہ عشق صرف حاصل کرنے کا نام ہی نہیں ہے۔ عشق کسی کے لیے اپنی خواہشات کو یکسر قربان کرنے کا نام بھی ہے۔ حجاب کو مصائب سے نکالنے کے لیے وہ اپنی سی ایک کوشش کرنا چاہتا تھا۔ ایک بھرپور کوشش۔ اس کوشش کے لیے حوصلہ درکار تھا اور یہ حوصلہ حجاب کے بھر جانے والی والہانہ محبت اسے مہیا کر چکی تھی۔ آج وہ ایک خاص ارادے کے ساتھ ہوٹل سے نکلا تھا۔

احتیاطاً اس نے ڈپٹی ہاشم ایرک کے ماتحت تھامس کو اپنے ساتھ لے لیا۔ تھامس ایک سفید فام نوجوان تھا اور وردی کے بجائے سادہ لباس میں تھا۔ یہ سہ پہر پانچ بجے کا وقت تھا۔ وہ جلال کے وسیع و عریض ڈیپارٹمنٹل سٹور پر پہنچے۔ ہادی براہ راست جلال کے دفتر میں جانا اور اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ پروگرام یہی تھا کہ وہ اور تھامس علیحدہ علیحدہ سٹور میں داخل ہوں گے۔ تھامس سٹور کے گراؤنڈ فلور پر ونڈو شاپنگ کرتا رہے گا اور ہادی، جلال کے دفتر میں چلا جائے گا۔

مگر جب وہ سٹور پہنچے پروگرام تبدیل ہو گیا۔ ہادی نے دور ہی سے جلال کی ویگن کو جیپ کو سٹور سے نکلتے دیکھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ زرق برق لباس میں ارم بھی اس کے پہلو میں بیٹھی ہے۔

"میرا خیال ہے ہمیں ان کے پیچھے جانا چاہیے۔" ہادی نے انگلش میں تھامس سے کہا۔

تھامس نے اپنا نیم گنجا سر اثبات میں ہلایا اور ڈونسن وہیں روک دی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں ایک محفوظ فاصلہ رکھ کر ہمر جیپ کے پیچھے جا رہے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد وہ ایک قریبی ساحل پر موجود تھے۔ آفس ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ سمندر کے کنارے رش تھا۔ نیلی پیلی چھتریوں تلے لوگوں کا ہجوم دکھائی دیتا تھا۔ یہاں زیادہ تر فیملیاں ہی تھیں۔ ہادی اور تھامس پارکنگ کے قریب گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ جلال اور ارم گاڑی سے نکل کر ریت پر چہل قدمی کرنے لگے۔ بحیرہ روم کا نیلگوں پانی ڈوبتے سورج کی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ ہادی دور سے ان دونوں کی چہل قدمی کا نظارہ کرنے لگا۔ ارم کے چہرے کا نچلا حصہ یعنی ٹھوڑی اور ہونٹ وغیرہ چادر کے نقاب میں تھے، باقی حصہ نظر آ رہا تھا وہ ایک چغہ نما لبادہ پہنے ہوئے تھی۔ وہ قدرے خاموش تھی مگر جلال اچھے موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ارم کا موڈ بحال کرنے کے لیے اسے یہاں لایا ہے (ارم کے موڈ کی خرابی کا تعلق غالباً اسی تہلکہ خیز ملاقات سے تھا جو کل اس کے اور ہادی کے درمیان شانزا کے گمنام کیفے میں ہوئی تھی)

ان دونوں نے کولڈ ڈرنکس لیں اور چپس وغیرہ کھائے۔ کچھ دیر بعد ارم کا موڈ بھی بہتر نظر آنے لگا۔ ہمیشہ سنجیدہ نظر آنے والا جلال بات بات پر ہنس رہا تھا۔ کسی وقت وہ تھوڑی سی شوخی کا مظاہرہ کرتا تھا اور ارم کے پہلو میں بیٹھے

چلتے اسے اپنے ساتھ بھی لگا لیتا تھا۔ اس دوران میں ارم کے پاؤں میں کوئی چیز چبھ گئی۔ وہ غالباً ننگے پاؤں تھی۔ وہ ریت پر بیٹھ گئی۔ جلال بھی بے تکلف بیٹھ گیا اور اس کا پاؤں گود میں رکھ کر اس کا تلوا دیکھنے لگا۔ ان لمحوں میں وہ کوئی عاشق نوجوان ہی دکھائی دیا۔

ہادی ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

جلال اور ارم کی واپسی سورج ڈوبنے سے چند منٹ پہلے ہوئی۔ ہادی اور تھامس کی گاڑی ایک بار پھر ہمر جیپ کے پیچھے تھی۔ جلال سے ملاقات کا آج تو کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ قرائن سے یہی لگتا تھا کہ اب وہ دونوں سیدھے گھر جائیں گے۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ راستے میں ایک جگہ درختوں کے نیچے اچانک جلال نے گاڑی روکی۔ قریب ہی ایک اسلامک کلچرل سینٹر نظر آ رہا تھا۔ یہ دراصل ایک ترک مسجد تھی لیکن اس کے مینار وغیرہ نہیں تھے۔ وہ مسجد کے اندر چلا گیا۔ یقیناً مغرب کی نماز ادا کرنے گیا تھا۔ ارم وہیں گاڑی میں بیٹھی رہی۔ ہادی نے چند لمحے سوچا پھر وہ بھی گاڑی سے نکل کر مسجد میں چلا گیا۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی۔ قیمتی قالین بچھے تھے۔ جدید آڈیو سسٹم تھا۔ ایک جانب شیشے کے ایک چوکور کمرے میں کمپیوٹرز، سی ڈیز اور دینی کتب کا ذخیرہ دکھائی دے رہا تھا۔ باجماعت نماز تو ہو چکی تھی، جلال آخری صف میں کھڑا اپنی نماز پڑھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں ٹھہراؤ کے بجائے عجلت اور بے دھیانی کی سی کیفیت دکھائی دیتی تھی۔

ہادی نے بھی وضو کر کے فرض ادا کیے۔ اسی دوران میں جلال باہر جانے کے لیے تیار نظر آنے لگا۔ اس نے ابھی تک ہادی کو دیکھا نہیں تھا۔ ہادی قالین پر اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس نے آنکھیں سکوڑ کر ہادی کو دیکھا۔ جیسے یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ یہ ہادی ہی ہے۔ "اسلام علیکم جلال صاحب!" ہادی نے محکم لہجے میں کہا۔

وہ سلام کا جواب دینا بھی بھول گیا۔ شیروانی کے براؤن کالر کے اوپر اس کا بھرا بھرا چہرہ سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ عجیب انداز میں بولا۔ "تم...... ابھی تک گئے نہیں ہو یہاں سے؟"

"بس جانے ہی والا ہوں جلال صاحب! آپ سے ایک ملاقات کے لیے رکا ہوا تھا۔"

"ملاقات؟ کس لیے ملاقات؟" جلال کا چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔

"میں جانتا ہوں میری اس طرح کی بے وقت مداخلت آپ کو بری لگی ہے۔ میں اس کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لوں گا۔"

جلال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے ہونٹ مضبوطی سے بھینچ رکھے تھے۔ آنکھوں میں ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے آلتی پالتی مار رکھی تھی۔ ہادی نے اس کے سامنے دو زانو بیٹھے بیٹھے کہا۔ "جلال صاحب! میں اللہ کے گھر میں بیٹھا ہوں۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں آپ کی بیوی بالکل بے قصور ہیں۔ ان کی عزت پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا داغ بھی نہیں ہے۔ ہاں اتنی غلطی ان سے ضرور ہوئی ہے کہ انہوں نے میرے ساتھ چند مونومینٹس کو وزٹ کیا۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جلال صاحب! کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں ان پر کوئی

شک نہ کیجیے گا۔ میں ان کی صفائی میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"

ہادی کے جسم میں لرزش تھی۔ جلال پتھر کا بت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

ہادی نے کہا۔ "میں جانتا ہوں جلال صاحب! ایک تصویر کی بات کو آپ کے سامنے بہت بڑھا چڑھا کر بتایا گیا ہے۔ وہ تصویر میں نے ان کی بے خبری میں اُتاری تھی۔ انہیں اس کی بالکل خبر نہیں تھی۔ یہ میری غلطی ہے میں اس کو تسلیم کرتا ہوں۔ آپ اس کے لیے مجھے جو سزا دینا چاہیں مجھے قبول ہے لیکن خدارا! اس حوالے سے ان کو مورد الزام نہ ٹھہرائیے گا۔ میں بس ایک دو روز میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ آپ کبھی میری صورت نہیں دیکھیں گے۔ اس حوالے سے تسلی رکھیے۔"

جلال اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ مجبوراً ہادی کو بھی کھڑا ہونا پڑا۔ جلال کے تیور اچھے نہیں تھے۔ اس نے گمبیر لہجے میں کہا۔ "تم کتنی بار یہاں سے جاؤ گے، اور کتنی بار آؤ گے اور دوسری بات مجھے یہ بتاؤ کہ میری بیوی کی صفائی کے لیے تم سے کس نے کہا ہے؟"

"کسی نے نہیں کہا۔ جلال صاحب! یہ میرے اندر کی سچائی ہے جو مجھے کھینچ کر..."

"بکواس بند کرو۔" جلال اتنے زور سے دھاڑا کہ مسجد کے در و دیوار لرز گئے۔ اکا دکا نمازی اب بھی مسجد میں موجود تھے۔ وہ چونک کر ان دونوں کی طرف دیکھنے لگے۔

"حرامزادے! شیطان! تیری جرأت کیسے ہوئی۔ مجھ سے بات کرنے کی۔ تیری جرأت کیسے ہوئی۔" وہ دھاڑا اور نتائج سے بے پروا ہو کر ہادی پر پل پڑا۔ اس کا زوردار دھکا لگنے سے ہادی ایک ستون سے ٹکرایا اور اس کی آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ اس نے ہادی پر تھپڑ اور مکے برسانے کی کوشش کی۔ ہادی نے اپنا سر نیچے جھکا لیا۔ چند ضربات اس کو سہنا پڑیں۔ اس کا گریبان پھٹ گیا۔ لوگ بیچ میں کود پڑے۔ بپھرے ہوئے جلال کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔ کسی نے پکار کر کہا۔ "یہ مسجد ہے بھائی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

جلال، ہادی کی طرف اُنگلی اُٹھا کر گرجا۔ "تجھے کہا تھا نا چلا جا یہاں سے۔ تجھے کہا تھا نا۔ میں تیری جان لے لوں گا۔ میں تیرے سانس کھینچ لوں گا۔"

ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں۔ "یہ مسجد ہے۔ ایسا مت کریں یہاں۔"

جلال لپک لپک کر ہادی کی طرف آ رہا تھا۔ نمازیوں نے اسے سنبھالا ہوا تھا۔ اسی دوران میں ڈپٹی کا ماتحت تھامس بھی اندر آ گیا۔ اس نے ہادی کی طرف دیکھا، جیسے جلال کی طرف بڑھنے کی اجازت چاہ رہا ہو۔ "نہیں تھامس!" ہادی نے کہا۔

کچھ لوگ ہادی کو گھیرے میں لے کر مسجد سے باہر لے آئے۔ ہادی کے منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلا ہوا تھا۔ مسجد کے دروازے کے پاس اب بھی جلال کی دھاڑیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بالکل "ہائپر" ہو رہا تھا۔ ہادی نے تھامس کو اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ڈاٹسن گاڑی کی طرف آ گیا۔ اردگرد موجود لوگوں کا بھی ہادی کے لیے یہی مشورہ تھا کہ وہ گاڑی میں بیٹھ جائے۔ جھگڑے کی وجہ تو کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر یہ ضرور پتا چل گیا تھا کہ یہ جھگڑا

خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ چند سیکنڈ بعد ہادی اور تھامس وہاں سے رخصت ہو رہے تھے۔ ہمر جیپ کچھ فاصلے پر کھڑی تھی اور اس کے کھڑکیاں دروازے بند تھے۔ ہادی کے اندازے کے مطابق ارم اس جھگڑے سے بے خبر رہی تھی۔

O.....✥.....O

رات کے دس بجے تھے۔ ہادی اپنے ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ اس کے سینے میں ہلچل تھی۔ وہ جوابی طور پر جلال پر ہاتھ اُٹھا سکتا تھا اور ایسا کرنے کی ہمت بھی رکھتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔ اسے یہ سب کچھ جھیلنا اچھا لگا تھا۔ حجاب کے حوالے سے لگنے والی ہر چوٹ اس کے تصورات میں ایک سنہری ستارے کی طرح چمکنے لگتی تھی۔

جلال سے ہونے والی اس سنگین ملاقات کے بعد یہ بات اچھی طرح ہادی کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ جلال اور حجاب کے معاملات پوائنٹ آف نو ریٹرن پر آ گئے ہیں۔ جلال میں کوئی معمولی لچک بھی ہادی کو دکھائی نہیں دی۔ اگر ایسا ہوتا تو شاید وہ اپنی عزت بے عزتی کو ایک طرف رکھ کر جلال کے شبہات دور کرنے کی ایک اور کوشش کرتا۔ جلال اس کی توقع سے زیادہ سنگلاخ اور کرخت ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بظاہر تو حجاب کو طلاق دینے پر آمادہ تھا مگر حقیقت میں اسے اپنی حبس بے جا میں رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

ہادی کے ان خیالات کو اس وقت مزید تقویت ملی جب اگلی صبح اسے گلزاری نے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ کل اس کی ملاقات جلال کے ڈرائیور عثمان سے ہوئی ہے۔ عثمان کا کہنا ہے کہ ورس والے گھر میں حجاب پر بڑی سختی ہو رہی ہے۔ دو تین دن پہلے اس کے ملازمہ شریفاں کا فون برآمد ہو گیا تھا۔ جلال نے پتا نہیں اس سے کیا مطلب لیا اور اس سے سخت مار پیٹ کی۔ ایک ملازمہ نے حجاب کے پھٹے ہوئے خون آلود کپڑے گھر کے غسل خانے میں دیکھے ہیں۔ کلثوم دن رات اس کی نگرانی کرتی ہے اور کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں۔

"اس کے گھر والوں کو بھی نہیں۔ میرا مطلب ہے میکے والوں کو۔" ہادی نے گلزار سے پوچھا۔

"وہ تو شاید ملنا ہی نہیں چاہتے۔ یا پھر ڈرتے ہیں لگتا ہے کہ انہوں نے حجاب کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ اس کی والدہ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ پھر بھی کسی نے اسے اس کی اطلاع نہیں دی۔ دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ عثمان کا کہنا ہے کہ کل رات ورس والے گھر میں ایک اور گارڈ بھیج دیا گیا ہے۔ اب وہاں ایک چوکیدار اور دو گارڈز تھے۔ شاید جلال صاحب کو کوئی خطرہ ہے۔"

ہادی سمجھ گیا کہ یہ اضافی گارڈ کل شام مسجد میں پیش آنے والے واقعے کے ردعمل کے طور پر بھیجا گیا ہے۔ حالات سنگین شکل اختیار کر رہے تھے۔

اب کوئی راست اقدام اُٹھانے کی ضرورت مزید شدید ہو گئی تھی۔ اگلی صبح ہادی نے ڈاکٹر عطا سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر عطا صاحب، حجاب کے گھر والوں کے فیملی ڈاکٹر تھے اور حجاب، فیصل وغیرہ انہیں ڈاکٹر انکل کے نام سے پکارتے تھے۔ چند دن پہلے ڈاکٹر عطا کے کلینک میں ہادی ان سے مل چکا تھا۔ اس نے ان سے نزلے بخار کی دوا لی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ انکل فیاض نے اسے ان کا پتا بتایا ہے۔

ڈاکٹر عطا ہر لحاظ سے ہادی کو ایک نرم خو اور دانا بینا شخص لگے تھے۔ وہ ہادی کے ادبی ذوق سے بھی متاثر ہوئے تھے۔ آج ہادی ایک پروگرام لے کر ان کی طرف جا رہا تھا اور نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ڈاکٹر عطاء اس کو ایپرو دیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کا گھر کلینک کے ساتھ ہی واقع تھا۔ اتوار کے روز وہ صبح کے وقت چھٹی کرتے تھے۔ ہادی کو پتا تھا کہ وہ گھر میں ہی ہوں گے۔ ہادی نے ملازم کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ قریباً دس منٹ بعد وہ عطا صاحب کے ساتھ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا گرین ٹی پی رہا تھا۔ ان کی اطالوی وائف کو دس گیارہ بجے تک سونا تھا۔ عطا صاحب اکہرے بدن کے پچپن چھپن سالہ شخص تھے۔ عمر کے مقابلے میں صحت بہت اچھی تھی۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں نرم خوئی اور معاملہ فہمی کی جھلک بہت نمایاں نظر آتی تھی۔ اپنے طور اطوار سے وہ روشن خیال بھی لگتے تھے۔

چار پانچ منٹ کے اندر ہی ان کی باتوں سے ہادی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ولبلہ فیملی کی حالت سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ حجاب کس صورت حال سے گزر رہی ہے اور اس صورت حال میں ہادی کا کردار بیان کیا جا رہا ہے وہ اس سے بھی باخبر ہیں۔

اس سب کے باوجود وہ ان کے سامنے بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ہادی کے حوالے سے وہ بدگمانیاں اور طیش ڈاکٹر عطا کے ذہن میں نہیں تھا جو انکل فیاض اور فیصل وغیرہ کے ہاں پایا جا رہا تھا۔ یا کم از کم اس درجے کا نہیں تھا۔

ہادی نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں لمبی تمہید باندھنا نہیں چاہتا۔ آپ کے سامنے حلفیہ بیان دیتا ہوں کہ میرے اور حجاب کے حوالے سے جو باتیں پھیلائی گئی ہیں ان میں ایک رائی کے دانے کے برابر بھی سچائی نہیں۔ ہم دونوں اچھے دوستوں کی طرح چند بار ملے ضرور ہیں لیکن وہ بھی ایک فاصلے اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔“

وہ بڑی گہری نظروں سے ہادی کو دیکھتے رہے۔ ان کی نگاہیں جیسے ہادی کے اندر تک جا رہی تھیں۔ بہرحال حسب معمول دھیمے لہجے میں بولے۔ ”کیا دونوں طرف ہی ایسا تھا۔“

”م...... میں سمجھا نہیں جی۔“

”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ تم حجاب کے متعلق جو کہہ رہے ہو وہ بالکل درست ہے لیکن کیا تم اپنے بارے میں بھی درست کہہ رہے ہو۔ میرا مطلب ہے تمہارے دل میں حجاب کے لیے بس دوستی ہے؟“

ایک لمحے کے لیے وہ ٹپٹا گیا مگر پھر سنبھل کر بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب! حجاب میرے لیے ہمیشہ محترم رہی ہیں اور رہیں گی۔ میرے ذہن میں ان کے لیے کوئی نامناسب خیال آ ہی نہیں سکتا یہ ناممکن ہے جناب۔“

وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر پھر خاموش رہے۔ بس اسے دیکھتے رہے۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کچھ کہہ رہے ہوں۔ ”تم نے بات کو الفاظ کے غلاف میں لپیٹا ہے۔ مسٹر ہادی! بہرحال آگے کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟“

ہادی نے چائے ختم کرنے کے بعد کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! مجھے پتا نہیں کہ آپ اس بات کو کس انداز سے لیں گے۔ مگر میں پورے خلوص دل کے ساتھ اس مصیبت میں انکل فیاض کے ساتھ تعاون کرنا چاہتا ہوں۔“

”کس طرح کا تعاون؟“

”مالی تعاون ڈاکٹر صاحب! اور ایک بار پھر کہوں گا کہ پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ۔ مجھے معلوم ہے کہ انکل فیاض اس وقت سخت مالی مشکلات میں ہیں۔ انہوں نے خالہ صوفیہ کے علاج اور فیصل کی شاپ کے لیے ایک بڑی قرض اٹھایا تھا، جو تا حال اُتر نہیں سکا اور یہی قرض ہے جس کے سبب حجاب کی مصیبت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔“

انہوں نے پھر اپنی آنکھیں ہادی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ وہ گہرائی تک دیکھ رہے تھے۔ یہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ آخر یوں لگا کہ ہادی کے اندر کی سچائی نے ان پر قرار واقعی اثر کیا ہے۔ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ”کھل کر کہو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ڈاکٹر صاحب! پلیز میری بے لوثی پر شبہ نہ کیجیے گا۔ میں انکل فیاض کو قرض حسنہ کے طور پر کچھ رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے معلوم ہے کہ وہ میرے حوالے سے بہت بدگمان ہیں۔ میری ایسی کوئی پیشکش انہیں قبول نہ ہوگی۔“

”ہوں۔“ ڈاکٹر صاحب نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

”میں جانتا ہوں ڈاکٹر صاحب! کہ انکل فیاض کے لیے رقم کا بندوبست کرنے کے سلسلے میں آپ بھی کوشش کر رہے ہیں۔ آپ کے ایک دو دوستوں نے تعاون کا وعدہ کیا ہے۔ آپ مجھے بھی ان میں شامل سمجھئے۔ میں چاہتا ہوں کہ رقم کی فراہمی کے سلسلے میں میں سامنے نہ آؤں۔ یہ کام آپ کے توسط سے ہو جائے۔ آپ اس میں میرا کوئی ذکر نہ کریں۔ اور میں اپنی بات دہراؤں گا۔ یہ قرض حسنہ ہوگا۔ وہ جیسے اور جب چاہیں اپنی سہولت کے مطابق لوٹا سکیں گے۔“

اگلے آدھ پون گھنٹے میں ڈاکٹر عطا اور ہادی کے درمیان اس معاملے میں تفصیلی گفتگو ہوئی۔ ہادی نے کہا کہ وہ اگلے پندرہ بیس روز کے اندر انہیں اپنے ذرائع سے قریباً 8 لاکھ روپیہ فراہم کر سکتا ہے۔

یوں لگتا تھا کہ ڈاکٹر عطا کی معاملہ فہمی نے ہادی کے دل و دماغ کو ٹٹول لیا ہے۔ وہ اس کی شرافت کے ساتھ ساتھ اس کے جذبے کی شدت اور سچائی کے بھی قائل ہو رہے ہیں۔ ان دونوں میں جلد ہی اعتماد کی فضا قائم ہو گئی۔ ڈاکٹر عطا نے ہادی کو قرضے کی مکمل تفصیل فراہم کی اور یہ بھی بتایا کہ کتنی رقم کا انتظام ہو چکا ہے۔ یہ دراصل پہلی قسط کا انتظام تھا جو قریباً 102300 یورو یعنی ایک کروڑ دس لاکھ روپے کے لگ بھگ بنتی تھی لیکن اس میں بھی ابھی پینتیس چالیس لاکھ روپے کم تھے۔

ہادی نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! میں چاہتا ہوں کہ قسط کے بجائے پوری رقم ہی ان لوگوں کے منہ پر ماری جائے اور یہ معاملہ ختم کروا دیا جائے۔ اس کے بعد سب کچھ حجاب پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ جلال سے Divorce چاہتی ہیں یا نہیں۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہادی! مگر یہ کہنا آسان ہے اس پر عمل خاصا مشکل ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے یہ مارک اپ وغیرہ ڈال کر سوا تین کروڑ روپے کے قریب بن جاتے ہیں۔ بہت کوشش کر کے ہم جو جمع کر سکے ہیں وہ پینسٹھ ہزار یورو یعنی ستر لاکھ کے لگ بھگ ہیں۔ اب اگر تمہارے 80 لاکھ بھی جمع ہو جائیں تو یہ ڈیڑھ کروڑ کے قریب بن جائے گا۔ اس کے بعد بھی ہمیں لگ بھگ مزید ایک کروڑ اسی لاکھ کی ضرورت ہوگی۔“

ہادی نے تھوڑی کھچاتے ہوئے کہا۔ "عطا صاحب! مجھے ایک بات بتائیں۔ یہ فیاض صاحب کا ذاتی معاملہ ہے لیکن اس حوالے سے ذہن میں سوال ضرور اٹھتا ہے۔ وہ جس مکان میں رہ رہے ہیں میرے اندازے کے مطابق پاکستانی کرنسی میں ساڑھے چار کروڑ کا تو ضرور ہے۔ کیا اسے بیچ کر کسی نسبتاً چھوٹے گھر میں رہنے کا خیال ان کے ذہن میں نہیں آتا۔"

ڈاکٹر عطا نے عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل یہ مکان اکیلے فیاض کا نہیں ہے۔ اس میں پچاس فیصد حصہ فیاض کی بڑی بھاوج کا ہے اور وہ بڑی سخت گیر عورت ہے۔ وہ مکان فروخت کرنے پر راضی نہیں ہو گی۔ جب فیاض نے گھر کو گروی رکھا تھا تب بھی وہ بڑی مشکل سے تیار ہوئی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ تب اسے رشتے داری ہو جانے کی امید تھی۔ اس وقت تک فیاض کے بڑے بھائی بھی زندہ تھے۔"

"رشتے داری سے آپ کا کیا مطلب ہے؟"

"دراصل فیاض کی بڑی بھاوج خواہش رکھتی تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی فیاض کے بیٹے فیصل سے ہو جائے۔ فیاض کے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی شاید فیصل کے لیے۔ لڑکی عمر میں بڑی ہے تقریباً اٹھائیس انتیس سال کی۔ ڈیل ڈول کی وجہ سے اس سے بھی زیادہ کی لگتی ہے۔ فیصل کو تو تم نے دیکھا ہی ہوگا۔ دونوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔ اس تنازعے کی وجہ سے دونوں گھرانوں میں کافی کھچاؤ ہے۔"

ہادی نے کہا۔ "ٹھیک ہے جناب! یہ بات تو سمجھ میں آ رہی ہے لیکن اب جلال والے معاملے کا کیا کیا جائے۔ یہ بات تو اب تقریباً کلیئر ہے کہ حجاب اور جلال اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ حجاب علیحدہ ہو جانا چاہتی ہیں۔ حقیقت بھی اب ہم سب جانتے ہیں کہ وہاں درس والے گھر میں حجاب۔ بہت سختی کے دن گزار رہی ہیں۔ جلال انہیں کہہ چکا ہے کہ وہ زیادہ تنگ ہے تو اس سے طلاق لے لے۔ اور یقیناً اب حجاب بھی یہی چاہتی ہوں گی۔ مگر انہیں یہ بھی اچھی طرح معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے بعد ان کے گھر والے سخت مصیبت میں آ جائیں گے۔ بات تو بالکل واضح ہے۔ حجاب کو آزادی اس صورت میں مل سکتی ہے جب یہ قرض والا معاملہ ختم ہوگا۔"

"مگر کیسے؟ اہم سوال تو یہی ہے۔"

ہادی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پُرسوچ لہجے میں بولا۔ "آپ نے ابھی بتایا ہے کہ گجرات میں فیاض صاحب کی کچھ زمین ہے جو وہ بیچنا چاہ رہے ہیں۔ اگر ہم کسی طرح اس کا کوئی گاہک پیدا کر سکیں تو صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔ آپ کا کیا اندازہ ہے۔ کتنے تک بک جائے گی وہ جگہ؟"

ڈاکٹر عطا بولے۔ "قیمت تو اس کی اسی پچاسی لاکھ سے کم نہیں ہے۔ مگر فیاض ساٹھ ستر تک بھی بیچنے کو تیار ہے۔ مسئلہ تو حقیقی خریدار کا ہے۔"

"عطا صاحب! آپ مجھے چھ سات روز کی مہلت دیں۔ میں اس سلسلے میں کوشش کرتا ہوں۔ آج کل میں جن کے لیے کام کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ یہ رقبہ خریدنے پر آمادہ ہو جائیں یا کسی اور کو آمادہ کر لیں۔"

"وہ بک بھی جائے گی ہادی! تو ہم زیادہ سے زیادہ 2 کروڑ دس میں لاکھ تک پہنچ جائیں گے۔ میرا اندازہ تو

یہی ہے کہ جلال کو اتنی بڑی رقم یکمشت ادا کرنا کافی مشکل کام ہے۔"

"مگر ہم ایک بھرپور کوشش تو کر سکتے ہیں عطا صاحب! آپ ..... آپ مجھے ایک ہفتے کا ٹائم دیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ کر سکوں گا۔ آپ بھی اپنے طور پر کوششیں جاری رکھیے۔ ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ فنڈ تو فیاض صاحب اور فیصل کے پاس بھی ہوگا۔ ان شاء اللہ کوئی اچھی صورت حال سامنے آئے گی۔ مگر وہی پہلے والی گزارش میں ایک بار پھر آپ کے سامنے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں میرا نام کہیں نہ آئے۔"

ڈاکٹر عطا اثباتی انداز میں خاموش رہے۔ یہ بات وہ بھی بڑی اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ جلال کے گھر میں حجاب کے لیے حالات دن بہ دن دگرگوں ہوتے جا رہے ہیں اور اسے اس صورت حال سے نکالے جانے کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ اسے زبردستی نکالنا بے کار تھا اور اس نے نکلنا بھی نہیں تھا۔ وہ اپنے والدین کو مزید مشکلات میں ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔ ان کی سلامتی و آسودگی کے لیے وہ بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو چکی تھی۔ اب ایک ہی راستہ تھا اسے اور اس کے والدین کو معاشی شکنجے سے نکالا جاتا۔

وہیں ڈاکٹر عطا صاحب کے پاس بیٹھے بیٹھے ہادی نے شنو صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے چھوٹتے ہی کہا۔ "اوئے قربان جاواں تیرے تے ہادی پیارے! ہلا کے رکھ دتا ہے تُو نے مارکیٹ کو۔ مزہ آ گیا تیری قسم۔ بس اب جلدی سے ایک اور میٹریل اور سٹک دے (پھینک دے) ہوائی ڈاک کے ذریعے۔ کوئی چودہ کے تیرہ گانے ہو جائیں۔"

"چلو شنو بھائی! وہ بھی سٹ دیتا ہوں۔ پر آپ کو بھی کچھ پیسے اور ڈھیلے کرنے پڑیں گے۔ ضرورت آن پڑی ہے۔"

"اوئے کتنے پیسے... تو فرمائش اتنی ہی کرنا جتنی میری پسلی ہے۔"

"آپ کی پسلی کافی بڑی ہے شنو بھائی! اور کافی سخت بھی ہے۔"

"اوئے اتنی سخت بھی نہیں ہے۔ پر تیں گل کر کوئی کم کچھ نہ کچھ۔ تُو بس کوئی نئی چیز بھیج دے فافٹ۔ وہ کیا گانا لکھا تو نے اس آخری فون کر لیں یار او ذرا ساجی اور کر لیں یار دو۔ بس اسی ٹائپ کی کوئی سپر ہٹ چیز لکھ بھیجتی ہے۔"

"ہو جائے گا شنو بھائی! اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ گجرات کے علاقے میں زمین کا ایک ٹوٹا ہے۔ بڑی مناسب جگہ ہے۔ جلد ہی کسی نہ کسی سکیم میں آ جائے گی سستے داموں مل رہی ہے۔ انویسٹمنٹ کر لیں۔ فائدے میں رہیں گے۔"

"یار ہادی! تُو شاعری رہ پراپرٹی ڈیلر نہ بن۔ ورنہ مروا دے گا کہیں۔"

"شنو بھائی! شاعر اور زمین کا گہرا تعلق ہے۔ ہر غزل کی ایک زمین ہوتی ہے۔"

"ایک تو یار تُو مذاق بڑا ہے۔ اچھا کس تحال پر ہے یہ پلاٹ؟"

"یہ میں آپ کو شام کو بتاؤں گا۔ اور تھوڑی بہت ایڈوانس کی رقم بھی اپنے لیے ....."

"چلو پھر ٹھیک ہے۔ شام کو بات کریں گے۔" شنو بھائی نے کہا۔

شنو بھائی سے بات ختم کر کے ہادی پاکستان میں اپنے واقف پراپرٹی ڈیلر کا نمبر ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی ڈی اے اسکیم میں ہادی کا اپنا دس مرلے کا پلاٹ بھی تو تھا۔

O......✤......O

حجاب گھر کے نیم تاریک بیسمنٹ میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر صبح یہ امید بندھتی تھی کہ وہ آج شام تک یہاں سے نکال لی جائے گی اور ہر شام یہ امید ٹوٹ جاتی تھی۔ یہاں اب اسے چھٹا دن تھا۔ یہ چھ دن چھ برسوں سے کم نہیں تھے۔ اس دوران میں اسے ایک بار بھی جلال کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ باہر کی دنیا سے اس کا واحد راستہ کلثوم ہی تھی۔ اب وہ بے بسی کی انتہا کو چھونے لگی تھی۔

یہ چھٹے روز کی شام کی بات ہے۔ حجاب وہیں دروازے کے پاس فرش پر ایک غالیچہ بچھائے لیٹی ہوئی تھی۔ اسے فاصلے سے گاڑی کا مدھم ہارن سنائی دیا۔ وہ چونک گئی۔ یقیناً یہ جلال کی ہی جیپ تھی۔ وہ یہاں آیا تھا۔ وہ ایک دم بے قرار ہو گئی۔ کچھ دیر اُٹھ کر کمرے میں گھومتی رہی پھر دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ وہ ساتھ ساتھ کلثوم کو آوازیں دے رہی تھی۔ کلثوم تو جیسے بالکل بہری ہی ہو چکی تھی۔ اس کی کوئی منت سماجت سنتی ہی نہیں تھی۔ "کلثوم! میری بات سن لو۔ صرف ایک بار...... کلثوم......"

اس کے اردگرد وہی سناٹا رہا جو آج کل دن رات اس کی جان کھا رہا تھا۔ وہ بے چینی اور ڈپریشن کی انتہا پر پہنچ گئی۔ وہ جلال کو آوازیں دینے لگی۔ "جلال...... جلال! میری بات سنیں۔ ایک بار میری بات سنیں۔" ساتھ ساتھ وہ دروازے پر دو ہتڑ بھی مار رہی تھی۔ اس کے رونے چلانے کی آوازیں بیسمنٹ کی سنگلاخ دیواروں میں گونجنے لگیں۔

اور پھر بیسمنٹ کی سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ نیچے آ رہا تھا۔ وہ بلند آواز سے پکارتی رہی۔ دروازے کا لاک کھولا گیا۔ حسب معمول دروازہ چھ سات انچ تک کھلا اور دوسری طرف جلال کی صورت دکھائی دی۔ وہ شلوار قمیص اور ویسٹ کوٹ میں تھا۔ ہمیشہ کی طرح سیل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔

وہ بے دم سی ہو کر گر پڑی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ "جلال! مجھے یہاں سے نکالیں۔ مجھے یہاں کیوں بند کیوں کر دیا ہے؟" وہ بلکتی سی آواز میں بولی۔

"اپنے سوال کا جواب ابھی تم نے خود ہی دے دیا ہے۔" جلال پھنکارا۔ "اس طرح چلاؤ گی تو پھر تمہارے منہ میں کپڑا بھی ٹھونسنا پڑے گا۔"

"میں کچھ نہیں کہوں گی جلال! اپنے ہونٹ سی لوں گی لیکن پلیز مجھے اس طرح بند نہ کریں۔ میں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔"

"کچھ نہیں ہو گا تمہیں۔ میں جانتا ہوں بڑی سخت جان ہو اور اتنی ہی سخت دل بھی ہو۔ تمہارے جیسی عورتیں بہت کچھ جھیل سکتی ہیں۔"

"میں کیسی عورت ہوں جلال! مجھے بتائیں میں نے کیا کر دیا ہے کیا آپ بھی دنیا کی باتوں میں......"

"بکواس بند کرو۔" وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ دیواریں ہل گئیں۔ "اس بارے میں ایک لفظ منہ سے نکالا تو تمہیں پتا ہے، مجھ سے یہ جھوٹ برداشت نہیں ہوتا۔"

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ دروازے سے سر ٹکا کر سسکیاں لینے لگی۔ پھر آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر بولی۔

"مجھے اتنا تو بتا دیں۔ امی کا کیا حال ہے۔ کہاں ہیں وہ؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "آنٹی کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ مگر اب بہتر ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک دو دن میں گھر آ جائیں۔"

"پلیز جلال! مجھے ایک بار ان سے ملا دیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں انہیں کچھ نہیں بتاؤں گی۔ ایک لفظ زبان سے نہیں نکالوں گی۔ آ...... آپ میرے ساتھ رہیے گا۔ میں بس پانچ منٹ ان کے پاس بیٹھ کر واپس آ جاؤں گی۔"

"ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ تم جہاں ہو بالکل ٹھیک ہو۔ تمہارے گوشت کی گرمی ذرا ٹھنڈی ہو جائے گی تو پھر دیکھیں گے۔"

اسے لگا اس کی سانس رُک جائے گی۔ اس نے بیٹھے بیٹھے دروازے کی درز میں سے ہاتھ گزارا اور جلال کا پاؤں پکڑ لیا۔ سیاہ رنگ کی چمچاتی جوتی کو اپنے نازک ہاتھ میں تھامتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے ایسا نہ کریں جلال! آپ جو کہیں گے میں وہی کروں گی۔ لیکن مجھے یہاں سے نکال لیں جلال۔"

وہ اپنی جگہ تنا کھڑا رہا۔ چہرے پر نرمی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کٹیلے انداز میں بولا۔ "اسی لہجے میں بات کرو نا جیسے کیا کرتی تھی۔ تمہارے اندر چنگاری تھی نا بغاوت کی۔ جو رہ رہ کر تمہارے اندر چنگارے مارتی تھی۔ اب چکاؤ نا اسے۔ اب وہ کیوں نہیں بھڑک رہی۔ بتاؤ نا۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ریشمی بال مٹھی میں جکڑے اور جھٹکا دے کر اس کا چہرہ اوپر اپنی طرف اٹھا دیا۔ وہ رونے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔ جلال کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کے بالوں کی جڑیں اکھڑنے لگیں۔ وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی۔ "اُف جلال مجھے درد ہو رہا ہے۔ پلیز چھوڑ دیں۔"

وہ اور زور سے پکڑتے ہوئے بولا۔ "میرے سوال کا جواب دو۔ اس چنگاری کا ذکر تم نے خود ہی کیا تھا اور میرا خیال ہے کہ وہ چنگاری تم جہیز میں اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔ اب کہاں ہے وہ؟"

وہ تکلیف کی شدت سے بُری طرح کراہنے لگی۔ اس کی گردن ایک طرف مڑی ہوئی تھی۔ اس کے لرزاں ہاتھ جلال کی کلائی پر تھے۔ جیسے وہ خود کو چھڑانے کی کمزور سی کوشش کر رہی ہو۔ اس میں اتنی سکت ہی نہیں تھی کہ جواب میں کچھ کہہ سکے۔ جلال نے ایک جھٹکا دے کر اس کے بال چھوڑ دیے اور پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنا چاہا۔ حجاب نے تڑپ کر دروازے کا پٹ تھام لیا۔ "اسے بند نہ کریں۔ اسے کھلا رہنے دیں۔ خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔" وہ دل فگار آواز میں بولی۔

جلال ماننے والا کہاں تھا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ حجاب کا ہاتھ دونوں پٹ کے درمیان آ گیا۔ وہ پٹ چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ مگر جب جلال نے دباؤ بڑھایا اور اسے اپنی ہتھیلی کی ہڈیاں کڑکڑاتی محسوس ہوئیں تو اس نے تڑپ کر ہاتھ اندر کر لیا۔ اس کی کراہیں دلدوز تھیں۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں کراہتی اور سسکتی رہی۔ پھر نڈھال سی ہو گئی اور دروازے کے پاس ہی غالیچے پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنا منہ دروازے کی نچلی درز سے بالکل قریب کر لیا۔ ایسا

کرنے سے اسے کچھ سکون ملتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ باہر کی روشنی اور ہوا کو محسوس کر رہی ہے۔

O.....❖.....O

درحقیقت ہادی کے نئے گیتوں کے البم نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ گلوکار بھی نیا تھا۔ موسیقار کے پچھلے ایک دو البم فلاپ گئے تھے۔ اس البم کی اصل جان ہادی کے لکھے ہوئے بول ہی تھے۔ وہی بول جو اس نے کسی کے دیے ہوئے قلم سے لکھے تھے۔ وہ گیت تو خاص طور سے خاص و عام میں مقبول ہو رہا تھا جس میں وینس کی ایک رات کا ذکر تھا اور نہایت تابندہ پیشانی والی ایک لڑکی کا ذکر تھا۔ جو نہ جانے کہاں سے آئی تھی اور صدیوں کا سفر طے کر کے اس تک پہنچی تھی۔ اور وہ بھی زمانوں سے اس کا انتظار کر رہا تھا اس کی سحر انگیز مسکراہٹ پر گیت لکھ رہا تھا۔ دونوں روشنیوں سے جھلملاتے ایک رواں پانی کے کنارے ملے تھے۔ وہ اسے پہچان گیا تھا لیکن وہ اسے نہیں پہچانی تھی۔ یہ کیسا ملن تھا؟ یہ کیسی بے خبری تھی؟

ہادی ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ آڈیو سسٹم پر یہی گیت دھیمی آواز میں پلے ہو رہا تھا۔ ہادی کے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں کیلکولیٹر تھا۔ وہ حساب کتاب جوڑ رہا تھا۔ وہ لاہور سے روانہ ہوا تھا تو اس کے بینک اکاؤنٹ میں گیارہ لاکھ کے قریب موجود تھے۔ گھر میں سیونگ سرٹیفکیٹس اور بانڈز وغیرہ کی شکل میں بھی بارہ چودہ لاکھ روپیہ رکھا تھا۔ البم کی مقبولیت کے بعد اس کے بینک اکاؤنٹ میں تیزی سے رقوم کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ تین البمز کے گیت لکھ چکا تھا۔ پہلا البم لانچ ہو گیا تھا اور معاہدے کے مطابق اس کی رائلٹی کی مد میں بھی کچھ رقم اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئی تھی۔ قریباً دس لاکھ شیخو صاحب ایڈوانس دینے والے تھے۔ یہ کل ملا کر 81 لاکھ کے قریب بن رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں ہادی کو لگ رہا تھا کہ جو پینتیس چھتیس لاکھ روپیہ پاکستان سے آ کے ڈیپازٹ ہوا ہے۔ وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ یہ حجاب کی امانت ہے۔ اس کی اصل حقدار وہی ہے۔ کیونکہ اس کی ہوئی توانائی سے اس کی تخلیقی قوت کے بند سوتے کھلے ہیں اور اس کے دیے ہوئے قلم سے اس نے وہ الفاظ کاغذ پر اُتارے ہیں جنہوں نے اس کے لیے آسانیوں اور کشائش کے دروازے کھولے ہیں۔

اس نے ساری جمع تفریق کر لی۔ اب اگر وہ لاہور میں اپنی ہنڈا گاڑی فروخت کر دیتا تو وہ 80 لاکھ روپیہ تو قریباً پورا ہو جاتا تھا جس کا وعدہ اس نے ڈاکٹر عطا سے کیا تھا۔ مگر گاڑی فروخت کرنے سے لاہور میں والدہ اور بھائی کے لیے مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ وہ ان کو ذرا سی پریشانی بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔ اگر گاڑی فروخت نہ ہوتی تو سترہ اٹھارہ لاکھ روپے کم پڑ جاتے۔

اس سے بہتر تو یہی تھا کہ وہ اپنا ایل ڈی اے سکیم والا پلاٹ بیچ دیتا کوئی ایسا گاہک جو پوری رقم یکمشت ادا کر دیتا۔ یوں اسے تیس بتیس لاکھ روپے مزید مل جاتے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گاڑی کے بجائے پلاٹ فروخت کر دے گا۔

پتا نہیں یہ کیسا جذبہ تھا۔ ہادی کو اپنا سب کچھ لٹا دینے پر آمادہ کر رہا تھا۔ بس اس کے دل میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی۔ حجاب کو کسی طرح معاشی شکنجے سے آزاد کرانا ہے۔

اس نے فون اُٹھایا اور شیخو صاحب کا نمبر پریس کیا۔ وہ غالباً دوپہر کے بھاری بھرکم کھانے کے بعد دو گلاس لسی

ڈکا چکے تھے اور اب دفتر میں ہی کچھ دیر سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ "ہیلو" ان کی پاٹ دار آواز سنائی دی۔

"کیا بنا شیخو بھائی؟"

"یار! اب بنے گا تو وہی جو تم بتاؤ گے۔ ہم تو تمہارے حکم کے بندے بنے ہوئے ہیں۔"

"نہیں...... میرا مطلب ہے جو تھوڑا سا ایڈوانس مانگا تھا آپ سے؟"

"شہزادے! تھوڑا سا تو نہیں تھا وہ۔ بہرحال میں نے ٹرانسفر کر دیا ہے تمہارے اکاؤنٹ میں دس لاکھ۔"

"اور وہ جو انویسٹمنٹ کا مشورہ دیا تھا آپ کو؟"

"اوئے جگر گوشے! تم اس مسکین کو کہیں انویسٹمنٹ کرنے جوگا چھوڑو گے تو انویسٹمنٹ کرے گا نا۔"

"چھوڑیں شیخو بھائی! آپ تو اپنا کرتہ اُتار کر جھاڑیں تو آٹھ دس لاکھ ٹپک پڑتا ہے۔"

"تو آٹھ دس لاکھ میں تو نہیں ملے گا نا وہ گجرات والا رقبہ۔"

"چلیں کچھ اور ڈال لیں اس میں۔ مجھے لگتا ہے ساٹھ پینسٹھ تک یہ سودا ڈن ہو جائے گا۔ زیادہ نہیں تو پچیس پرسنٹ تو آپ خرید میں ہی کما رہے ہیں۔"

"اچھا یار!" شیخو بھائی نے تھکی تھکی آواز میں کہا۔ "مجھے لگتا ہے کہ اب تو نے یہ ڈھول میرے گلے میں ڈال کے ہی چھوڑنا ہے۔ مگر مجھے یہ دس کہ تیرے ارادے کیا ہیں۔ اس کڑی کو طلاق ہو بھی جاتی ہے اور وہ اپنے ماں پیو کے گھر آ بھی جاتی ہے تو پھر کیا ہو گا۔ کیا وہ ویاہ شیاہ کرے گی تجھ سے۔"

ہادی نے ایک گہری سانس لی۔ "شیخو بھائی! سب کچھ ویاہ شیاہ ہی تو نہیں ہوتا۔ میں نے پہلے بھی آپ کو بتایا تھا حجاب کے سلسلے میں میرے دل پر بہت بھاری بوجھ ہے۔ میں اس کو ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔"

"یعنی عشق وشق کوئی نہیں ہے تجھے؟" شیخو بھائی نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔

"وہ تو جو ہے...... سو ہے۔ لیکن اس کے لیے ویاہ شیاہ اور شادی وادی ضروری نہیں ہوتی شیخو بھائی۔ پر آپ جیسے کھوچل سیٹھ کو یہ باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

شیخو بھائی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "آہو یار! اگر یہ گل سمجھ میں آتی ہوتی تو خود ہی آٹھ دس سطریں لکھ کر دس ہزار کا چیک وصول نہ کر لیتا۔"

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ نے لسی پی ہے۔ کیونکہ لسی پی کر ہی آپ ایسی باتیں کرتے ہیں۔" ہادی نے ہلکے پھلکے انداز میں تبصرہ کیا۔

"اچھا چل چھوڑ اس گل کو لیکن جو کچھ بھی کر رہا ہے ہاتھ پیر بچا کر کرنا۔ میں پھر کہہ رہا ہوں۔ یہ اٹلی ہے۔ ڈاکو راہزن لوگ بھی ہوتے ہیں یہاں۔ ہاشم ایک حد تک ہی تمہارا ساتھ دے سکتا ہے۔"

O.....❖.....O

دروازے میں آنے کے بعد حجاب کا ہاتھ نیلا ہو گیا تھا اور کچھ سوج بھی گیا تھا۔ لیکن جسمانی چوٹوں کے بجائے کہیں زیادہ تکلیف اس کے دل و دماغ میں تھی۔ وہ جو کچھ سن رہی تھی، جو کچھ کہہ رہی تھی وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ

اُڑتے اُڑتے سے فقرے اس کی سماعت میں گونجتے رہتے تھے جن میں جھوٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اور جو اس فیملی میں بہت سے لوگوں کی زبان پر تھے...... اس کی پرانی دوستی ہے ہادی سے، یہ انٹرنیٹ پر اس سے کئی کئی گھنٹے باتیں کرتی تھی۔ وہ اس سے ملنے ہی اٹلی آیا تھا۔ یہ اس کے ساتھ ہوٹلوں میں وقت گزارتی رہی ہے۔ حجاب کو لگتا تھا کہ اس کے کانوں میں دہکتے انگارے ٹھونسے جا رہے ہیں۔

اس کے اردگرد مناظر جیسے ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔ بس تقریباً بارہ فٹ ضرب چودہ فٹ کا ایک کمرہ، ایک اٹیچ باتھ روم، باتھ والی دیوار کے ساتھ ایک آف وائٹ الماری اور الماری کے ساتھ ڈبل بیڈ۔ خاکستری رنگ کا ایک قد آدم ریفریجریٹر اور شیشے کی ایک مستطیل میز۔ یہ چیزیں دیکھ دیکھ کر اب اسے ابکائی سی آنے لگی تھی۔ دیواریں اور ان کے رنگ کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ وہ اندھیرے سے گھبراتی تو بلب آن کر لیتی۔ بلب کی مدھم روشنی سے دم گھٹنے لگتا تو پھر اندھیرا کر لیتی۔ اس نے قید تنہائی کی اذیت کے بارے میں بہت سنا تھا۔ مگر اس کا تجربہ زندگی میں پہلی بار ہو رہا تھا۔ بے بسی کی انتہا کو چھو کر وہ سوچنے لگتی۔ کیا کوئی اس کے لیے کچھ کرے گا؟ کیا کوئی ایسی بات ہو جائے کہ جلال کے دل میں اس کے لیے اور اس کے بیمار والدین کے لیے رحم آ جائے۔ کبھی کبھی اس کے ذہن میں ہادی کا خیال آتا اور اس کے اندر غم و غصے کی لہر بلند ہوتی۔ دانستہ یا نادانستہ اس شخص نے بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا اس کی زندگی کو۔

رات بھر حجاب کے ہاتھ میں درد ہوتا رہا۔ صبح تک وہ زیادہ سوج گیا۔ حسب معمول نو بجے کے قریب دروازہ کھولا۔ چھ سات انچ کی درز پیدا ہوئی اور کلثوم نے سالن اور چائے پر مشتمل روکھا سوکھا ناشتہ اندر پہنچایا۔ حجاب کراہتے ہوئے بولی۔ ”کلثوم مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ کہیں ہڈی کو کچھ نہ ہو گیا ہو۔ پلیز جلال کو بلا دو۔ وہ دیکھیں“

”وہ چلے گئے ہیں۔“ وہ خشک لہجے میں بولی۔

اسی دوران میں حجاب کو کھانسی کی دور افتادہ آواز سنائی دی۔ یہ آواز کسی بالائی کمرے سے آئی تھی اور یقیناً جلال ہی کی تھی۔

وہ دروازے کے خلا سے منہ لگا کر پکارنے لگی۔ ”جلال...... جلال...... میری بات سن لیں۔“

اس کی آواز دور تک گونج رہی تھی۔ کلثوم نے جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ حجاب نے اپنا چہرہ بمشکل بچایا۔ دروازہ بند ہونے کے بعد بھی وہ پکارتی رہی اور دستک دیتی رہی۔ چند منٹ بعد دروازے سے باہر پھر آہٹیں ہوئیں۔ دروازہ کھلا اور دوسری طرف جلال کی صورت نظر آئی۔ اس بار وہ دروازہ پورا کھول کر اندر آ گیا۔ ”کیا قیامت مچا رکھی ہے تم نے۔“ اس نے پوچھا۔

وہ اپنے مضروب ہاتھ کو تھامتے ہوئے بولی۔ ”جلال! مجھے بہت درد ہو رہا ہے۔ رات بھر ہوتا رہا ہے۔ کہیں کوئی فریکچر نہ ہو گیا ہو۔“

اس نے ہاتھ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ حجاب کو انگلیاں ہلانے کا کہا۔ انگلیاں حرکت کر رہی تھیں۔ اس نے ہتھیلی پر تھوڑا سا دباؤ ڈال کر چیک کیا۔ وہ بری طرح کراہنے لگی۔ ”کچھ نہیں ہوا۔“ وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ ”بس ذرا دباؤ آئی ہے۔“

کلثوم عقب میں کھڑی تھی۔ جلال کے کہنے پر وہ الماری میں سے فرسٹ ایڈ کا باکس نکال لائی۔ جلال نے اس کے ہاتھ پر آیوڈیکس ٹائپ کی کوئی آئنٹمنٹ لگائی اور روئی رکھ کر پٹی باندھ دی۔ اس عمل کے دوران میں وہ درد سے کراہتی رہی مگر جلال جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ ”اب اسے لٹکا کر نہ رکھنا۔“ وہ بولا۔

”پورے بازو میں درد ہو رہا ہے۔“ وہ سسکی۔

اس نے باکس میں سے ڈیکلا رون کا چین کلر انجکشن نکالا اور حجاب کے بازو میں ٹھونک دیا۔

کلثوم باہر جا چکی تھی۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ”جلال! پلیز میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی، نہ ہی میں نے پہلے کیا ہے۔ شریفاں والا فون میں نے صرف اس لیے اپنے پاس رکھا تھا کہ...... کہ......“

”اس پر اس شاعر صاحب کی کال آئے گی۔“ وہ بات کاٹ کر پھنکارا۔

”نہیں جلال...... نہیں۔ وہ بلکہ مجھے ڈر تھا کہ ایسا ہوگا۔ اس کے پاس شریفاں کا نمبر تھا۔ میں قسم کھاتی ہوں جلال......“ اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ کوشش کے باوجود آگے نہ بول سکی۔ اور گھٹنوں میں سر دے کر ہچکیوں سے رونے لگی۔ وہ بستر پر بیٹھی تھی۔

وہ خاموش کھڑا رہا۔ اس نے التجا آمیز انداز میں اس کا کندھا تھامنا چاہا۔ اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”منہ سے بولو، کیا چاہتی ہو تم؟“

وہ اپنے اندر کی ساری لجاجت اپنے لفظوں میں سمیٹ کر بولی۔ ”جلال! آپ کو پتا ہے مجھے بند جگہوں سے کتنا ڈر آتا ہے۔ میں یہاں گھٹ گھٹ کر مر رہی ہوں۔ م...... مجھے کہیں بھی لے جائیں لیکن اس کمرے سے اب نکال لیں۔“

”یعنی میں ظالم ہوں۔ میں نے تمہیں بے گناہ یہاں بند کیا ہوا ہے۔ حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے تمہیں۔ ٹھیک ہے۔ مجھے بھی اب احساس ہو رہا ہے کہ شاید میں زیادتی کر رہا ہوں تم سے۔ مجھے اس کی تلافی کرنی چاہیے۔ بلکہ معافی مانگ کر تلافی کرنی چاہیے۔ بتاؤ کس طرح معافی مانگوں تم سے...... بتاؤ۔“

”آپ ایسا مت کہیں۔ آپ شوہر ہیں میرے...... میرے مجازی خدا کی حیثیت رکھتے ہیں۔“

”مت استعمال کرو ایسے الفاظ۔ یہ مقدس لفظ تمہارے منہ میں آ کر بدچلنی کا طعنہ بن جاتے ہیں۔ میں تمہارے لیے جو کر سکتا ہوں میں وہ کر دیتا ہوں۔ تمہیں اس ظلم سے نجات دے دیتا ہوں۔ اگر جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ دروازہ کھلا ہے تمہارے سامنے۔“

حجاب حیرت زدہ سی کھڑی ہو گئی۔ وہ جلال کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ ہو۔ وہ اس کا لب و لہجہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سسک کر بولی۔ ”میں بڑی سے بڑی قسم کھا سکتی ہوں جلال! میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔ اگر کروں تو بے شک میری جان لے لیجئے گا۔ ٹکڑے کر دیجئے گا میرے۔“

”وہ تو بعد کی بات ہے۔ لیکن میری ایک بات ابھی اچھی طرح سن لو۔ جس وقت تم اس دروازے سے باہر نکلو گی۔ میں اسی وقت تمہاری طلاق کے کاغذوں پر دستخط کر دوں گا۔ اسی وقت بالکل آزاد کر دوں گا تمہیں۔“

یکا یک حجاب کے سینے میں امید کے سارے چراغ تیز ہوا کے جھونکے سے بجھ گئے۔ ایک سرد لہر ریڑھ کی ہڈی سے اُٹھی اور پورے جسم میں پھیل گئی۔ طلاق لینے اور دینے والی بات ان کے درمیان پہلے بھی ہو چکی تھی اور جس پس منظر میں ہوئی تھی وہ بھی حجاب کو معلوم تھا۔ بات اب طلاق کی نہیں تھی۔ بات تو اُس معاشی شکنجے کی تھی جو جلال نے اُس پر کس رکھا تھا اور اُس کے والدین پر بھی۔ وہ طلاق کی بات کر رہا تھا تو ساتھ ہی اُس "معاشی شکنجے" کو بے دریغ کسنے کی بات بھی کر رہا تھا جو اُس کے والدین کی سانس روک سکتا تھا۔ وہی بھاری بھرکم قرضہ جسے جلال ایک مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اس قرضے کے ضمن میں اس کے بوڑھے والد اور جواں سال بھائی کو عدالتوں میں گھسیٹ سکتا تھا اور وہ اس مصیبت کو جھیلنے کی سکت ہرگز نہیں رکھتے تھے۔

"جاؤ...... اب جاتی کیوں نہیں۔ کیا سوچ رہی ہو؟" جلال کی پھنکار اس کے کانوں میں پہنچی۔

"پلیز جلال!" اس نے روتے ہوئے دوبارہ جلال کا توانا کندھا تھامنا چاہا۔ اس نے دھکا دے کر اسے پرے پھینک دیا۔ دانت پیس کر بولا۔ "میں جانتا ہوں کیوں جانا چاہتی ہے تو باہر۔ کیوں کھلی ہوا میں سانس لینے کے چسکے پڑے ہوئے ہیں تجھے۔ سب جانتا ہوں، وہ حرامزادہ ابھی یہیں ہے۔ انہی گلیوں میں گھوم رہا ہے آوارہ کتے کی طرح لیکن...... لیکن اب میں تجھے منع نہیں کروں گا۔ جانا چاہتی ہے تو چلی جا۔ دروازہ پورا کھلا ہے تیرے سامنے۔ چلی جا اگر جانا ہے تو۔"

وہ بستر پر اوندھی پڑی ہچکیوں سے روتی رہی۔ اس کا جسم بالکل بے جان ہو گیا تھا۔ دروازے کی طرف جانا تو کجا دروازے کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی اس میں نہیں رہی تھی۔ اپنی ماں کا بیمار لاچار چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہا تھا۔ جلال کچھ دیر ٹانگیں چوڑی کر کے کھڑا رہا اور اس کے ردعمل کا انتظار کرتا رہا۔ "اب جاتی کیوں نہیں؟" وہ چنگھاڑا۔

ایک لمحے کے لیے لگا کہ وہ پھر اس پر پل پڑے گا اور اس کو ادھیڑ کر رکھ دے گا لیکن پھر شاید اسے اس کے زخمی ہاتھ کا خیال آ گیا۔ کوئی باریک سا فریکچر ہڈی ٹوٹنے کا بہانہ بھی بن سکتا تھا۔ اس نے اس بیڈ کو زور دار لات رسید کی جس پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ پھر کسی بگولے کی طرح پھنکارتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے اسے اور اس کے والدین کو بے نقط سنائیں تھیں۔ چند سیکنڈ بعد کلثوم نے غصیلے انداز میں دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ اور حسبِ معمول لاک لگا دیا۔ ایک دم حجاب کا سارا جسم سرد ہو گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی ٹھنڈی ٹھار قبر میں اترتی جا رہی ہے۔ اپنی امی کا چہرہ اس کے تصور میں آیا، پھر ابو کا، پھر بھائی فیصل کا۔ کہاں ہیں وہ سب؟ کیا وہ اسے دوبارہ زندہ دیکھ سکیں گے؟ اس نے سوچا۔

O......✥......O

ڈاکٹر عطا، ہادی کے ساتھ پورا تعاون کر رہے تھے۔ انہیں بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ حجاب کو جلال کے چنگل سے نکالنے کا واحد راستہ یہی ہے کہ سب سے پہلے اس کا قرض چکایا جائے اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر جلال کو "بلیک میلنگ" کی بہترین پوزیشن میں رہنا تھا اور وہ اس پوزیشن کو کامیابی سے استعمال بھی کر رہا تھا۔

ہادی نے سردھڑ کی بازی لگا رکھی تھی۔ اسکیم میں اس کا پلاٹ آناً فاناً ہی فروخت ہو گیا تھا اور وہ بھی کیش پر۔ یہ پلاٹ 30 لاکھ میں بکا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ عطا صاحب کو ٹوٹل 80 کے بجائے تقریباً 90 لاکھ فراہم کر سکتا تھا۔ ہادی سب کچھ ٹھیک ہو جاتا تو صرف ایک کروڑ دس پندرہ لاکھ کی کمی رہ جاتی تھی۔ یعنی تقریباً ایک لاکھ سات ہزار یورو۔ ہادی کو امید تھی کہ یہ کام بھی کسی نہ کسی طرح ہو جائے گا۔ اس کے سینے میں دبا دبا جوش لہریں لے رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ حجاب کی خوبصورت کلائیوں میں پڑی ہوئی زنجیروں کو ٹوٹ کر نیچے گرتے دیکھ رہا ہے۔ ان زنجیروں کے گرتے ہی اس کی بے مثال پیشانی کا چاند روشن ہونے لگا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا سونا چمکنے لگا ہے۔ سب ہو جاتا تو یہ جلال کی اس جارحیت کا مؤثر جواب تھا جو اس نے ہادی کے خلاف اسلامک سینٹر کے ضمن میں دکھائی تھی۔

ایک دو دن یہ کیفیت رہی۔ لیکن پھر اچانک صورتِ حال تبدیل ہونے لگی۔ ہادی اور ڈاکٹر عطا نے جو بھی جمع تفریق کی تھی اس میں رخنے پڑنے لگے۔ سب سے پہلی نا امیدی تو حجاب کے ابو کی طرف سے ہی سامنے آئی۔ فیصل نے ڈاکٹر عطا کو بتایا کہ اس وقت وہ یکسر تہی دست ہیں۔ اس تگ و دو میں لگے ہوئے ہیں کہ اگر ایک دو دن میں حجاب کی امی کو ہسپتال سے فارغ کر دیا جاتا ہے تو ہسپتال کا دو ڈھائی ہزار یورو کا بل ادا کیا جا سکے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ فی الحال قرض کی ادائیگی میں مزید کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے۔ دوسری مایوس کن خبر شیخو صاحب کی طرف سے تھی۔

ہادی ہوٹل میں تھا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھولے بیٹھا تھا اور روم کی رواں دواں ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ اس ٹریفک میں سکوٹرز کی بھرمار تھی۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے سکوٹر نمایاں نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں بغیر چھت کے کاریں بھی تھیں۔ وینس میں ایسی ہی ایک اوپن کار کے پس منظر میں ہادی نے حجاب کو پہلی بار دیکھا تھا۔ وینس کی اسی نیم تاریک سڑک کا وہ منظر جیسے ہادی کے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا تھا۔

اچانک اس کے فون کی بیل ہوئی۔ دوسری طرف لاہور سے شیخو صاحب تھے۔ پژمردہ آواز میں بولے۔ "یار ہادی۔ کل وہ گجرات والا پلاٹ دیکھ لیا ہے میں نے۔ وہ تو بالکل پیسے روہڑنے (بہانے) والی گل ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یار! وہ تو کوئی بارہ فٹ ڈونگی زمین ہے۔ کئی لکھ کی تو بھرتی ہی پڑ جانی ہے اس میں۔ اور اب ایک مسئلہ اور بھی ہو گیا ہے اس کے ساتھ۔ وہاں سے سڑک نکلنے والی ہے۔ اگر واقعی سڑک نکل گئی تو ادھے سے زیادہ پلاٹ تو سڑک میں ہی آ جانا ہے۔"

"شیخو بھائی! اگر سڑک نکلی تو حکومت بھی تو کرے گا نا اور پھر....."

"نئیں یار!" شیخو بھائی نے بات کاٹی۔ "میرا دل بالکل نئیں مان رہا اس سودے پر۔ اگر تو نے ویسے ہی چودہ وی لکھ مزید ایڈوانس میں لینے ہیں تو میں کوشش کر کے بھیج دیتا ہوں۔"

"پندرہ وی سے کیا بنے گا شیخو بھائی؟"

"تو پھر یار! تھوڑا سا ویٹ کر لے۔ اس ویلے تو بالکل نپٹ ہو گیا ہوں میں۔ سچی کہتا ہوں۔ تجھ سے کبھی جھوٹ نئیں بولا میں نے۔" شیخو بھائی واقعی پریشان لگ رہے تھے۔

شیخو بھائی سے بات کرنے کے بعد ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ خوشی کی وہ لہر جو پچھلے دو تین روز سے اس کے جسم میں دوڑ رہی تھی ایک مایوس نقاہت میں بدلنے لگی۔ زندگی میں پہلی دفعہ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کبھی کبھی معاشی معاملات پیچیدہ اور ناقابلِ حل ہو جاتے ہیں۔ اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جاتا تو اب بھی مطلوبہ ٹارگٹ تک پہنچنے کے لیے قریباً پونے دو کروڑ روپے کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت فوری طور پر پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

اسی دوران میں ہادی کے فون کی بیل ہوئی۔ یہ بیل اس کے پہلے والے پرانے نمبر پر ہوئی تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی پی سی او سے کال کی جا رہی ہے۔ ہادی نے کال ریسیو کی مگر احتیاطاً بولا کچھ نہیں۔ دوسری طرف بھی خاموشی رہی۔ بس بھاری سانسوں کی آواز آ رہی تھی اور ٹریفک کا مدھم شور تھا۔ تب شریفاں کی ڈری ڈری آواز ابھری۔

"ہیلو۔"

"ہیلو شریفاں!" ہادی نے کہا۔

"خیریت ہے تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟"

"خیریت کتھے ہے صیب جی! آپ نے خیریت رہنے ہی نئیں دی ہے۔ صیب جی! برا نا منانا آپ نے چنگا نئیں کیتا ہے باجی کے ساتھ۔ وہ تو پہلے ہی دکھوں کی ماری تھی۔ آپ کی وجہ سے وہ بالکل ہی رل گئی ہے۔ میں کیا بتاؤں آپ کو اس گھر میں اس دے نال کیا ہو رہا ہے۔ میتوں نئیں لگتا کہ وہ اس گھر وچوں زندہ نکلے گی۔" شریفاں کی آواز بھرا گئی۔ وہ شاید رو پڑی تھی۔

ہادی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ "اب کیا ہوا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"پرسوں مجھ کو ڈرائیور عثمان نے تھوڑا سا بتایا تھا وہ کہندا ہے کہ کدی کدی رات کو باجی کی آوازیں آتی رہتی ہے اور کلثوم یا وڈے بھائی جان کو بلاتی ہے۔ کبھی آلے دوالے سے دروازہ کھڑکانے کی آوازیں بھی بار بار آتی ہیں۔ صاحب پتا چلتا ہے کہ وہ کرماں ماری کسی وڈی مصیبت میں ہے۔ میں نے بہت پچھا ہے پر عثمان نے گل کھل کر نہیں بتائی ہے۔" شریفاں کی آواز پھر بھرا گئی۔

"تم آج کل کہاں ہو؟"

"میں فیروزپور گھر وچ ہی ہوں۔ آپا خانم اور ارم بی بی کو بڑا غصہ ہے مجھ پر۔ مجھے تو لگتا ہے کہ یہ لوگ مجھے جلدی ہی پاکستان واپس بھیج دیں گے۔" گلوگیر آواز میں بولی۔ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ "ابھی کوئی دو گھنٹے پہلے میں نے اوپر والے کمرے میں وڈے بھائی جان (جلال) کو باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ درس والے گھر سے اس خبیث کلثوم کا فون تھا۔ وہ کسی کی بے ہوشی کی گل کر رہی تھی۔ میں نے ذرا کن لگا کر سنا تو پتا چلا کہ باجی حجاب کے بے ہوش ہونے کی گل ہے۔ اس کے بعد وڈے بھائی جان فٹافٹ نکلے گئے اور عثمان کو کہیں بھیجا۔ شاید درس والے گھر ہی بھیجا ہے۔ مجھے پکا یقین ہے۔ باجی وچاری ڈھاڈی مصیبت میں ہے۔" شریفاں کا گلا رندھ گیا اور وہ ایک بار پھر چپ ہو گئی۔ اس کے سسکنے کی آواز ہادی نے صاف سنی۔

"شریفاں! تمہارا کیا مشورہ ہے۔ مجھ کو کیا کرنا چاہیے؟"

"میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتی ہوں جی! میری کیا حیثیت ہے۔ اگر آپ ہور کچھ نئیں کر سکتے تو کم از کم باجی کے گھر والوں تک ہی کسی طریقے سے یہ گل پہنچا دیں۔ ان کے خاندان میں بھی سیانے لوگ ہوں گے....."

"اچھا شریفاں! تم رونا بند کرو۔ تم نے بڑا اچھا کیا ہے کہ مجھے فون کیا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں کروں گا۔ اور مجھے امید ہے کہ کچھ بہتر ہی ہو گا۔"

"بس جی! مجھ وچاری کا نام کہیں نئیں لینا آپ نے۔ ورنہ بے موت مر جاؤں گی میں۔ اب بھی آپ کو پتا نئیں کہ کتنی مشکل سے یہ فون کر رہی ہوں۔"

"تم بے فکر رہو شریفاں! کوئی حرف نہیں آئے گا تم پر۔" ہادی نے تسلی تشفی کی دو چار باتیں کیں اور فون بند کر دیا۔

اس کا دماغ کھول اٹھا تھا۔ جو کچھ ہادی اور ڈاکٹر عطا نے سوچا تھا اس کو عملی شکل دینے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا۔ ابھی کافی بڑی رقم کم پڑ رہی تھی۔ دوسری طرف یوں لگ رہا تھا کہ حجاب کے پاس واقعی ٹائم کم رہ گیا ہے۔ وہ شدید جسمانی اور ذہنی اذیت جھیل رہی تھی۔ جلال نامی شخص اس سے اگلے پچھلے بدلے چکانے کے موڈ میں تھا اور اپنے جنون میں اس کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔

ہادی نے اسی وقت کمرہ بند کیا اور ٹیکسی پکڑ کر ڈاکٹر عطا کے پاس جا پہنچا۔ وہ گھر ہی میں تھے اور کھانے کے بعد چہل قدمی کر رہے تھے۔ ہادی نے پہلے تو انہیں گجرات والے پلاٹ کے بارے میں آگاہ کیا اور بتایا کہ اس کا فوری طور پر بکنا مشکل نظر آ رہا ہے۔ تب اس نے شریفاں کا نام لیے بغیر درس والے گھر میں حجاب کی حالت زار سے عطا صاحب کو آگاہ کیا۔

وہ بھی ایک دم گم صم نظر آنے لگے۔ ان کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ انکل فیاض کے گھرانے سے ان کے روابط بہت گہرے تھے کہ وہ ان کے دُکھ کو اپنے دُکھ کی طرح سمجھتے تھے اور محسوس کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے ہادی کو اندازہ ہوا کہ جو کچھ سامنے آ رہا تھا اس کے اندیشے عطا صاحب کے ذہن میں پہلے سے موجود تھے۔

ہادی اب راست اقدام پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ سارے اندیشے ایک طرف رکھے۔ ڈپٹی انسپکٹر ہاشم ایرک کو اپنے ساتھ لے اور دندناتا ہوا درس والے گھر میں گھس جائے۔ حجاب کو اس پنجرے سے نکال لائے جہاں وہ پھڑپھڑا رہی تھی اور زخمی ہو رہی تھی۔

اس نے ڈاکٹر عطا سے کہا۔ "عطا صاحب! اگر اس گھر میں حجاب واقعی حبس بے جا میں ہیں اور ان پر تشدد ہو رہا ہے تو ہم پولیس کی مدد لے سکتے ہیں۔"

"لیکن اس کے لیے تو باقاعدہ پولیس میں رپورٹ کرنا پڑے گی اور باقی سارا پروسیجر فالو کرنا ہوگا۔ کیا فیاض اور فیصل وغیرہ اس حد تک جانا چاہتے ہیں یا نہیں؟"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ انہیں اس میں کیا اعتراض ہوگا۔"

"سب سے پہلے تو یہی بدنامی والی بات ہے۔ ایک دم ہر طرف چرچا ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک بار قانونی چکر شروع ہو جائے تو آسانی سے رُکتا نہیں۔ بہت کچھ سہنا اور جھیلنا پڑتا ہے۔ خاص طور سے فیملی کو۔"

"لیکن وہ اب بھی تو جھیل رہی ہے عطا صاحب! بلکہ جھیلتے جھیلتے اس کی جان بھی جا سکتی ہے۔ پہلے بھی فیروز الدین کا کیا بگڑا تھا جو اب جلال الدین کا بگڑ جائے گا۔ ویسے...... میرے ذہن میں ایک اور بات ہے۔" ہادی نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر عطا سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"میں جن کے لیے لکھ رہا ہوں۔ ان کے ایک جاننے والے ہیں یہاں روم کے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی انسپکٹر ہیں۔ کیوں نہ ان سے مشورہ کر لیا جائے۔ ان سے آف دی ریکارڈ ہر بات کی جا سکتی ہے اور وہ طریقہ کار سے ہٹ کر بھی ہمارے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔"

"اگر بھروسے کا بندہ ہے تو پھر بات کر کے دیکھ لو۔"

ہادی نے ہاشم ایرک کا نمبر ملایا۔ کال فوراً ریسیو ہوگئی۔ ڈاکٹر عطا کمرے سے باہر چلے گئے تاکہ ہادی تسلی سے بات کر سکے۔ ہادی نے سب سے پہلے پوچھا کہ کیا اس طرح فون پر ایک اہم بات کرنا مناسب رہے گی؟

ہاشم ایرک نے کہا۔ "ہاں...... یہ بالکل محفوظ ہے۔ آپ کھل کر بات کریں۔"

اگلے چار پانچ منٹ میں ہادی نے مختصر الفاظ میں حجاب اور جلال والی ساری صورتِ حال ہاشم کے سامنے بیان کر دی اور یہ بھی بتایا کہ حجاب کی والدہ سخت بیمار ہیں۔ جس کی وجہ سے حجاب بہت تکلیف میں ہونے کے باوجود جلال سے کسی طرح کا Clash نہیں چاہتی اور مسلسل اس کا جبر سہہ رہی ہے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" ہاشم نے انگلش میں پوچھا۔

"کیا ہم پروسیجر کو فالو کیے بغیر جلال الدین پر کسی طرح کا دباؤ ڈال سکتے ہیں؟ اور اسے آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ حجاب کو اس طرح حبس بے جا میں نہ رکھے؟"

ہاشم ایرک نے ایک طویل سانس لی اور امریکن اسٹائل میں بولا۔ "میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ آپ قانون کا راستہ اس لیے اختیار نہیں کر رہے کہ آپ کو ڈر ہے حجاب آپ لوگوں کے حق میں بیان نہیں دے گی۔"

"جی ہاں...... اور اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے والدین کو ایک بڑی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ پھر مزید بدنامی کا رسک بھی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ طریقہ کار سے ہٹ کر بھی حجاب کی بہتری کے لیے کچھ کیا جا سکتا ہے۔ مگر جس شخص کا آپ نام لے رہے ہیں۔ اس کے خلاف کچھ کرنے سے پہلے آپ کو دس دفعہ سوچنا پڑے گا۔ یہ وہی جلال الدین ہے نا جو جلال شاپنگ سینٹر کا اونر ہے۔"

"جی ہاں......"

"یہ بڑا بارسوخ شخص ہے مسٹر ہادی! آپ اس کو کبھی بھی آسان نہیں لے سکتے۔ میرا آفیسر "ٹاپ انسپکٹر" ڈلوڈ بون اس کا گہرا دوست ہے اور اس کے علاوہ بھی روم کی پولیس میں اس کے کافی لنکس ہیں بلکہ معاف کرنا میں آپ کو مایوس کرنا نہیں چاہتا۔ آپ قانونی طریقہ اختیار کر کے بھی اتنی جلدی خاتون کو جلال الدین کی کسٹڈی سے نہیں نکال سکتے۔ وہ اس کی بھی سخت مزاحمت کرے گا اور وہ کر سکتا ہے۔"

ہاشم ایک دبنگ آفیسر تھا لیکن آج اس کی باتیں ہادی کا حوصلہ توڑ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی جلال کا قد کاٹھ ہادی کو کچھ اور بڑا لگنے لگا تھا۔

ہاشم کی باتیں سن کر وہ سخت بے چین ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بے بسی سے سب کچھ دیکھتے رہیں گے۔ ان کوششوں میں لگے رہیں گے کہ حجاب کے گھر والوں کو قرضے کے بوجھ سے نکالا جا سکے اور اس دوران میں حجاب کے ساتھ کچھ بھی ہو جائے گا یا وہ اپنے ساتھ کچھ بھی کرا لے گی۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا...... ایسا نہیں ہوگا۔" اس کے دل میں سے کسی نے پکار کر کہا۔ "میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ وہ میری رگ جان میں بسنے لگی ہے۔ مجھے اپنے بدن سے اور اپنے سانسوں سے اس کی خوشبو آتی ہے۔ میں صدیوں سے ڈھونڈ رہا ہوں اسے۔ اس کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ اسے یوں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے کانوں میں صدا گونجنے لگی۔ لگن لاگی...... موہے لگن لاگی۔"

اور وہ سوچنے لگا۔ لگن یعنی محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ اس نے وہیں چمڑے کے اٹالین صوفے پر بیٹھے بیٹھے اور سامنے دیوار پر آویزاں کسی قدیم فرنچ ڈاکٹر کی تصویر دیکھتے دیکھتے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ اہم اور فوری۔ اس کے پاس ترپ کا ایک پتا تھا اور یہ پتا ارم تھی۔ مسز ارم جلال۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ حجاب کو جلال کے چنگل سے نکالنے کے لیے یہ پتا استعمال کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

O.....❖.....O

ارم اپنے کمرے میں لیٹی تھی۔ آج کل سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق جا رہا تھا۔ حجاب زیر عتاب تھی۔ آغا خانم اس کے قصیدے پڑھ رہی تھیں۔ جلال دن بہ دن اس کی مٹھی میں آتا جا رہا تھا اور شریفاں کو وہ جی بھر کر ذلیل کر رہی تھی۔ اس کے باوجود دل میں ایک گہرا کانٹا چبھا ہوا تھا۔ یہ کانٹا سوتے جاگتے اس کی اپنی موجودگی کا احساس دلاتا تھا۔ یہ ہادی سے ہونے والی ملاقات کا کانٹا تھا۔ ہادی کا اگلا فون کب آئے گا اور وہ اس سے کیا چاہے گا۔ وہ کچھ نہ جانتی تھی۔ مگر اتنا اسے پتا تھا، یہ فون آئے گا ضرور اور اس کے چین سکون کو ایک بار تو غارت کر دے گا۔

اب کبھی کبھی اسے شک ہونے لگتا تھا کہ کہیں اس صورت حال میں گلزاری کا ہاتھ تو نہیں۔ کیا پتا اس نے کسی ڈبل ایجنٹ کا سا کردار ادا کیا ہو اور کسی چھوٹے لالچ میں ہادی کا آلہ کار بنا ہو۔ بہر حال ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی۔

چند روز پہلے جو فون نمبر اس نے ہادی کو دیا تھا وہ اکثر بند رہتا تھا مگر وہ کبھی کبھی اس پر ایس ایم ایس چیک کرتی تھی آج اس نے ایس ایم ایس چیک کیے تو بُری طرح چونک گئی۔ ہادی کا پیغام موجود تھا۔ "مجھے کال کرو جلدی۔"

ارم نے پریشان ہو کر گھڑی دیکھی۔ رات کے بارہ بجے تھے۔ بیڈ روم میں جلال کے خراٹوں کی مدھم گونج تھی۔ اس نے بہ آہستگی اس کا وزنی ہاتھ اپنے پیٹ پر سے ہٹایا اور اپنے نہایت مختصر لباس پر نائٹی درست کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی کچن کا دروازہ بند کر کے اس نے یونہی فریج کھول لیا اور ہادی کو کال کی۔ کال کرتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسینہ تھا۔

"ہیلو....." جلد ہی ہادی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

"کیا بات ہے؟" ارم نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ انداز سرگوشی کا تھا۔

"کل دوپہر ساڑھے بارہ بجے سے ایک بجے کے درمیان شانزا والے کیفے میں پہنچ جاؤ۔ ضروری بات کرنی ہے۔" ہادی کا لہجہ حکمیہ اور حتمی تھا۔

"لیکن....."

"لیکن کی کوئی گنجائش نہیں۔" وہ پھنکارا۔ "ساڑھے بارہ اور ایک کے درمیان اور پہلے کی طرح تمہیں بالکل اکیلے ہونا چاہیے۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

ارم کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ کبھی خوف کی لہر سینے سے اُٹھتی تھی کبھی طیش کی۔ کسی وقت تو اس کا دل چاہتا تھا کہ اس بلیک میلنگ کے سامنے سر جھکانے سے بالکل انکار کر دے۔ جلال کے سامنے اپنے ماضی کی اس غلطی کا اعتراف کر لے۔ اس کے لیے کوئی قابل قبول جواز دینے کی کوشش کرے۔ مثلاً یہ کہ کسی وقت اسے بے ہوشی کی حالت میں زیادتی کا نشانہ بنایا گیا یا اس طرح کی کوئی اور بات۔ مگر جب وہ ایسی باتوں کے بارے میں سوچتی تھی تو فوراً جلال کے کٹر خیالات اس کے ذہن میں آ جاتے تھے۔ کچھ معاملوں میں وہ انتہائی تنگ نظر تھا۔ اس کی اسی تنگ نظری سے تو فائدہ اُٹھا کر ارم نے اسے آناً فاناً اپنانے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ ارم کو پتا تھا کہ اگر اس نے جلال کے

سامنے کسی طرح کا کوئی اعتراف کر لیا تو پھر ایک پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ اپنے اطالوی دوست اسٹیل کے ساتھ اس کا جو معاملہ چلا تھا وہ سارے کا سارا آشکار ہو گا۔ اور بہت سے ڈھکے چھپے گوشے بھی عیاں ہوں گے۔ کوئی ایک سال پہلے اسٹیل امریکہ کی ریاست فلوریڈا میں ایک ٹریفک حادثے میں زخمی ہوا اور پھر چل بسا تھا لیکن وہ جو کہانی اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا وہ تو اپنی جگہ موجود تھی۔

وہ دوبارہ بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ یہ بستر بڑی کوشش سے حاصل کیا تھا اس نے لیکن اب یہ کانٹوں کا بستر بنا ہوا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ وہ اس سے کیا چاہ رہا ہے۔ اس کے دل میں یقیناً نفرت بھری ہوئی تھی۔ کہیں وہ اسے ٹریپ کر کے کہیں اور لے جانے کی کوشش تو نہیں کرے گا۔ اس پر ذہنی اور جسمانی تشدد کرنے کے لیے؟ لیکن وہ اس ٹائپ کا لگتا نہیں تھا اور شاید ایک پرائے دیس میں وہ اس طرح کا حوصلہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تو کیا وہ اس سے کسی بڑی رقم کا مطالبہ کرے گا۔ دو تین ہزار یورو کی بات تو اور تھی لیکن کوئی بھاری رقم وہ اسے دینے کے قابل نہیں تھی۔ ابھی گھر کے مالی معاملات پر اسے کوئی کنٹرول حاصل نہیں تھا۔ اور شاید ہوتا بھی نہیں تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ جلال بہت مالدار ہونے کے باوجود بنیا ذہنیت رکھتا ہے۔ اس کی کفایت شعاری کبھی کبھی کنجوسی کی حدوں سے بھی آگے نکل جاتی تھی۔ گھر میں کوئی فالتو لائٹ آن ہونے کی صورت میں یا ٹونٹی کھلی ہونے کی صورت میں بھی وہ قیامت برپا کر سکتا تھا۔ اس نے نکاح پر جو جیولری وغیرہ ارم کو دی تھی وہ اس کی نظر اور تحویل میں رہتی تھی۔ غرضیکہ وہ مرضی سے لاکھوں خرچ تو کر دیتا تھا مگر مرضی کے بغیر ایک روپے کا اِدھر اُدھر ہونا بھی اسے قبول نہیں تھا۔ وہ سوچتی رہی اور اُلجھتی رہی۔

O.....❖.....O

"میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔" ہادی نے پُرطیش لہجے میں کہا۔ "بات بالکل کلیئر ہے۔ تم کل دوپہر تک یہ کام کرو گی۔ یا پھر میں وہ سب کچھ کروں گا جو کر سکتا ہوں۔ کوئی تیسرا آپشن ہے ہی نہیں۔ تمہارے لیے نہ میرے لیے۔"

"لیکن..... مجھے نہیں لگتا کہ وہ میرے ساتھ چل پڑے گی۔ وہ کوئی نہ کوئی نکتہ اُٹھائے گی۔ میں جانتی ہوں اسے۔" ارم تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"کوئی نکتہ نہیں اُٹھائیں گی وہ۔ وہ دو ہفتے سے بند ہیں وہاں۔ باہر نکلنے کے لیے رو چلا رہی ہیں۔ سورج کی روشنی کو ترسی ہوئی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بیمار ہیں۔ تم نے ان کی بیماری کو ہی بہانہ بنانا ہے۔ جب تم ہمدردی کے دو بول بولو گی اور کہو گی کہ تم انہیں ڈاکٹر کو دکھانا چاہتی ہو تو کوئی وجہ ہی نہیں کہ وہ نہ چل پڑیں۔"

"وہ کہے گی کہ جلال سے میری بات کراؤ فون پر۔"

"تم کہنا کہ مجھے جلال ہی نے بھیجا ہے۔ ابھی اس کا موڈ اتنا اچھا نہیں کہ فون پر بات کر سکے۔"

"مجھے..... ڈر لگ رہا ہے۔" وہ ماتھے پر تیوری ڈال کر بولی۔

"تم تو اب ملکہ عالیہ ہو۔ تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بادشاہ سلامت دو روز کے لیے راجدھانی سے باہر ہیں۔ ملازم اور گارڈز وغیرہ میں اتنی جرأت نہیں کہ تمہیں روک سکیں۔ تم جتنی آسانی سے اندر جاؤ گی اتنی ہی

آسانی سے حجاب کو لے کر باہر آ جاؤ گی۔"

"اور پھر بعد میں کیا ہو گا؟" ارم نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

"بعد میں بھی کچھ نہیں ہو گا۔ تم جلال سے کہو گی کہ حجاب کی بے ہوشی کا سن کر تمہارے دل میں ہمدردی پیدا ہوئی۔ تم درس والے گھر میں پہنچیں۔ اس کی حالت زار دیکھ کر تم نے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا فیصلہ کیا۔ راستے میں ایک ٹریفک جام پر حجاب نے اچانک کار کا دروازہ کھولا اور بھیڑ میں گم ہو گئی۔

"تم...... کہاں لے کر جاؤ گے حجاب کو؟"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔ میرا معاملہ ہے۔ ہاں میں اپنا یہ وعدہ پھر دہراتا ہوں کہ جیسے ہی میں نے خود کو اور حجاب کو محفوظ سمجھا جلال کی پہنچ سے دور ہو گیا۔ میرا اور تمہارا جھگڑا بالکل ختم ہو جائے گا۔ میں تمہارے خلاف سارے ثبوت ختم کر دوں گا اور میری طرف سے تمہیں یہ گارنٹی ہو گی کہ اس معاملے کی وجہ سے تمہیں میری طرف سے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

"تمہاری طرف سے نہ ہو گی لیکن اگر کسی اور کی طرف سے ہو گئی تو پھر؟" ارم نے ٹشو کے ساتھ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے میرا کوئی ساتھی جس نے ثبوت حاصل کرنے میں میری مدد کی ہے؟"

"میرا یہی مطلب ہے۔" ارم نے کہا۔

"ایسا کوئی چکر نہیں ہے اور اگر تمہیں یہ غلط فہمی ہے کہ ایسا ہے تو اس حوالے سے بھی میری چودری کی گارنٹی ہے۔"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور خوامخواہ سکارف کو درست کرنے لگی۔ اس چھوٹے سے کیفے میں ایک اچھا ماحول میں مگن تھا۔ کسی طربیہ اطالوی گیت کی دھن، تمباکو اور کافی کی خوشبو کے ساتھ گڈمڈ ہو رہی تھی۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ کہنا آسان لیکن کرنا اتنا آسان نہیں۔ سب سے پہلے تو جلال یہی پوچھیں گے کہ ان کی اجازت کے بغیر میں درس والے گھر میں کیوں گئی۔ اور اگر گئی ہی تھی اور ڈاکٹر کی طرف جانے کا پروگرام بھی بن گیا تھا تو پھر میں نے اپنے ساتھ کوئی گارڈ کیوں نہ لیا جبکہ مجھے سارے حالات کا پتا بھی تھا۔ وہ تم سب کو پتا ہی ہے کہ وہ کتنے شکی ہیں۔"

"وہ شکی نہ ہوتا تو تمہارے ستارے اتنی جلدی عروج پر کیسے پہنچتے۔ اب ان ستاروں کو عروج پر رکھنے کے لیے تمہیں تھوڑا بہت رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ غور کرو تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ تمہاری جان بڑے سستے میں چھوٹ رہی ہے۔ کوئی اور ہوتا تو بدلے چکانے کے لیے تمہیں تگنی کا ناچ نچا دیتا۔" آخری الفاظ کہتے کہتے ہادی کا لہجہ پھر زہر ناک ہو گیا۔

ارم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ وہ ایک عیار اور چرب زبان لڑکی تھی مگر اس وقت گنگ ہو رہی تھی اور لاچار بھی نظر آتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اب نیم رضامند بھی دکھائی دینے لگی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کا دماغ ایک اور انداز سے بھی سوچ رہا تھا۔ جو کچھ ہونے جا رہا تھا اس میں امید تھی کہ حجاب اس کی نظروں سے ہمیشہ کے لیے دور

جائے گی۔ یا اسے کم از کم طلاق تو ضرور ہو جائے گی۔ اور دل سے وہ یہی چاہتی تھی۔ لہٰذا اس کے لیے خطرہ بھی مول لے سکتی تھی۔

O.....❖.....O

یہ ایک بہت اہم دن تھا۔ ہادی نے سارے خدشات اور مصلحتیں ایک طرف رکھ کر راست اقدام کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ دراصل اس وقت ہو گیا تھا جب ہاشم ایرک نے اسے بتایا تھا کہ اگر حجاب کو قانونی طریقے سے بھی جلال کے چنگل سے نکالنے کی کوشش کی جائے تو وہ اس میں بڑی کامیابی سے رکاوٹ ڈالے گا اور تاخیری حربے استعمال کرے گا۔

جبکہ ہادی کے خیال کے مطابق وہاں درس والے گھر میں اب حجاب کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ وہ سخت مصیبت بلکہ شاید موت کی طرف بڑھ رہی تھی اور ڈاکٹر عطا بھی اس سے متفق تھے۔ ڈاکٹر عطا نے ایک اور بات بھی ہادی کو بتائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر جلال نے حجاب کو تنہا کسی کمرے میں بند کر رکھا ہے تو وہ بڑی بُری حالت میں ہو گی۔ وہ بچپن سے ہی بند جگہوں سے خوف کھاتی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں تنہائی اور گھٹن کے حوالے سے ایک طرح کا فوبیا ہوتا ہے۔

ہادی، ہاشم ایرک کے ساتھ ایک پرائیویٹ کار میں بیٹھا تھا۔ ہاشم ایرک سادہ لباس میں تھا۔ بہرحال اس کی جیکٹ میں بھرا ہوا کولٹ پسٹل موجود تھا۔ ہاشم کا ساتھی تھامس بھی کچھ فاصلے پر ایک بک سٹال پر موجود تھا۔ ہاشم ایرک اور اس کے ساتھی کو ہادی نے احتیاطاً ہی ساتھ لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو تو اس سے نپٹا جا سکے۔ ویسے اس کی توقع کم ہی تھی۔ پروگرام کے مطابق ہاشم نے اپنی کار اس سہ منزلہ پرائیویٹ ہسپتال کے سامنے کھڑی کی تھی جہاں ارم نے حجاب کو لے کر پہنچنا تھا۔

یہ بڑے سنسنی خیز لمحے تھے۔ انتظار کا ایک ایک پل ایک ایک دن کی طرح تھا۔ سب سے اہم سوال یہی تھا کہ ارم، حجاب کو درس والے گھر سے نکالنے اور یہاں تک لے جانے میں کامیاب ہو جائے گی یا نہیں؟ باقی باتیں بعد کی تھیں۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے حرکت میں تھیں۔ ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ ارم نے کہا تھا کہ وہ جیسے ہی گھر سے نکل کر ہسپتال کی طرف روانہ ہو گی اسے فون پر اطلاع دے گی۔ یہ اطلاع بارہ بجے کے لگ بھگ آنا تھی۔ اب آدھ پون گھنٹہ اوپر ہو چکا تھا۔ ہادی اپنی نشست پر بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ خود ہی ارم سے رابطہ کر کے دیکھے۔ اس نے سیل فون اٹھایا اور یہی وقت تھا جب ارم کی کال موصول ہوئی۔

"ہیلو...... کہاں ہو تم؟" ارم نے پوچھا۔

"میں کلینک کے سامنے پہنچ چکا ہوں اور تم؟"

"میں گھر سے نکلنے والی ہوں۔ تم تیار رہو۔" اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

ہاشم سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہادی نے کہا۔ "وہ بس روانہ ہونے والی ہے گھر سے۔"

وہ بے قراری سے انتظار کرتے رہے۔ ہادی مسلسل عقب نما آئینے میں دیکھ رہا تھا۔ چوڑا چکلا ہاشم ڈرائیونگ

سیٹ پر تھا اور اس کی نظر بھی بار بار گھڑی کی طرف اُٹھتی تھی۔

اور پھر ہادی کو ارم کی سفید فیاٹ کار نظر آئی۔ کار نے ٹرن لیا اور سیدھی ہسپتال کے پارکنگ لاٹ میں جا کر رکی۔ ہادی کا دل جیسے اس کے پورے جسم میں دھڑک رہا تھا۔ فیاٹ کی فرنٹ سیٹ پر ارم کے ساتھ حجاب موجود تھی۔ اس کی سیاہ رنگ کی شال وہ دور ہی سے دیکھ سکتا تھا۔

حجاب کو گاڑی میں چھوڑ کر ارم باہر نکلی اور متوازن قدموں سے ہسپتال کے داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔ حسبِ معمول وہ ایک گاؤن نما کھلے لبادے اور اسکارف میں تھی۔ اونچی ایڑی پر ٹھک ٹھک کرتی وہ دروازے میں داخل ہوگئی۔

"احتیاط سے۔" ہاشم ایرک نے انگریزی میں کہا۔

ہادی نے اثبات میں سر ہلایا اور بغلی سڑک سے نکل کر مین روڈ پر آ گیا۔ مین روڈ پار کرتے ہی وہ ہسپتال کی پارکنگ میں تھا۔ اپنی سرپٹ دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے اس نے فیاٹ کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر حجاب کے برابر بیٹھ گیا۔ حجاب نے بُری طرح چونک کر اسے دیکھا۔ "سوری حجاب! ویری سوری...... میں نے آپ کو دیکھا اور اندر آ گیا۔ میں بس دو منٹ آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں...... پلیز......"

حجاب کے زرد چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں خوف و ہراس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چند لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائے گی اور چلانا شروع کر دے گی۔ یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ ہادی نے اس کا وہ ہاتھ تھام لیا جو وہ دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھا رہی تھی۔ "پلیز حب! میں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا تمہیں...... کچھ نہیں کہوں گا۔ بس میری ایک بات سن لو۔"

"چلے جاؤ یہاں سے...... نکل جاؤ گاڑی سے...... ورنہ میں شور مچاؤں گی۔" وہ لرزتی کانپتی آواز میں بولی۔

"ٹھیک ہے میں چلا جاتا ہوں لیکن......"

"ہاتھ چھوڑو میرا...... میں کہتی ہوں ہاتھ چھوڑو۔"

ہادی نے جلدی سے ہاتھ چھوڑ دیا۔ "پلیز حب! صرف دو منٹ میری بات سن لو۔ میں قسم کھاتا ہوں چلا جاؤں گا۔ پھر کبھی آپ میری شکل نہیں دیکھیں گی۔"

"میں نے آپ کی کوئی بات نہیں سننی۔ میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔ آپ نکل جائیں یہاں سے ورنہ...... ورنہ میں پولیس کو بلاتی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ پھر دروازے کے ہینڈل کی طرف بڑھایا۔

ہادی نے پھر اس کی کلائی تھام لی۔ اس نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ پھر چلائی۔ "چھوڑ دیں میرا ہاتھ۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دیں۔"

ہادی نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اس نے دوسرے ہاتھ کا زوردار طمانچہ ہادی کے رُخسار پر مارا۔ طمانچہ کھانے کے بعد ہادی نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ پتا نہیں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی اس کے اندر وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر سخت لہجے میں بولا۔

"حب! میں کہہ رہا ہوں آپ سے...... صرف دو منٹ بات کرنی ہے مجھے۔ اگر آپ تماشہ بنائیں گی تو تماشہ بن جائے گا۔ اگر بات سن لیں گی تو ابھی چلا جاؤں گا یہاں سے۔" ہادی کے لہجے میں کچھ ایسی توانائی اور ایسی فیصلہ کن کیفیت تھی کہ حجاب ٹھٹک گئی۔

"اب کیا بات کرنی ہے۔ اب کیا کسر رہ گئی ہے۔" وہ خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔

"میں اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں حب! اور ایک درخواست کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔" (طمانچے سے اس کے ہونٹ سے خون رِس آیا تھا۔)

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ "جو کچھ کہنا ہے جلدی کہیں۔ یہاں ارم میرے ساتھ ہے۔ اندر کلینک میں گئی ہے۔"

"میں نے دیکھ لیا ہے۔ وہ "کیو" میں ہے۔ ابھی پندرہ بیس منٹ سے پہلے باری نہیں آئے گی اس کی۔" ہادی نے کہا۔ پھر اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے ابھی بھی بڑی سختی سے حجاب کی کلائیوں کو پکڑ رکھا ہے۔ اس نے کلائیوں پر سے اپنی گرفت ختم کر دی اور ایک بار پھر التجا آمیز لہجے میں حجاب کو دیکھنے لگا۔

وہ نم آنکھوں سے بولی۔ "میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

ہادی نے اسے سرتاپا دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور دکھائی دیتی تھی۔ خاص طور سے چہرہ کمزور اور زرد تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نظر آتے تھے۔ بال منتشر اور اُلجھے ہوئے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں، ہادی کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ کیا سے کیا ہوگئی تھی۔

"یہ کیا حالت بنالی ہے آپ نے؟" اس نے بے حد تاسف سے کہا۔

"میری حالت کو چھوڑیں۔ کیا کہنا ہے آپ نے؟" اس کے انداز میں انتہا درجے کی رُکھائی تھی۔

"حب! پہلے تو مجھے آپ سے معافی مانگنی ہے۔ میری غلطیوں کی وجہ سے آپ کے معاملات خراب سے خراب ہوئے اور ان میں سب سے بڑی غلطی وہی فوٹو گراف والی تھی۔ میں نے آپ کو بتائے بغیر وہ تصویر اُتاری اور......"

"ٹھیک ہے۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب اس کے ذکر کا فائدہ نہیں۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ چہرے کی طرح اس کی آواز بھی نقاہت سے بھرپور تھی۔ جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اب ہادی دیکھ رہا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ بھی زخمی ہے۔

"حب! میری نیت ہرگز بُری نہیں تھی لیکن میری وجہ سے جو کچھ ہوا وہ بہت بُرا ہوا۔ میں سب جانتا ہوں یہاں آپ کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں۔ جلال بہت نچلی سطح پر اُتر آیا ہے۔ معاف کرنا...... اپنی دولت کے زور پر وہ آپ کو زرخرید لونڈی کی حیثیت دینا چاہتا ہے۔ انکل فیاض کو دیا ہوا قرض وہ جس شرمناک بلیک میلنگ کے لیے استعمال کر رہا ہے وہ کوئی پوشیدہ بات نہیں۔"

"ان باتوں سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

"بات صرف آپ کے حال کی نہیں حب! میں جانتا ہوں آپ جو کچھ جھیل رہی ہیں اس سے زیادہ بھی جھیل سکتی

ہیں لیکن اس جھیلنے سے انکل فیاض اور خالہ صوفیہ کی مصیبتیں کم نہیں ہوں گی۔ آپ کی حالت زار کی خبریں ان تک بھی پہنچ رہی ہیں اور مزید پہنچیں گی۔ خدانخواستہ..... خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو کیا آپ کی والدہ جیتی رہ سکیں گی۔ وہ تو پہلے ہی بستر پر ہیں۔ آپ کو یہ زنجیریں توڑنی ہوں گی حب۔"

"یہ سب کچھ میرے مقدر میں ہے۔ میں اس کو نہیں بدل سکتی۔ بس دعا کر سکتی ہوں۔"

"کوئی چیز ایسی نہیں جو بدلی نہ جا سکے۔ دیکھیں حب! یہ بات میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں اور اس کو صرف اپنے تک ہی رکھیے گا۔ میں اور ڈاکٹر عطا مل کر پوری کوشش کر رہے ہیں کہ جلال کا دیا ہوا قرض اسے لوٹایا جا سکے۔ کافی انتظام ہو چکا ہے لیکن ابھی کچھ ہونا باقی بھی ہے۔ اس میں وقت لگ سکتا ہے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ یا پھر دو تین مہینے بھی۔ لیکن جس طرح آپ کو وہاں درس والے گھر میں رکھا جا رہا ہے۔ آپ یہ وقت نہیں گزار سکتیں۔ آپ نے شاید آئینے میں اپنی صورت نہیں دیکھی۔ دیکھیں...... یہ دیکھیں کیا ہو گئی ہیں آپ۔"

ہادی نے عقب نما آئینہ اس کی طرف پھیرا۔ اس نے آئینے کی طرف دیکھا اور چند لمحے کے لیے واقعی دنگ رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی ہادی نے بات پھر شروع کر دی۔ "حب! میں جو کچھ کہہ رہا ہوں ڈاکٹر عطا سے مشورے سے کہہ رہا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں۔ ہم آپ کو ایسی جگہ رکھیں گے جہاں جلال یا اس کا کوئی کارندہ آپ تک نہ پہنچ سکے گا۔ آپ وہاں سے جلال کو فون کر دیں کہ آپ اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہے ہم خود سنبھال لیں گے۔ اگر جلال نے کوئی الٹا راستہ اختیار کیا تو اس کا منہ اس طرح بند ہو گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا اور یہ سب کچھ قانونی طریقے سے ہو گا اور یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں، یہ ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو یا آپ کے گھر والوں کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔ اور ہم نے اس سے کسی طرح کی لڑائی کرنی بھی نہیں۔ صرف دو ڈھائی ماہ کی مہلت مانگنی ہے اس سے۔ قریباً آدھی رقم ہم اسے ابھی ادا کر دیں گے۔ آدھی دو ڈھائی ماہ بعد مل جائے گی اسے۔ یہ ساری باتیں ڈاکٹر عطا اور میرے درمیان طے ہو چکی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں ڈاکٹر عطا سے آپ کی بات بھی کرا سکتا ہوں۔"

ہادی نے سیل فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "نہیں ہادی صاحب! مجھے کسی سے بات نہیں کرنی اور نہ مجھے کسی بھی طرح آپ کی مدد چاہیے۔ آپ کے پہلے ہی بڑے احسان ہیں مجھ پر اب مجھے معاف کر دیجیے۔"

"اچھا..... آپ عطا صاحب سے بات تو کیجیے۔"

"پلیز نہیں ..... میں جانتی ہوں، سب کچھ اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر عطا انکل کچھ کہیں گے تو آپ کے کہنے پر ہی کہیں گے۔ جس طرح آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں۔ انہیں بھی کر دیا ہو گا۔ آپ یہاں کے حالات کے بارے میں نہیں جانتے اور نہ ہی جلال کی حیثیت کا پتا ہے آپ کو۔ آپ..... آپ مسلسل ہماری مصیبتوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔ خدا کے لیے آپ پیچھا چھوڑ دیجیے ہمارا۔ یہ میرے پرابلم ہیں، میں انہیں خود حل کر لوں گی۔ مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ آپ کی سب سے بڑی مہربانی یہی ہو گی کہ یہاں سے چلے جائیں اور دوبارہ اپنی صورت نہ

بتا میں۔ اور ایک بات اور یاد رکھیں۔ مجھے درس والی کوٹھی سے صرف جلال نکال سکتے ہیں یا میرے ابو نکال سکتے ہیں۔" اس کا لہجہ پھر درشت ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کسی وقت لگتا تھا کہ وہ پھٹ پڑے گی۔ وہ بار بار ہراساں نظروں سے ہسپتال کے داخلی دروازے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی جہاں سے ارم کو لوٹنا تھا۔

ہادی نے پھر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ "حب! اپنا نہیں تو اپنے والدین کا خیال کریں۔ جو کچھ آپ کے ساتھ ہو رہا ہے، آپ کو کچھ نہ کچھ ہو جانا ہے۔ کسی قیدی کی طرح کال کوٹھڑی میں گھٹ گھٹ کر ختم ہو رہی ہیں آپ۔ خدانخواستہ کرے، آپ کو کچھ ہوا تو آپ کی امی کا کیا ہو گا۔ انہیں ابھی تک آپ کے حالات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ آپ کے ابو بھی اتنے سخت جان نہیں کہ کوئی ایسا صدمہ برداشت کر سکیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں آپ کے گھر والے فی الحال اس قابل نہیں کہ آپ کے چھٹکارے کے لیے کچھ کر سکیں اور وہاں جلال کی طرف بھی کسی کو آپ پر رحم نہیں آتا۔ جلال اس وقت بدبختی کی ہر حد سے گزرا ہوا ہے۔ وہ دو بار باقاعدہ مجھ پر ہاتھ اٹھا چکا ہے اور یہ ارم؟ یہ تو فساد کی جڑ ہے۔ اس کی بھی کسی ظاہری بات پر نہ جایئے گا۔ یہ بات صرف اپنے تک رکھیے گا کہ اس وقت ارم آپ کو یہاں ڈاکٹر کے پاس لے کر آئی ہے تو میرے ہی مجبور کرنے پر آئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے کسی طرح آپ سے بات کرنے کا موقع مل سکے۔ میں آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا کہ وقت بہت کم ہے۔ معاملات بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت آپ کے پاس بہترین چوائس یہی ہے کہ آپ درس والے گھر سے اور اس خطرناک صورت حال سے نکل چلیں۔" وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

حجاب پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کسی وقت لگتا تھا کہ اس کی باتوں پر ایک دم یقین کر لینا چاہتی ہے۔ کسی وقت محسوس ہوتا تھا کہ اسے ہادی کا ایک پل بھی گاڑی میں ٹھہرنا گوارا نہیں۔

ہادی بولا۔ "وہ دیکھیں وہ سائیڈ کی سڑک پر نیلی گاڑی کھڑی ہے۔ اس کا پچھلا حصہ نظر آ رہا ہے۔ میں اسی پر یہاں آیا ہوں۔ ڈرائیور بھی موجود ہے۔ ہم پندرہ منٹ کے اندر بالکل محفوظ جگہ پر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کے لیے سب کچھ..... سب کچھ ٹھیک کرنا میری ذمے داری ہے حب! پلیز میری بات پر یقین کیجیے۔ میں آپ پر ایک ہلکی سی آنچ بھی آنے نہ دوں گا۔" ہادی کے لب و لہجے میں سچائی و توانائی کا ایک سمندر موجزن تھا۔ یہ بے پناہ لاوا حجاب کی ہستی کو تہ و بالا کر رہا تھا۔

یہی وقت تھا جب ہادی کے فون کی بیل ہوئی۔ یہ ارم کا وہی نمبر تھا جس پر وہ اس سے رابطہ کرتی تھی۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ "ہیلو کیا بات ہے؟" ہادی نے پوچھا۔

"گڑبڑ ہو گئی ہے۔" ارم کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کیا مطلب؟ کہاں ہو تم؟"

"میں ہسپتال کے اندر ہوں۔ انٹرنس کے پاس ہی کھڑی ہوں۔ مجھے سڑک کے پار جلال کا ایک گارڈ نظر آ رہا ہے۔ وہ اپنے سکوٹر کے پاس کھڑا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ باسٹرڈ ہمارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہے۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنے سینئر واسطو کو بلا رہا ہے۔ تمہارے پاس وقت نہیں۔ اگر تم نے یہاں سے

نکلنا ہے تو جلدی نکل جاؤ۔ ورنہ پھر بہت تماشہ لگ جاتا ہے۔ پلیز جلدی کرو۔" ارم کی آواز کانپ رہی تھی۔

ہادی نے مڑ کر دیکھا۔ گاڑی ایسی جگہ کھڑی تھی کہ اسے سکوٹر سوار گارڈ نظر نہیں آیا لیکن ظاہر تھا کہ ارم غلط نہیں کہہ رہی۔ "او کے" ہادی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"کیا بات ہے؟" حجاب نے بے حد سراسیمہ لہجے میں پوچھا۔

"حجاب پلیز! میری بات مان لیں۔ یہ موقع آپ کو پھر نہیں ملے گا۔ وہ سامنے گاڑی کھڑی ہے۔ بیس پچیس قدم کا فاصلہ ہے۔ ہم اس مشکل سے نکل سکتے ہیں۔ پلیز حجاب!"

حجاب کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا تھا۔ "کیا بات ہے؟ یہ کس کا فون تھا؟" اس نے پوچھا۔

ہادی نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بولا۔ "حب! لگتا ہے کہ جلال کے ایک گارڈ نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بلا رہا ہے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہم یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ یہ وقت ہمارے ہاتھ سے نکل گیا حب! تو بہت نقصان ہو جائے گا۔ ہمت کیجیے۔ ہم مل کر ہر چیز کو فیس کر لیں گے..... میرا وعدہ ہے آپ سے"

حجاب پیچھے ہٹ کر گاڑی کے دروازے کے ساتھ لگ گئی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

تین منٹ پہلے اس کے رویے میں جو تھوڑی سی لچک نظر آئی تھی اب اس کا دور دور پتا نہیں تھا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ "آپ ہمیں برباد کر کے چھوڑیں گے۔ آپ چلے جاؤ یہاں سے، دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ مجھے کہیں نہیں جانا..... مجھے کہیں نہیں جانا۔" آخری الفاظ اس نے بالکل چلانے والے انداز میں کہے۔

تب اس نے پھر دروازہ کھولنے کے لیے ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ہادی نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ اس نے بُری طرح ہاتھ جھٹک دیا اور چلائی۔ "میں پولیس کو بلاؤں گی..... پولیس..... پولیس....."

اب ہادی کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ فوراً گاڑی سے باہر نکل جائے۔ وہ جیسے بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ ہادی نے دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہی وقت تھا جب دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور پھر ایک بھاری بھرکم ہاتھ، ہادی کے گریبان پر تھا۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ یہ ایک بیم شحیم اطالوی گارڈ تھا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں جیسے نیلے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے ایک زوردار جھٹکا دیا اور ہادی لڑکھڑاتا ہوا سا سڑک پر آن گرا۔ اس کا سر سڑک کے پانچ چھ انچ اونچے کنارے سے ٹکرایا تھا۔ یونیفارم والا بیم شحیم گارڈ ہادی پر جھپٹا۔ ہادی کو لگا جیسے وہ کسی جنگلی بھینسے کے نیچے دب گیا ہے۔ گارڈ نے اس کے منہ پر مکا رسید کیا جواب میں ہادی نے بھی نیچے سے ایک طوفانی مکا اس کی ناک پر مارا۔ اس کے کانوں میں حجاب کے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ابھی تک گاڑی کے اندر تھی۔

تب ہادی نے دیکھا کہ ایک شخص اس پر جھپٹ رہا ہے۔ یقیناً یہ بھی حملہ آور کا ساتھی تھا۔ یہ یونیفارم میں نہیں تھا مگر شکل و صورت سے گارڈ ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے آتے ساتھ ہی ہادی کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر رسید کی اور پھر اس پر پل پڑا۔ ناک پر مکا کھانے والے بیم شحیم گارڈ کا منہ رنگین ہو گیا تھا اور ہادی پر اس کی گرفت قدرے کمزور پڑ گئی تھی۔ ہادی نے اسے اپنی ٹانگوں کے پورے زور کے ساتھ پیچھے کی طرف اُچھال دیا۔ وہ پشت کے بل سڑک پر گرا۔

ساتھ ہی ایک کار کے ٹائر خوفناک آواز سے چرچرائے۔ کار کی ٹکر سے بیم شحیم گارڈ دور تک لڑھک گیا۔ اس کی کمر کے ہولسٹر سے پسٹل بھی نکل کر سڑک پر پھسلتا نظر آیا۔ دوسرا گارڈ جو شکل سے انڈین یا پاکستانی لگ رہا تھا مغلظات بک رہا تھا اور ہادی کو لمبے بالوں سے پکڑ کر اس کا سر پختہ سڑک سے ٹکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی صورت کچھ جانی سی لگ رہی تھی۔

یہی وقت تھا جب ہاشم ایرک اور اس کا ماتحت تھامس، ہادی کی مدد کو لپکے۔ انہوں نے حملہ آور گارڈ کو ہادی کے اوپر سے ہٹایا اور گھما کر اوندھے منہ سڑک پر پٹخ دیا۔ گاڑیاں رُک رہی تھیں۔ درجنوں لوگ اردگرد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ اس بیم شحیم گارڈ کو دیکھ رہے تھے جو کار کی ٹکر سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ کچھ دوسرے گارڈ کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ہاشم ایرک اس کے ہاتھ پیچھے موڑ کر اسے ہتھکڑی پہنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہتھکڑی دیکھ کر لوگ سمجھ گئے تھے کہ یہ پولیس آفیسر ہے۔ اسی ہنگامے میں ہاشم ایرک کے ماتحت تھامس نے ہادی کو اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ ہادی کھسک جائے۔ ہادی نے گاڑی کی طرف مڑ کر دیکھا ہراساں چہرے والی ارم بھی اب گاڑی میں حجاب کے پاس موجود تھی۔ ان دونوں نے گاڑی غالباً اندر سے لاک کر لی تھی۔ ہادی نے دیکھا دور سے ایک اور سکوٹر سوار گارڈ موقع پر پہنچ رہا تھا۔ ہادی نے تیزی سے سڑک پار کی اور ایک بغلی گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی کے آخری سرے پر پھر ایک سڑک تھی۔ اسے ایک بس نظر آئی۔ وہ سگنل پر رُکنے کے بعد سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہادی لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور سینے میں ناکامی اور مایوسی کا دھواں بھر رہا تھا۔ وہ حجاب میں وہ ہمت پیدا نہیں کر پایا تھا جو اسے ساتھ چلنے پر آمادہ کر دیتی۔ شاید کہیں ایک انچ کی کسر رہ گئی تھی۔

O.....❖.....O

حجاب درس والے گھر میں تھی۔ جلال اس پر چلا رہا تھا۔ "اس نے تم سے ہمدردی کی بلکہ بیوقوفی کی اور تم نے اس کی بیوقوفی کا فائدہ اٹھایا۔ وہ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر گئی تھی اور تم نے وہیں پر اس حرامی کو بھی بلا لیا۔ بتا کس طرح بلایا تو نے اسے وہاں۔ بتا....."

"میں نے نہیں بلایا۔" وہ بلکی۔ "میں کیسے کس کو بلا سکتی تھی۔ میرے پاس کوئی فون نہیں تھا۔ ارم سارا وقت میرے ساتھ رہی ہے۔ میں جو کہے بڑی قسم کھا سکتی ہوں۔"

"تیری قسمیں اب اعتبار کے قابل نہیں رہیں۔ ارم تجھے گاڑی میں بٹھا کر کلینک میں چلی گئی۔ تم نے اس وقت کال کی ہو گی۔"

"میں نے نہیں کی جلال! میرا یقین کریں۔" وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ "وہ تو مجھے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ امی کے پاس پہنچانا چاہتا تھا اگر میں نے آپ کی نافرمانی کرنی ہوتی تو میں چلی جاتی۔ میں نے اسے روکنے کے لیے پولیس کو بلایا۔ شور مچایا۔"

"یہ سب کچھ تم نے اس وقت کیا جب گارڈز آ گئے۔ تم بہت بڑی دھوکے باز ہو۔ تمہارے اس نئے دھوکے کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو تمہارے پہلے فراڈ ہی کچھ کم نہیں ہیں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں، میں کسی دن مار دوں گا اس

حرامی کتے کو اور ساتھ ساتھ تجھے بھی۔ تو کسی رعایت کے لائق نہیں ہے۔ چل نیچے..... میں کہتا ہوں چل نیچے۔"

"خدا کے لیے جلال! مجھ پر یہ ظلم نہ توڑیں۔ بے شک مجھے بند کر دیں لیکن اسی کمرے میں رہنے دیں۔ وہاں نہ لے جائیں۔"

وہ پھنکارا۔ "مجھے تو اب وہ جگہ بھی تیرے لیے زیادہ محفوظ نہیں لگتی۔ تیری جیسیوں کو تو کسی کنوئیں میں پھینک دینا چاہیے۔ زنجیریں ڈال کر..... چل نیچے۔"

وہ کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی۔ اس تہہ خانے میں جانا ہی اسے موت لگ رہا تھا۔ وہ رونے بلکنے لگی۔ وہ دھاڑا۔

"دو ہی راستے ہیں تیرے سامنے۔ چپ چاپ تہہ خانے میں چلی جا یا پھر ابھی طلاق لے کر اپنے باپ کے گھر پہنچ جا۔"

وہ ایک ایسے دوراہے پر تھی جہاں سے کسی بھی طرف قدم اٹھانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ شاید اسے یہ غلط فہمی تھی کہ شاید ہادی کی شدید مزاحمت کرنے اور اس کے ساتھ نہ جا کر اس نے جلال کی جارحیت کے سامنے جس طرح سر جھکایا ہے اس کے صلے میں وہ کچھ نرمی برتے گا لیکن یہاں تو ہر بات کا مطلب الٹ تھا۔ ہر عاجزی کا بدل جبر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ ایک بار پھر تہہ خانے کی منحوس سیڑھیاں اترنے پر مجبور ہو رہی تھی۔ وہ اس کے عقب میں آ رہا تھا۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر وہ ایک بار پھر تڑپ گئی۔ بارہ فٹ ضرب چودہ فٹ کے اس تہہ خانے کی یہ چار دیواریں اسے موت کے چار خوفناک فرشتوں کی طرح لگتی تھیں۔ یہاں کی ہر شے ایک عفریت تھا جو اس کا خون چوسنے کے لیے لپکتا تھا۔ وہ مڑی اور دل فگار ہیجانی انداز میں بولی۔ "فار گاڈ سیک جلال! خدا کے لیے مجھے یہاں بند نہ کریں۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتی۔ مجھے جس طرح رکھیں گے رہوں گی۔ کبھی کچھ نہیں کہوں گی۔"

اب جلال کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ اندھا دھند اس پر پل پڑا۔ اس کے زخمی ہاتھ اور اس کی حالی کی پروا کیے بغیر۔ اس نے اس پر ٹھوکروں اور تھپڑوں کی بارش کر دی۔ وہ اندر ٹائلوں کے پھولدار فرش پر گر گئی۔ اس کے چلانے کی آوازیں دلدوز تھیں۔ اس کے پورے جسم پر جیسے ہتھوڑوں اور آتشیں طمانچوں کی بارش ہو گئی تھی۔ اسے بیدردی سے پیٹ کر اس نے تہہ خانے کا دروازہ دھماکے سے بند کیا اور اسے مقفل کر کے چلا گیا۔ وہ وہیں آنکھیں بند کیے پڑی رہی اور سسکتی رہی۔ وہ آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اگر کھولتی تو پھر وہی تہہ خانے کے بھیانک در و دیوار نظر آتے۔ گرنے سے اس کا زخمی ہاتھ پھر سنسنا اٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کندھے اور رخسار پر بھی چوٹ آئی تھی۔ شاید الماری کا کوئی ہینڈل لگا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے رخسار پر نمی کا احساس ہوا تو پتا چلا کہ خون بہہ رہا ہے۔ مگر اس نے پھر بھی آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔

قریباً پندرہ منٹ بعد تہہ خانے کا دروازہ پھر کھلا اور جلال اندر آ گیا۔ اپنی نم پلکیں اٹھا کر حجاب نے دیکھا۔ اس کے غیض و غضب کا دریا ذرا سا اترا ہوا نظر آتا تھا۔

"بیڈ پر بیٹھو۔" وہ پھنکارا۔

وہ جلدی سے اٹھ کر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر زہریلے انداز میں بولا۔ "یہ بھی

مت کہنا کہ میں نے تمہیں یہاں قید کر رکھا ہے۔ دوسری شادی سے لے کر تمہیں یہاں رکھنے تک میں نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا ہے۔ تم اپنی مرضی سے ہو یہاں..... مکمل طور پر اپنی مرضی سے ہو اور ابھی تم اس کا ثبوت بھی دو گی مجھے جب میں واپس جاؤں گا تو تم ثبوت دو گی۔"

وہ کچھ نہ بولی اور نہ کچھ پوچھا۔ اس نے ٹیبل لیمپ کی روشنی میں دھیان سے اس کے رخسار کا زخم دیکھا اور کندھے کا بھی۔ غالباً وہ انہی تازہ چوٹوں کو دیکھنے یہاں آیا تھا۔ اس نے روئی رکھ کر حجاب کے رخسار سے بہنے والا خون بند کیا۔ پھر کندھے سے قمیص ہٹا کر وہاں بھی روئی کا پھاہا رکھا۔ وہ رخسار والے زخم کے سلسلے میں زیادہ فکرمند نظر آ رہا تھا۔ حجاب نے اندازہ لگایا کہ یہ زخم کٹ سے زیادہ چھلنے جیسا ہے۔

جلال نے وہیں بیٹھے بیٹھے ڈرائیور عثمان کو فون کیا اور اسے فوراً میڈیکل سٹور سے ایک آئنٹمنٹ لانے کو کہا۔ یہ زخموں کے لیے ایک بہت مہنگی دوا تھی اور حال ہی میں مارکیٹ میں آئی تھی۔ دس پندرہ منٹ بعد وہ باہر گیا اور آئنٹمنٹ لے آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے حجاب کے رخسار کا زخم پائیوڈین سے صاف کیا اور مرہم لگا کر چپکنے والی ڈریسنگ کر دی۔

بظاہر یہ نرمی اور ہمدردی نظر آتی تھی مگر حجاب جانتی تھی یہ کیسی ہمدردی ہے۔ یہ وہی ہمدردی اور توجہ تھی جو انسان اپنی زیر استعمال اشیاء سے رکھتا ہے۔ اگر جلال کی گاڑیوں میں سے کسی گاڑی پر بدنما خراش آ جاتی تو بھی وہ ایسی ہی فکرمندی اور توجہ کا مظاہرہ کرتا۔ وہ اس کی ملکیت تھی۔ اس نے اسے استعمال کرنا تھا۔ آج نہیں تو کل..... کل نہیں تو پرسوں یا پھر ایک دو ماہ بعد۔

تو یہ کیا رشتہ ہے؟ حجاب نے بڑے دکھ سے سوچا۔ بے شک آج کل حجاب کو دیکھتے ہی جلال کی آنکھوں سے نفرت کی چنگاریاں چھوٹنے لگتی تھیں لیکن یہ چنگاریاں حجاب کے لیے ہوتی تھیں۔ اس کی جسمانی خوبصورتی اور شادابی کے لیے نہیں۔ وہ سب کچھ یقیناً اسے ابھی تک مرغوب تھا۔ اب نہ سہی، مستقبل قریب میں سہی۔ وہ بحیثیت شوہر اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ شاید..... شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اسے طلاق کی پرزور دھمکی تو دیتا تھا لیکن اس دھمکی کے ساتھ اس کے ابو اور بھائی کے سنگین نقصانات کو بھی نتھی کر دیتا تھا۔ وہ اس کی ملکیت کھونا نہیں چاہتا تھا اور وہ اس میں کامیاب تھا۔

اس کی مرہم پٹی کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تحکم سے بولا۔ "اٹھو۔"

وہ کسی معمول کی طرح کھڑی ہو گئی۔ "دیکھو آج میں تمہیں آخری بار بالکل آخری بار کہہ رہا ہوں۔ اب اگر تم نے واویلا کیا یا یہاں سے جانے کی بات بھی کی تو میں تمہاری طلاق کے کاغذات تمہارے منہ پر مار دوں گا۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا وہ تمہاری ذمے داری ہوگی۔"

وہ سکتہ زدہ کھڑی رہی۔ اب فریاد کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "اب مجھے اس بات کا ثبوت دو کہ میں نے تمہیں یہاں زبردستی بند نہیں کیا ہوا۔ چلو یہ دروازہ اپنے ہاتھوں سے بند کرو۔"

"جج..... جی؟" وہ مردہ آواز میں ہکلائی۔

"میں لاطینی نہیں بول رہا۔ میں باہر جا رہا ہوں تم یہ دروازہ خود بند کرو تا کہ تمہیں اپنے اختیار کا احساس ہو۔ چلو.....'' وہ تحکم سے بولا۔ پھر اس کا بازو پکڑ کر دروازے کی طرف لے آیا۔ خود باہر نکل گیا اور بولا۔ "بند کرو دروازہ اپنے ہاتھوں سے۔" اس کی سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ جلال کے سامنے ہاتھ جوڑ دے۔ ایک بار پھر اس کی منت سماجت کرے۔ مگر پھر اس نے کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اگر اس نے اس کی مرضی پوری نہیں کی تو وہ شاید پھر تشدد پر اتر آئے۔ کچھ حاصل نہیں تھا۔ اب کچھ حاصل نہیں تھا۔ اب پسپائی تھی اور مسلسل پسپائی۔ اس نے ہچکیوں کے روتے ہوئے دروازہ بند کر لیا۔ اس نے باہر سے بولٹ لگا کر لاک کر دیا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر واپس جا رہا تھا اس کے قدموں کی چاپ میں ایک فاتحانہ دھمک تھی۔

○.....❖.....○

ہاشم ایرک کے مشورے پر ہادی نے ہوٹل تبدیل کر لیا تھا۔ یہ درمیانے درجے کا ہوٹل شہر کے ساحلی علاقے میں تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں جو کمرہ ہادی کو ملا وہ اس کے اصل نام سے بک نہیں تھا۔ یہ بکنگ ہاشم نے ہی کروائی تھی (اور اس کے لیے پاسپورٹ کے بغیر ہی کام چلا لیا تھا) ہاشم ایرک نے بتایا تھا کہ واسکو ڈے گاما کا جو بیٹا کتا گارڈ ڈرائی کے دوران میں کار کی ٹکر سے زخمی ہوا وہ ہسپتال میں ہے۔ اس کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی طرح کا مقدمہ تو درج نہیں کرایا گیا تھا مگر ہاشم کو یقین تھا کہ جلال جیسا شخص خاموش نہیں بیٹھے گا اور اس کے کارندے ہادی کو تلاش کر رہے ہوں گے۔ ہادی نے اس دوسرے گارڈ کو پہچان لیا تھا جو واسکو کے ساتھ مار پیٹ میں شریک ہوا۔ ہوٹل واسکو ڈے کے سامنے کچھ عرصہ پہلے ہادی پر جو حملہ ہوا تھا یہ شخص اس میں شریک تھا۔ یعنی اب اس بات میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ ہادی کے ساتھ وہ مار پیٹ بھی جلال نے ہی کروائی تھی۔

ہادی اس پراؤ نامی ساحلی ہوٹل میں خاموش بیٹھا تھا۔ اسے سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی مگر اس نے سگریٹ بھی تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ بات الکحل یا سگریٹ کی ہی نہیں تھی۔ ان دو چار ماہ میں اس کے اندر حیرت ناک تبدیلیاں آئی تھیں۔ وہ ایک بدلا ہوا شخص بن گیا تھا اور ان تبدیلیوں کی بنیاد کسی کی خاموش محبت تھی۔ وہ عشق تھا جو کسی نایاب خوشبو کی طرح اس کے روئیں روئیں میں سما گیا تھا۔ کسی نے کہا تھا۔

تم عشق کی منزل میں قدم سوچ کے رکھنا
دریائے محبت کے کنارے نہیں ہوتے

اس وقت بھی ہادی کے دل و دماغ میں حجاب کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کا زرد چہرہ دھلی دھلی آنکھیں اور مدھم آواز۔ یہ سب کچھ اس کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا۔ کہاں تھی وہ روشن پیشانی، کہاں تھے وہ پنکھڑیوں سے ہونٹ جنہیں وہ نرمی سے دانتوں تلے دباتی تھی اور ایک حسین ادا کو وجود دیتی تھی۔ وہ دھوپ میں رکھی ہوئی برف کی طرح پگھل رہی تھی۔ ختم ہو رہی تھی اور وہ اس کے لیے کچھ نہ کر سکا تھا۔ اس کے سینے میں دھواں بھرنے لگا۔ اسے لگا کہ حجاب کو کچھ ہو گیا تو وہ بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ بڑی تیزی سے بہت دور جا چکا تھا وہ۔ کسی کے عشق میں خود کو گم کر چکا تھا۔ وہ اس کی جان بن چکی تھی اور یہ لفظی بات نہیں تھی۔ اسے حقیقت میں یہی لگتا تھا اور ستم کی بات یہ تھی کہ اسے کچھ

خبر ہی نہیں تھی۔ اس سے آخری ملاقات میں ایک بار تو ہادی کا دل چاہا تھا کہ وہ اس کی دونوں کلائیوں کو زور سے تھامے اور ہر مصلحت ایک طرف رکھنے کے بعد پکار کر کہہ دے۔

"حجاب! میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شاید یہ لفظ چھوٹا ہے۔ شاید عشق کا لفظ بھی اتنا بڑا نہیں۔ میں اس جذبے کو کیا نام دوں حب! جو مجھے تمہارے لیے مار چکا ہے ختم کر چکا ہے۔" لیکن وہ کہہ نہ سکا تھا۔ اور اسے لگتا تھا کہ وہ کبھی یہ بھی نہ سکے گا لیکن کیا اس نے بھی کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس دیوانگی اور اس والہانہ پن کی وجہ نہیں سوچی تھی جو وہ اس کے لیے رکھتا تھا۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ڈاکٹر عطا تھے۔

"ہیلو ہادی! یہ نئی جگہ کیسی ہے؟"

"مناسب ہے عطا انکل! آپ سنائیں انکل فیاض سے بات ہوئی؟"

"ہاں ہوئی۔" ان کی آواز میں ایک بار پھر مایوسی کا عنصر تھا۔

"کیا کہتے ہیں؟"

"ہادی! اصل میں کوئی ڈھائی ہزار یورو تو انہوں نے ایک ہفتہ پہلے ہسپتال کا بل ادا کیا ہے۔ ابھی مزید خرچا بھی ہو رہا ہے۔ ابھی تو وہ اس معاملے میں ہاتھ ہی کھڑے کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ کسی طرح وہ گجرات والا پلاٹ بک جائے۔ چاہے کتنے کا بھی بکے۔"

"انکل! مجھے یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی۔ وہ پلاٹ بکنے والا ہوتا تو اب تک بک چکا ہوتا۔ انکل! یہ ان کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ کیا اس سلسلے میں ان کی ساری بھاگ دوڑ اس پلاٹ سے شروع ہو کر وہیں پر ختم ہو جاتی ہے؟ یا پھر وہ کسی طرح کی چین لینا ہی نہیں چاہ رہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے ہادی! یہ حالات بندے کو کئی دفعہ بے بس کر چھوڑتے ہیں۔ سیانوں نے ٹھیک کہا ہے کہ بیماری اور مقدمہ بندے کو جال کی طرح جکڑ لیتے ہیں۔ وہ بے چارے بھی بیماری کے جال میں ہیں۔"

ہادی کے لبوں سے ایک آہ ابھری۔ پژمردہ آواز میں بولی۔ "عطا انکل! بچپن سے ہر فلم اور ڈرامے میں ہم ایسے ہی نہیں دیکھتے رہے ہیں۔ باپ کو دل کے دورے سے بچانے کے لیے یا ماں کی سلامتی کی خاطر اولاد ناپسندیدہ فیصلوں کی بھینٹ چڑھتی ہے۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ حقیقت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ رومانی یا ازدواجی معاملات میں اکثر اولاد کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔"

"لیکن یہاں تو صورت حال واقعی تشویش ناک ہے ہادی! صوفیہ کی حالت ایسی ہے کہ ذرا سا صدمہ بھی نہیں سہہ سکتی۔ ابھی تک اس سے ہر بات پوشیدہ رکھی گئی ہے۔ وہ بار بار حجاب سے ملنے پر اصرار کر رہی ہے۔ اسے بتایا گیا ہے کہ وہ جلال کے ساتھ وینس میں ہے۔ جلال نے اسے کہیں بھی فون کرنے سے منع کیا ہوا ہے۔ اس لیے وہ فون نہیں کر سکتی۔ جلد ہی خود آ کر ملے گی۔ جلال کی دوسری شادی کا بھی ابھی صوفیہ کو پتا نہیں۔"

"لیکن کب تک انکل! کب تک آپ لوگ یہ سب کچھ چھپا سکیں گے۔"

"کم از کم حجاب اس شکنجے سے تو نکل آئے جس میں پھنسی ہوئی ہے۔ جلال سے رہائی مل جائے اسے۔"

"کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے انکل کہ وہ اسے آزاد کرنا ہی نہیں چاہتا۔ قرض چکا بھی دیا گیا تو وہ رکاوٹیں ڈالے گا۔"

"یہ ہو سکتا ہے لیکن قرض کی ادائیگی کے بعد اس کی پوزیشن بہت کمزور ہو جائے گی۔ دو دن کے اندر پولیس اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹا دے گی۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔"

"لیکن انکل! وہ تب تک زندہ رہے گی تو پھر ہے نا۔ آپ نے اسے نہیں دیکھا لیکن میں نے دیکھا ہے۔ برسوں کی بیمار نظر آتی ہے۔ مجھے تو لگتا تھا کہ کسی بھی وقت گاڑی میں ہی بے ہوش ہو جائے گی۔ کاش..... میں کسی طرح..... اسے ساتھ لا سکتا۔ بہت دکھ ہو رہا ہے مجھے۔"

"اس نے نہیں آنا تھا ہادی! میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا۔ وہ نہیں آئے گی۔ اس کے باپ نے اسے جہاں کھڑا کیا ہے وہ وہیں کھڑی رہے گی۔ چاہے جان چلی جائے۔ اب وہی کہے گا تو وہ وہاں سے ہلے گی۔ حکم عدولی نہیں کر سکتی۔ لیکن..... لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی ہادی۔"

"جی فرمائیں۔"

"یہ ارم تیار کیسے ہوگئی، حجاب کو درس والے گھر سے نکالنے کے لیے؟"

"بس اس کی ایک دکھتی رگ میرے ہاتھ میں تھی۔ اس سے فائدہ اٹھایا میں نے۔ مگر افسوس کہ حاصل کچھ نہ ہوا۔"

ہادی نے گول مول سا جواب دیا تھا۔ دوسری طرف عطا صاحب یقیناً سمجھ گئے کہ وہ تفصیل بتانا نہیں چاہتا۔ ہادی نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "عطا انکل! جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد لگتا ہے کہ شاید حجاب کو کڑی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس پر سختی بھی بڑھا دی جائے۔ ہم اس معاملے کو زیادہ Delay نہیں کر سکتے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے جلدی کرنا ہے۔ میں ابھی گجرات میں ایک جاننے والے کو فون کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پلاٹ لینے پر راضی ہو جائیں۔ ان سے تھوڑا بہت ادھار بھی لیا جا سکتا ہے۔"

"میں بھی اپنے طور پر پوری کوشش کر رہا ہوں۔ ہمارے اختیار میں کوشش کرنا ہے۔ کامیابی دینا اوپر والے کا کام ہے لیکن اب ایک بات تمہارے دھیان میں رہے۔ جلال یا اس کے کسی کارندے سے تمہارا براہ راست ٹکراؤ نہیں ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں بہت احتیاط رکھو۔"

ڈاکٹر عطا سے بات ختم کرنے کے بعد ہادی سوچ میں پڑ گیا۔ اب اس کا دھیان رہ رہ کر ارم کی طرف جا رہا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ ارم پر دباؤ ڈال کر اس سے ایک بڑی رقم حاصل کر سکے۔ لیکن پتا نہیں کیوں یہ سب کچھ اسے گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ کیا وہ حجاب کو بلیک میلنگ کے روپے سے رہائی دلائے گا؟ کیا اس کی جان سے پیاری ہستی آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے بلیک میلنگ کی مرہونِ منت ہوگی۔ اس سوال کا جواب ہادی کے دل نے ہر بار نفی میں دیا تھا۔ وہ سوا تین کروڑ روپے کی اس رقم میں بلیک میلنگ یا غیر قانونی طریقے سے حاصل کیا ہوا ایک پیسہ بھی شامل نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جو پھولوں اور شبنم کی طرح پاک تھی اس پر غلاظت کا ایک چھینٹا بھی اسے گوارا نہیں تھا۔

تو پھر کیا وہ اپنا مکان فروخت کر دے؟ وہ حجاب کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا۔ ہر بڑی سے بڑی آزمائش سے گزر سکتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں اپنے بھائی فہد سے کھل کر بات کرے گا۔ ایک دوست کی طرح اسے اپنی ہر قلبی واردات سے آگاہ کر دے گا۔ اسے بتا دے گا کہ پچھلے چند ماہ میں اس کی زندگی کیا سے کیا ہوگئی ہے۔

پتا نہیں کیوں اب اسے رہ رہ کر انکل فیاض اور فیصل کا خیال بھی آ رہا تھا۔ ان سے وابستہ توقعات ہرگز پوری نہیں ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ڈر سہم کر دبک گئے ہیں۔ وقتی طور پر ہی سہی مگر انہوں نے حجاب کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں۔ انکل فیاض تو چلو بوڑھے اور کمزور سہی لیکن کیا فیصل بھی بالکل لاچار ہو گیا تھا۔ اُس بے چاری کا تو منہ سوکھتا تھا فیصل اور ابو کا نام لیتے ہوئے۔ خاص طور پر اپنے ابو پر تو بڑا مان تھا اسے۔ ان بدترین حالات میں بھی اس کی آنکھیں گواہی دیتی تھیں کہ اسے اپنے ابو اور بھائی کے قدموں کی چاپ کا انتظار ہے لیکن وہ چاپ کہیں نہیں تھی۔

اس رات اس نے درد میں ڈوب کر ایک اور یادگار نظم لکھی۔ اس نظم کا ماخذ جولائی 1798ء کو پیش آنے والا ایک یادگار واقعہ تھا۔ یہ واقعہ پہلے بھی "کاسابیانکا" کے عنوان سے منظوم ہو چکا تھا۔ ہادی کی نظم کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

اور تم جانتے ہو کاسابیانکا کون تھا کاسابیانکا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ وہ فرنچ بحری جہاز کے آفیسر کا لختِ جگر تھا اور جب کھلے ویران پانیوں میں انگریزوں نے حملہ کیا۔ جب جہاز کو آگ لگی اور ہر طرف تہلکہ مچا لشکریوں کی آہ و بکا سے عرشے لرزنے لگے تو باپ نے کاسابیانکا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا۔ "کاسابیانکا یہاں کھڑے رہنا، جب تک میں نہ کہوں۔"

اور وہ کہہ کر چلا گیا اور وہ بارود کی بارش میں موت کا شکار ہوا اور بیٹا باپ کے حکم پر اسی جگہ ٹھہرا رہا۔ اس کے گرد موت نے اپنے گھیرے تنگ کیے لیکن وہ ہلا نہیں وہ کیسے ہلتا۔ ابھی اس کے باپ کا حکم نہیں تھا اور وہ اسی جگہ کھڑا کھڑا رہا اور وہ اطاعت کی لازوال مثال تھا۔

میں نے کاسابیانکا کو نہیں دیکھا لیکن میں نے دھوپ کی روشنیوں میں چمکتی دمکتی ہوئی ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ بھی اپنے باپ کے حکم پر ایک جلتی ہوئی چار دیواری میں کھڑی رہی۔ اس کے نازک پاؤں جل گئے۔ اس کا کومل بدن جھلس گیا۔ وہ درد سے کراہتی رہی اور کراہتی رہی۔ ہاں میں نے کاسابیانکا کو نہیں دیکھا لیکن روم کی اس لڑکی کو دیکھا ہے۔"

نظم لکھنے کے بعد اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس نے پارکر کا قلم اپنے ہونٹوں سے لگایا اور سوچنے لگا ہمارے اردگرد حجاب جیسی نہ جانے کتنی لڑکیاں ہوں گی جن کے پاؤں جھلس رہے ہوں گے، جن کی سانسیں رک رہی ہوں گی مگر وہ اپنے والدین کو دکھوں اور مصیبتوں سے بچانے کے لیے اپنے سسرالی گھروں میں سب کچھ سہہ رہی ہوں گی۔ اپنی آن بان، انا اور پندار کی قربانی دے رہی ہوں گی۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے وہ فون پر عطا انکل سے رابطے کی کوشش کر رہا تھا مگر رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں گلزار کی کال آ گئی۔ بات شروع کرتے ہی اس نے فلیٹ کے کرائے اور اپنی بائیک کی خرابی کا رونا رونا شروع کر دیا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا اس کے پاس کوئی اہم خبر تھی اور وہ خبر ڈلیور کرنے سے پہلے پیٹ کی راہ ہموار کر رہا تھا۔ ہادی نے اسے اس حوالے سے تسلی دی تو وہ اصل موضوع

کی طرف آ گیا۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ بتایا کہ جلال اور ارم میں لڑائی کی اطلاع ہے اور ارم کو پہلی بار جلال کی ڈانٹ پھٹکار سننا پڑی ہے۔ ظاہر ہے اس کی وجہ ارم کی وہی بیوقوفی تھی جو اس نے حجاب کو اس کے زندان سے نکال کر کی تھی۔

گلزاری کی دوسری خبر زیادہ اہم تھی۔ اس نے بتایا۔ ”آج کل حجاب کا بھائی ایک گرل فرینڈ کے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ میں نے اس کو دو تین بار گاڑی میں اکٹھے دیکھا ہے۔ لڑکی انڈین یا پاکستانی ہے۔ پرسوں دونوں نے مین اسکوائر کے قریب ایک آئس کریم پارلر کے باہر کار پارک کر رکھی تھی اور آئس کریم کھا رہے تھے۔ کافی شوخی میں تھے دونوں اور لڑکی اسے چٹکیاں وغیرہ بھی کاٹ رہی تھی لیکن بات صرف چٹکیوں کی ہی نہیں ہے۔ وہ دونوں عنقریب ایک دوسرے کو ایک بہت بڑی چٹکی بھی کاٹنے والے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”نکاح کر رہے ہیں دونوں۔ بالکل کنفرم اطلاع ہے جی! اپنے خاص ذریعے سے ملی ہے مجھ کو۔ کل وحدت اسلامک سینٹر میں سہ پہر تین بجے ان کا نکاح ہو رہا ہے۔ بالکل سادگی والا کام ہے۔ بس آٹھ دس قریبی لوگ شرکت کریں گے۔“

گلزاری نے واقعی حیران کن خبریں سنائی تھیں۔ نکاح والی خبر وہ پورے وثوق اور ساری جزئیات کے ساتھ دے رہا تھا۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ ایک طرف ماں بیمار پڑی تھی۔ دوسری طرف بہن ناکردہ گناہوں کی سزا بھگت رہی تھی اور بھائی صاحب بیاہ رچا رہے تھے۔ پتا نہیں کہ عطا انکل کو بھی خبر تھی یا نہیں۔ فیصل کے حوالے سے ہادی کے دل میں عجیب سا غم و غصہ جمع ہونے لگا۔ اس نے کچھ دیر تک گلزاری کے اس موضوع پر بات کی پھر پوچھا، کیا فیصل سے کسی طرح ملاقات ہو سکتی ہے۔

گلزاری بولا۔ ”ہو کیا سکتی ہے۔ ابھی ہو جائے گی اگر آپ چاہیں تو اس وقت ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ ساڑھے بارہ بجے کے لگ بھگ جناب فیصل صاحب لنچ فرمانے کے لیے نکلتے ہیں۔ میں اپنے آفس سے۔ آفس کے بالکل پاس ہی ترک کیفے ٹیریا ہے حلال فوڈ والا۔ آپ ابھی آ جائیں تو ابھی کے ابھی شرف ملاقات حاصل ہو جائے گا۔“

”واقعی؟“

”ہنڈرڈ پرسینٹ جی۔“

ہادی نے چند لمحے کے لیے سوچا۔ انکل عطا نے اسے ایسی جگہوں اور لوگوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا جن کی وجہ سے جلال یا اس کے کسی کارندے سے مڈبھیڑ ہو سکتی تھی۔ مگر وہ کمرے میں بند ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس کے سینے میں آگ سی سلگ رہی تھی۔ وہ انکل فیاض سے تو نہیں مل سکتا تھا لیکن فیصل سے تو مل سکتا تھا اور اسے جھنجھوڑ سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ ترک کیفے ٹیریا میں ایک آرام دہ کرسی پر فیصل کے روبرو بیٹھا تھا۔ فیصل تھری پیس سوٹ میں تھا۔ سنہری فریم والی عینک میں بڑا نفیس سا لڑکا لگ رہا تھا۔ وہ یوں ہادی کو اپنے سامنے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ”آپ یہاں کس لیے آئے ہیں۔ آپ کو پتا ہے ہم سب آپ سے دور رہنا چاہتے ہیں۔“

”کیوں دور رہنا چاہتے ہیں؟“ ہادی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

”اس سوال کا جواب بڑا تلخ ہے۔ آپ چپ ہی رہیں تو بہتر ہے۔“

”میں چپ رہنے کے لیے نہیں بات کرنے کے لیے آیا ہوں۔“

”میں بات کروں گا تو پھر بات بہت بڑھ جائے گی۔ آپ کو شرم آنی چاہیے اس پر...... جو کہا جا رہا ہے آپ کے بارے میں۔“

”یعنی تمہیں دنیا کی باتوں پر یقین ہے۔ اپنی بہن پر یقین نہیں ہے۔“

”آپ نے بدنام کیا ہے اسے۔ اس کی گھریلو زندگی خراب کی۔ اس کی منت سماجت پر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کیا نہیں کیا آپ نے۔ آپ نے چوری چھپے اس کی تصویر بنائی اور اس ایک تصویر کی وجہ سے ہم سب کے سر شرم سے جھکے۔“

”تم لوگوں کو بس ایک تصویر نظر آئی۔ ایک جیتی جاگتی لڑکی نظر نہیں آئی۔ اس کی پوری زندگی اس کا کردار، اس کی سچائی اور کچھ نظر نہیں آیا؟ یا پھر...... نظر آنے کے باوجود تم لوگوں نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ رانجھ فیملی سے ڈر کر بیٹھ گئے ہو۔ جلال سے سہم کر چپ ہو گئے ہو۔ میں تمہیں اتنا گیا گزرا نہیں سمجھتا تھا فیصل اور نہ اتنا بے حس۔ وہاں تمہاری بہن سسک سسک کر ختم ہو رہی ہے اور یہاں تم سب کچھ بھول کر عیاشیاں کر رہے ہو۔“

”آپ اپنی زبان بند رکھیں تو اچھا ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر کر سکتے تو بہن کے لیے کچھ کرتے۔ وہاں سسرال میں اب اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہاں اگر وہ جلال کے پاؤں تلے روندی جا رہی ہے تو صرف اس لیے کہ تم نے قرض اٹھا رکھا ہے۔ وہ تمہیں جھنجھٹوں اور عدالتوں سے بچانا چاہتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی گناہ نہیں اس کا۔“

فیصل پھنکارا۔ ”تم اس کی صفائیاں پیش کرنے والے کون ہوتے ہو۔ تمہیں کس نے اجازت دی اس کے بارے میں بولنے کی۔ وہ میری بہن ہے۔ میں اس کا نام سننا نہیں چاہتا تمہاری زبان سے۔“ وہ آپ سے تم پر آ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہی تھیں۔

ہادی بولا۔ ”اتنا دم خم کہیں اور دکھایا ہوتا تو آج اپنے گھر کو آگ لگا کر نہ بیٹھے ہوتے تم لوگ۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ تم نے جلال کے ڈر سے اسے گھر میں گھسنے نہیں دیا۔ دھکے دے کر نکال دیا۔“

”تم اپنی زبان بند کرو۔“ فیصل غصے سے لرزتے ہوئے بولا۔

چند لمحے کے لیے یوں لگا کہ وہ ہادی پر جھپٹ پڑے گا مگر پھر اچانک ایک شخص آ گے آیا۔ ”کیا کرتے ہو؟“ وہ

دونوں کے درمیان رکاوٹ بنتے ہوئے بولا۔

وہ براؤن سویٹر والا ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ ہادی نے غور سے دیکھا اور حیران ہوا وہ عطا انکل تھے۔ وہ نہ جانے یہاں کیسے آن پہنچے تھے۔ انہوں نے فیصل کو دھکیل کر پیچھے ہٹایا۔ پھر ہادی کو بھی چند قدم دور کر دیا۔ دونوں پڑھے لکھے ہو۔ یہ گنواروں جیسی حرکتیں کیوں کر رہے ہو۔" وہ بلند آواز سے بولے۔

فیصل، ہادی کی طرف انگلی اُٹھا کر بولا۔ "اس شخص کو میری نظروں سے دور کر دیں۔"

ہادی نے کہا۔ "ہاں جی! دور کر دیں۔ اس کو میری وجہ سے اوقات یاد آ رہی ہے۔"

انکل عطا نے دونوں کو ڈانٹا اور سمجھایا۔ پھر عجیب جوشیلے لہجے میں بولے۔ "تم دونوں اس طرح کیوں جھگڑ رہے ہو۔ تم دونوں دراصل ایک ہی کام میں لگے ہوئے ہو۔ ایک ہی مسئلے کو حل کر رہے ہو۔ ایک دوسرے کو جانو گے تو تعریف کرو گے ایک دوسرے کی۔ سراہو گے ایک دوسرے کو۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا ڈاکٹر انکل؟" فیصل نے کہا۔

"تم ابھی چپ رہو فیصل! جا کر ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیو اور ٹیمپر ٹھنڈا کرو اپنا۔ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔"

اس کے بعد انہوں نے ہادی کو ساتھ لیا اور ریستوران سے باہر نکل آئے۔ سامنے ان کی ٹویوٹا کار کھڑی تھی۔ انہوں نے ہادی کو اپنے ساتھ اگلی نشست پر بٹھایا۔ گاڑی کے ڈیش بورڈ پر کچھ کاغذات رکھے تھے۔ غالباً کوئی رجسٹری وغیرہ تھی۔

وہ گاڑی چلا کر ایک کشادہ سڑک پر لے آئے اور پھر ایک پارک کے سامنے روکتے ہوئے بولے۔ "میں اتفاقاً اِدھر نکل آیا۔ ورنہ تم دونوں پتا نہیں کیا کر بیٹھتے۔ یہ لڑنے کا موقع نہیں بھائی! خوش ہونے کا اور ایک دوسرے کی ستائش کرنے کا موقع ہے۔" ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"کیا مطلب انکل؟"

"سمجھو ہمارا مسئلہ تقریباً حل ہو گیا ہے۔ ان شاء اللہ پرسوں تک ہم اس قابل ہوں گے کہ جلال کی رقم یکمشت اس کے منہ پر مار سکیں۔ کتنی کمی آ رہی تھی ہمارے ٹوٹل میں؟"

"یہی کوئی ایک لاکھ ساٹھ ہزار یورو۔"

"یہ تقریباً ہو گئے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"لل...... لیکن کیسے؟"

عطا انکل نے نشست کی پشت سے ٹیک لگائی اور ذرا ٹھہرے لہجے میں بولے۔ "جمعے کے روز فیصل کا نکاح ہے، اپنی تایا زاد نمرہ سے وہ لوگ چھ سات روز پہلے ہی پاکستان سے یہاں پہنچے ہیں۔"

ہادی حیرت زدہ تھا۔ "آپ اس لڑکی کی بات کر رہے ہیں میرا مطلب ہے، جس کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ عمر کی بڑی ہے اور شکل صورت بھی......"

"ہاں ہادی وہی۔" عطا انکل کی آواز ذرا ابھر گئی۔ "میں سمجھتا ہوں فیاض نے بڑی قربانی دی ہے اور فیصل نے بھی۔ حجاب کی خاطر اس نے نمرہ کو قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور شاید اس سے بھی بڑی قربانی فیاض کی ہے۔ فیاض نے زندگی میں کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔ روپے پیسے پر ہمیشہ آن بان کو ترجیح دی تھی۔ لیکن بیٹی کی خاطر اس نے بھی اپنا سر جھکایا ہے۔ صلح کے لیے اس کی بھاوج کی شرط بھی کہ فیاض اس سے باقاعدہ معافی مانگے۔ فیاض نے معافی بھی مانگی ہے اور رشتہ بھی قبول کیا ہے۔ شاید تم نہ سمجھ سکو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس کے لیے کتنا مشکل تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مارا ہے ہادی! اپنی بچی کی خاطر خود کو مٹایا ہے۔ وہ سب سمجھتا ہے کہ اس کی بچی اب جلال کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی لیکن رہنے پر مجبور ہے۔"

ہادی سناٹے میں تھا۔ فیصل کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھوم رہا تھا اور انکل فیاض کا بھی۔ اس نے عطا انکل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تو آپ کا مطلب ہے، انکل فیاض کی بھاوج مکان فروخت کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔"

"نہ صرف آمادہ ہو گئی ہے بلکہ انہوں نے اسے خود ہی خرید لیا ہے۔ یعنی اب وہ آدھے کی نہیں پورے حصے کی مالک ہوں گی۔ یہ کاغذات وغیرہ اسی سلسلے میں تیار ہو رہے ہیں۔ پے منٹ میں تھوڑی سی کمی تھی وہ بھی آج آ گئی ہے۔ فیاض کو پاکستانی کرنسی کے حساب سے قریباً سوا دو کروڑ روپے ملے ہیں۔ اس میں سے قریباً ساٹھ لاکھ تو وہ پہلے ہی یورو میں حاصل کر چکا ہے۔ اب لگ بھگ ایک کروڑ پینسٹھ لاکھ اس کے ہاتھ میں آ جائیں گے۔ امید ہے کہ کل پرسوں تک یہ ساری کارروائی مکمل ہو جائے گی۔"

انکل فیاض اور فیصل کے حوالے سے ہادی کے ذہن میں جو غبار سا آ گیا تھا وہ ایک حوصلہ بخش ہوا کے جھونکوں سے اوجھل ہونے لگا۔ عطا انکل کی باتیں ہر غلط فہمی کا خاتمہ کر رہی تھیں۔ ہادی کے دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگ گئی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر تصوراتی نگاہ سے حجاب کی کومل کلائیاں دیکھیں اور ان کلائیوں سے ٹوٹ کر گرتی ہوئی زنجیروں کو دیکھا۔

○ ○ ○

وہ حسبِ معمول فرش پر لیٹی تھی۔ اس کے نیچے غالیچہ تھا جو بیسمنٹ کے دروازے کے بالکل پاس بچھا تھا۔ وہ اپنا چہرہ دروازے کی نچلی درز کے بالکل پاس کر لیتی تھی۔ یہاں سے اسے نسبتاً تازہ ہوا کی آمد محسوس ہوتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں اس درز میں باہر نکال دیتی۔ اسے لگتا کہ اس کی انگلیاں آزادی کا لمس محسوس کر رہی ہیں۔ اس بیسمنٹ کی ایک ایک شے آتشیں حرف کی طرح اس کے ذہن پر کندہ ہو چکی تھی۔ پھولدار ٹائیلوں کی بناوٹ، ان کی ترتیب، ان کے پھولوں کی تعداد، الماری کے دروازوں کے نقش و نگار، ریفریجریٹر کا رنگ اور اس کے دروازے پر کمپنی کا زرد مونو گرام...... مونو گرام کے ترچھے حروف...... ہر چیز اسے ہرٹ کرتی تھی۔ اور اس کے حافظے پر نقش ہو چکی تھی۔ وہ ان میں سے کچھ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے دو دو گھنٹے آنکھیں بند کیے پڑی رہتی تھی۔ کھانے سے دن میں وہ بمشکل پانچ چھ لقمے لیتی اور باقی کھانا کلثوم دروازے کی درز میں سے اُٹھا کر لے جاتی تھی۔ نقاہت دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ سب سے بڑا مسئلہ سانس کا تھا۔ اس کا سانس گھٹنے لگتا تھا۔ کبھی کم اور کبھی بہت زیادہ لیکن میں جسم سے جان نکلتی محسوس ہوتی اور ٹھنڈے پسینے آنے لگتے۔ اب بھی کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔ اسے لگا وہ بے

ہوشی کے کسی ایسے طویل دورے میں جانے والی ہے جس کے بعد شاید آنکھیں ہی نہ کھل سکیں۔ اس نے آنکھیں کھولنا چاہیں لیکن پھر وہی منحوس چھت نظر آئی جو کسی عفریت کی طرح اس پر جھکتی چلی جاتی تھی اور اپنے پنجے اس میں گاڑ کر اس کا خون چوسنے لگتی تھی۔ اس نے اپنے زخمی ہاتھ کو ہولے سے سینے پر رکھا اور آنکھیں پھر بند کرلیں۔

"ابو! کہاں ہیں آپ کیوں مجھ تک نہیں پہنچتے؟ آپ نے تو کبھی مجھے اس طرح تنہا نہ چھوڑا تھا۔ امی مجھے سزا کے طور پر دومنٹ کے لیے بھی کچھ کہہ دیتی تھیں تو آپ ہفتوں ان سے خفا رہتے تھے۔ اب تو مجھے سزا کاٹتے ہفتے گزر چکے ہیں آپ کی بیٹی مر رہی ہے ابو کیا آپ اس کی پیشانی نہیں چومیں گے۔ اتنی دیر کیوں لگا رہے ہیں ابو؟"

وہ سوچتی رہی اور آنکھوں کے کونے نم ہوتے رہے۔ ابو کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ بالکل جیتا جاگتا۔ جیسے وہ سامنے کھڑے ہوں۔ چہرے پر جھریاں، آنکھوں میں نقاہت، کمر خمیدہ اور ہونٹ خشک۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں اپنا حال اسے سنا رہے تھے۔

وہ تڑپ اٹھی۔ "نہیں ابو! میں تو صرف اپنا دکھ بیان کررہی تھی۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ میں جانتی ہوں آپ نے میرے لیے اپنی سی کوشش ضرور کی ہوگی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر حساب کتاب والی سیاہ ڈائری میں سر کھپایا ہوگا۔ خود کو گھسیٹتے ہوئے دوستوں کے دروازوں تک بھی گئے ہوں گے۔ ان گنت فون کالیں کی ہوں گی۔ وہ سب کیا ہو گا جو کر سکتے ہیں۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں۔ اگر کوئی شکوہ ہے تو صرف ایک بات کا ہے ابو! آپ نے مجھ سے بات کیوں نہ کی۔ مجھ سے منہ کیوں پھیرا ابو! ایسا تو نہیں کرنا تھا آپ نے۔ آپ کو پتا ہے آپ کی بیٹی یہ نہیں جھیل سکتی۔ اب اگر وہ مرگئی تو کیا کریں گے آپ؟ کس طرح مداوا کریں گے۔ اس کی میت کے سرہانے بیٹھ کر کتنی بھی باتیں کرلیں گے لیکن وہ کمی تو پوری نہ ہوگی۔ مجھے اتنا اپنا نہیں جتنا آپ کا غم ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو آپ کیسے سب ......" وہ سسکنے لگی۔ گرم آنسو زخمی رخساروں پر رینگنے لگے اور آنسوؤں میں نمک ہوتا ہے۔ وہ خراشوں پر لگ دیتا ہے۔ یعنی تکلیف سے آنسو نکل رہے تھے اور آنسوؤں سے تکلیف ہو رہی تھی۔

پھر وہ دل ہی دل میں خود کلامی کے انداز میں بولی۔ "ہاں ابو! مجھے خود سے زیادہ آپ کی اور امی کی فکر ہے۔ آپ کو بہت زیادہ برداشت کرنا پڑے گا۔ آپ کو بہت زیادہ دکھ ہوگا۔ میری یاد آئے گی۔ میری باتیں اور میری بدنصیبیاں آپ کو رلائیں گی۔ ہاں اگر مجھے کچھ ہوگیا تو یہی سب کچھ ہوگا نا۔ بولیں ابو۔"

ابو خاموش رہے۔ اسی طرح خشک ہونٹوں کے ساتھ سر جھکائے کھڑے رہے۔ وہ بولی۔ "اگر...... مجھے کچھ ہوگیا تو آپ ایسا کیجیے گا۔ میری ساری نشانیاں ختم کردیجیے گا۔ اپنے گھر سے میرا ہر نشان مٹا دیجیے گا۔ آپ کے گھر میں میری جو کتابیں پڑی ہیں اور میرے کپڑے اور میرے بچپن کے کھلونے سب کسی کو دے دیجیے گا۔ پھینک دیجیے گا اور میری وہ چھوٹی الماری جسے آپ نے اپنی اسٹڈی میں سجا کر رکھا ہوا ہے اسے بھی گھر سے نکال دیجیے گا۔ وہ بھی بہت ہرٹ کرے گی آپ کو بہت زیادہ ہرٹ کرے گی۔ اور پھر ابو! آپ ایسا کیجیے گا آپ فیصل اور امی کو لے کر کچھ دنوں کے لیے روم سے کہیں دور چلے جایئے گا۔ کسی ایسی جگہ جہاں ہم اکٹھے کبھی نہ گئے ہوں۔ بہت دن وہاں رہیے گا۔ بہت زیادہ دن۔"

پھر فیصل کا خیال اس کے ذہن میں آیا۔ "فیصل! مجھے معاف کرنا۔ میں تمہارے لیے شرمندگی کا باعث بنی۔ میری وجہ سے تمہیں دکھ پہنچے۔ اپنی باجی کی پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر یہ سب معاف کردینا۔ اور اگر مجھے کچھ ہوگیا تو بھول جانا مجھے۔ سنبھال لینا خود کو۔ مجھے پتا ہے تم اندر سے بہت مضبوط ہو، خود کو سنبھال سکتے ہو۔ تم خود سنبھلو گے تو امی ابو کو سنبھالو گے نا اور بڑی باجی کو بھی اور...... بہت دنوں تک امی کو کچھ نہ بتانا اور جب بتانا تو بہت آہستہ آہستہ سنبھل سنبھل کر مجھے پتا ہے تم ایسا کرسکتے ہو......"

اس کے تصور نے منظر بدلا۔ ایک دم ایک ہیولا اس کے سامنے آگیا۔ ایک سایہ سا، چوڑے شانے، لہراتے بال، لمبا قد، اس کی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن وہ وہاں موجود تھا۔ اس نے کہا۔ "تم مرنے کی بات کیوں کرتی ہو۔ جینے کی بات کیوں نہیں کرتی ہو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ تمہیں آزاد ہونا ہے۔ ہم سب کے لیے۔ کیونکہ ہم سب کوشش کررہے ہیں۔ ہمارے قدم تمہاری طرف اٹھ رہے ہیں۔ ہماری نگاہیں اس بیسمنٹ کے دروازے کو تلاش کر رہی ہیں۔ ہم تم تک پہنچنے والے ہیں۔"

"کون ہو تم؟" حجاب نے پوچھا۔

"تمہیں پتا ہے، میں کون ہوں۔ تمہیں پتا ہے۔ ہم ہمیشہ ملتے رہتے ہیں۔ ہر زمانے میں ہر خطے میں۔ ہزارہا [illegible]۔" اس نے کہا اور اوجھل ہوگیا۔

وہ سکتہ زدہ سی لیٹی رہی۔ یہ آواز جانی پہچانی تھی۔ یہ آواز اس نے وینس کی جھلملاتی شب میں سنی تھی۔ اور بحیرہ روم کے رتیلے ساحل پر اور کولیسئم میں اس قدیم جنگی اکھاڑے کی سیڑھیوں پر۔

لیکن یہ آواز یہاں کیوں سنائی دے رہی تھی۔ اور یہ آخر میں اس نے کیا الفاظ کہے تھے۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ کیوں مسلسل اس کے تعاقب میں تھا۔ مصیبتیں جھیل رہا تھا۔ زخم کھا رہا تھا۔ توہین برداشت کررہا تھا۔ پھر بھی منہ نہیں پھیر رہا تھا۔ وہ اسے کیا دے سکتی تھی۔ وہ اس سے کیا لے سکتا تھا؟ پھر بھی...... پھر بھی...... کیسا دیوانہ تھا وہ۔ اسے اس پر پیار آیا اور ترس بھی۔ بیک وقت وہ اسے بہت برا لگا اور اچھا بھی۔ اسے وہ طمانچہ یاد آیا جو اس نے اس کے منہ پر مارا تھا اور وہ پوری جان سے لرز گئی۔ اسے وہ دکھ آمیز حیرانی یاد آئی جو طمانچہ کھا کر اس کی نم آنکھوں میں ابھری تھی۔ اس نے کیوں کیا ایسا؟ اس نے تو زندگی میں کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اسے لگا کہ اس کے بائیں بازو سے ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ یہ وہی بازو تھا جس کے ہاتھ پر چوٹ لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہ ٹیسیں کیا اس چوٹ کی وجہ سے تھیں؟ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل ڈوبتا جارہا ہے۔

○......○

ہادی نے اپنے حصے کی ساری رقم عطا انکل کو فراہم کردی تھی۔ دوسری طرف ایک قریبی اسلامک سینٹر میں بڑی خاموشی سے فیصل اور نمرہ کا نکاح ہوگیا تھا۔ اب وہ گھر جو فیاض صاحب نے بڑی چاہتوں سے بنوایا تھا۔ ان کی اہلیہ یعنی نمرہ کی والدہ کا تھا۔ بہرحال ابھی انہیں اسی گھر میں رہائش پذیر رہنا تھا۔

انکل فیاض اور فیصل نے یقیناً حجاب کے لیے اپنی طاقت سے بڑھ کر قربانی دی تھی۔ بیٹیوں کے سکھ کے لیے

باپ اور بھائی ہمیشہ سے ایسے ہی نیلام ہوتے رہے ہیں۔ اور سکھ پھر بھی کبھی ملتا ہے کبھی نہیں۔ یہاں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ حجاب کی زندگی کیا رُخ اختیار کرے گی۔ ہادی کے اندازے کے مطابق اس کے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا وہ شدید ترین ڈپریشن کا شکار اور بُری حالت میں تھی۔ کوشش کے باوجود اس کے بارے میں کسی طرح خیر خبر نہیں مل رہی تھی۔

کاغذی کارروائیوں میں دو دن مزید لگ گئے۔ آخر وہ دن آن پہنچا جب جلال کو اس کی رقم ادا ہونا تھی اور تنازعہ ختم ہونے کے بعد اسٹامپ پیپر وغیرہ پر دستخط ہونے تھے۔

ہادی ہوٹل کے کمرے میں تھا اور ایک ایک پل گن گن کر گزار رہا تھا۔ اسے عطا انکل کی کال کا انتظار تھا۔ یہ کال دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ آنا تھی۔ مگر تین بجے کے قریب آئی۔ عطا انکل نے بتایا کہ سارا معاملہ اچھے طریقے سے ہو گیا ہے۔ وکیل کی موجودگی میں کاغذات پر سائن وغیرہ ہو گئے ہیں۔ فیاض اور فیصل بھی موقع پر موجود تھے۔

ہادی نے پوچھا۔ ”حجاب کے بارے میں کیا بات ہوئی؟“

”جلال کا کہنا ہے کہ وہ بالکل خیریت سے ہے۔ بس ایک بار تھوڑی سی بے ہوشی ہوئی تھی اسے۔ اب وہ دوا وغیرہ لے رہی ہے۔ وہ اسے چند روز کے لیے روم سے میلانو لے گیا ہے تاکہ اس کی طبیعت بہتر ہو سکے۔“

”جھوٹ بول رہا ہے۔ بکواس کر رہا ہے۔ وہ یہیں ہوں گی۔ وہیں روم والے گھر میں۔ آپ اس سے کہیں کہ وہ ان سے فون پر بات کرائے۔“

”ہاں...... اس نے کہا ہے کہ آج رات وہ فون پر بات کر کے اپنی خیر خیریت کا بتا دے گی۔“

”رات کو کیوں؟ اب کیوں نہیں۔ یہاں سے میلانو کی فلائٹ اتنی لمبی تو نہیں۔“

”چلو رات ہونے میں کون سی دیر ہے ہادی! ایک دفعہ فیاض اور فیصل سے اس کی بات ہو جائے تو صورت حال بڑی حد تک سامنے آ جائے گی ویسے جلال کا رویہ بھی بہت بدلا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اسے پتا چل گیا ہے کہ وہ اب زبردستی حجاب کو روک نہیں سکتا ہے۔“

”مجھے نہیں لگتا جی کہ حجاب روم میں نہیں ہوں گی۔ شاید وہ سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہ رہا ہے۔“

”نہیں...... میرے خیال میں ایسی بات نہیں۔ بہرحال جیسے ہی حجاب کی بات فیاض وغیرہ سے ہو جاتی ہے۔ میں تمہیں فون کرتا ہوں۔“

عطا انکل سے گفتگو کرنے کے بعد ہادی بے چینی سے کوریڈور میں ٹہلنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ حجاب جتنی جلد سے جلد آزاد فضا میں سانس لے اتنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ انکل عطا اور انکل فیاض وغیرہ نے اسے دیکھا نہیں تھا ہادی نے اسے دیکھا تھا اور اس کی ابتر حالت کو بڑی شدت سے محسوس کیا تھا۔ وہ جیسے کسی آہنی تابوت میں بند تھی اور تازہ ہوا کے لیے تڑپ رہی تھی۔

ہادی نے ارم کو اس کے خاص نمبر پر ایس ایم ایس کیا کہ وہ اسے کال کرے۔ دس پندرہ منٹ بعد اس کی کال آ گئی۔ ارم کی ساری اکڑفوں ختم ہو چکی تھی اور ہادی سے بات کرتے ہوئے اس کی آواز پر خوف کا غلبہ رہتا تھا۔

”ہیلو...... کیا بات ہے اب؟“ وہ چھوٹتے ہی بولی۔

”ایک کام کرنا ہوگا تمہیں۔“

وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم اب بھی یہاں ہو۔ تم ضرور کوئی بڑا نقصان اُٹھاؤ گے۔ جو کچھ وہاں ہسپتال کے سامنے ہوا ہے۔ اس کے بعد تمہیں اب پاکستان میں ہونا چاہیے تھا۔ تم...... اب بھی...... ٹھیک سے جانتے نہیں ہو جلال کو۔“

”ہمدردی کا شکریہ...... لیکن میں اپنے وقت پر ہی جاؤں گا۔ فی الحال تم مجھے حجاب کے بارے میں بتاؤ، وہ کہاں ہے؟ اور کس حال میں ہے؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں۔ جلال ناراض ہیں مجھ سے۔ بات نہیں کرتے۔ تم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔“

”تمہارے لیے اسے نارمل کرنا کچھ مشکل نہیں۔ تو بیاہتا بیوی ہو پسند کی شادی ہے۔ دو چار ادائیں دکھاؤ گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھے ایک گھنٹے کے اندر معلومات چاہئیں۔ پتا کرو کہ کہاں ہے حجاب! روم میں ہے یا روم سے باہر۔“

وہ لمبے توقف کے بعد بولی۔ ”کوشش کرتی ہوں لیکن اس کے بعد مجھ سے کچھ اور نہ کہنا۔ تم نے جو کہا تھا وہ میں نے کر دیا اب مجھے اور کاموں میں نہ گھسیٹو۔ میں بہت اَپ سیٹ ہوں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں بہت اَپ سیٹ ہوں۔“ اس کی آواز بلند ہو گئی (حالانکہ وہ سرگوشیوں میں بولتی تھی۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ بھی تھی۔ جیسے کوئی نشہ آور دوا لی ہو۔)

”تم تو صرف اَپ سیٹ ہو لیکن کچھ بے گناہ ایسے بھی ہیں جن کو تم نے تقریباً برباد کر چھوڑا ہے۔ تھوڑا بہت تو ان کے درد کا احساس ہو رہا ہوگا تمہیں۔ اگر تم فن دکھاؤ گی تو یہ احساس اور بڑھانا پڑے گا۔“

”دیکھو تم حد سے گزر رہے ہو۔ میں زیادہ برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میں سچ کہتی ہوں زیادہ برداشت نہیں کر پاؤں گی۔“ اس کی آواز میں طیش کی بلند لہر تھی اور اس نے اس کی آواز کو بھی بلند کر دیا تھا۔

”مجھے ایک دو گھنٹے میں معلوم کر کے بتاؤ کہ وہ کہاں ہے...... بس۔“ اس کے ساتھ ہی ہادی نے فون بند کر دیا۔

O......❖......O

موسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ حجاب کی نبضیں کمزور پڑتی جا رہی تھیں۔ کسی وقت وہ غالیچے سے اُٹھتی تو اس کا سر بُری طرح چکرانے لگتا۔ کسی وقت اسے دروازے کے قریب پڑے پڑے اچانک لگتا کہ کوئی سیڑھیاں اُتر رہا ہے۔ اس کی مدد کے لیے آ رہا ہے۔ اس کے ابو، بھائی فیصل، ماموں یا ڈاکٹر انکل۔ وہ سرتاپا انتظار بن جاتی۔ مگر پھر قدموں کی چاپ سیڑھیوں کے قریب آ کر دور چلی جاتی۔ یا پھر اسے پتا چلتا کہ یہ تو کلثوم تھی جو کسی کام سے بیسمنٹ کی طرف آئی تھی۔

بیسمنٹ میں حرارت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ حجاب کے جسم پر وہی بوسیدہ سے کپڑے تھے جو چند روز پہلے جلال نے اسے مہیا کیے تھے۔ پہلے تو کھانا بھی کھانے کے قابل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب دو تین دن سے نسبتاً بہتر کھانا آ رہا

تھا۔ کمزوری بہت زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا دوپہر کے بچے ہوئے چاولوں میں سے ایک دو نوالے لینے کی کوشش کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ سیڑھیوں کی طرف پھر قدموں کی چاپ اُبھری۔ وہ اپنے سلامت ہاتھ پر زور دے کر بیٹھ گئی۔ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ چاپ سیڑھیوں پر آئی اور پھر دروازے کے بالکل پاس پہنچ گئی۔ اس کی امید کے چراغ ایک بار ٹمٹما کر بجھ گئے۔ یہ جلال تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہونے لگے۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ جلال نے اسے دروازے کے قریب غالیچے پر لیٹنے سے منع کر رکھا تھا۔ ایک دم اُٹھ کر بستر پر آنے سے اسے شدید چکر آیا اور سانس پھولنے لگی۔

وہ اندر آ گیا اور دروازہ بولٹ کرنے کے بعد اسے دیکھنے لگا۔ دیکھتا رہا آج اس کا موڈ عجیب تھا۔ شاید ڈانٹ ڈپٹ والا۔ شاید جارحیت والا۔ کچھ دیر کے لیے تو حجاب کو لگا کہ وہ ایک بار پھر اس پر پل پڑے گا۔ مار مار کر نیل ڈال دے گا لیکن پھر اس نے ایک گہری سانس لی اور اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ بھی بمشکل اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے پاس لیپ ٹاپ بھی تھا جو اس نے میز پر رکھ دیا۔ اس نے اس کے رُخسار کی چوٹ دیکھی اور تسلی بخش انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں تمہارے ابو تم سے نیٹ پر بات کریں گے۔''

''مجھ سے بات کریں گے؟'' اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں تھا۔

''ہاں...... لیکن ان کے ساتھ کوئی رونے دھونے والی بات نہ کرنا۔ میری بات سمجھ رہی ہو تم؟'' اس کا لہجہ بے حد تحکمانہ تھا۔

''ج...... جی...... جیسا آپ کہیں گے۔''

''ان سے خوش ہو کر بولنا۔ ان سے یہی کہنا ہے کہ تم میرے ساتھ کچھ دنوں کے لیے میلانو آئی ہوئی ہو۔ دس دن کے لیے ہو سکتا ہے کہ زیادہ دن بھی لگ جائیں۔ اپنی طرف سے انہیں پوری تسلی دینی ہے۔''

''جیسے آپ کہتے ہیں۔''

جلال نے اپنی سیاہ شیروانی کے کالر کو حسبِ عادت درست کرتے ہوئے ناک پر ناگواری ... چڑھائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم اپنا رویہ درست کر دو تو میں بھی رویہ بدل سکتا ہوں۔ لیکن اگر ٹکراؤ کی کوشش کرو گی تو پھر یہ اچھا نہیں ہو گا۔ دونوں طرف کا نقصان ہو گا۔''

''میں نے آپ سے کہا ہے جلال! میں آپ سے کوئی مطالبہ نہیں کروں گی۔ آپ مجھے جس طرح رکھیں گے میں رہوں گی۔ بس...... مجھے یہاں سے نکال لیجیے۔ یہاں میرے لیے ایک ایک پل گزارنا مشکل ہے۔''

جلال کی تیوری چڑھ گئی۔ لگا کہ وہ کچھ بہت سخت بولے گا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ''دیکھو حجاب! کب کیا کرنا ہے۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے۔ مجھے زچ کرو گی تو پھر تمہیں بھی تکلیف ہو گی۔ ابھی چپ چاپ رہو یہاں۔ جب وقت آئے گا تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔

کچھ دیر بعد جلال نے لیپ ٹاپ آن کیا اور سکائپ کھول کر بیٹھ گیا۔ حجاب کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''میں کال ملا

رہا ہوں۔ میں نے جو کہا ہے وہ سب ذہن میں رکھنا۔ تم میلانو میں ہو اور ایک دوست کی فیملی کے ساتھ ان کے اپارٹمنٹ میں ٹھہری ہوئی ہو۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ یہ صرف آڈیو کال ہو گی۔''

حجاب نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ اسے لگا کہ وہ کئی برسوں بعد اپنے کسی پیارے کی آواز سننے والی ہے۔ وہ سوچنے لگی کیا ابو سے بات کرتے ہوئے وہ اپنے آنسوؤں کو روک سکے گی۔ اور اگر نہ روک سکی تو جلال کا رویہ کیا ہو گا؟

کچھ ہی دیر بعد لیپ ٹاپ کے اسپیکر پر اس کے ابو کی آواز اُبھری۔ ''ہیلو......''

''ہیلو انکل! میں جلال بول رہا ہوں۔ کیسے ہیں آپ؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ حجاب کہاں ہے؟'' ابو کی لرزتی آواز حجاب کے کانوں میں پڑی اور اس کے پورے جسم میں پھریری دوڑ گئی۔

جلال نے حجاب کو اشارہ کیا۔ حجاب نے خود کو بمشکل کمپوز کیا اور آگے جھک کر کہا۔ ''ہیلو...... ابو جی! میں حجاب بول رہی ہوں۔''

چند سیکنڈ دونوں طرف ایک نہایت جذباتی خاموشی طاری رہی۔ پھر حجاب کو ابو کی آواز آئی۔ ''کیسی ہو بیٹی؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں...... اور آپ؟''

''میں بھی ٹھیک ہوں۔ بس...... مجھے بہت دُکھ ہے۔ اس دن میں تم سے بات نہ کر سکا۔ میری طبیعت بالکل اچھی نہیں تھی۔ مجھے معاف کرنا حجاب۔''

حجاب کو لگا وہ بلند آواز سے رونا شروع کر دے گی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا۔ موضوع بدل کر بولی۔ ''امی کیسی ہیں ابو جی؟''

''وہ اب بہت بہتر ہے۔ ہسپتال سے گھر آ چکی ہے۔ طبیعت کچھ اور سنبھلے گی تو پھر تم سے بات بھی کراؤں گا۔ جلال بتا رہا تھا کہ تم میلانو میں ہو۔ واپسی کب تک ہے؟''

''ابھی ٹھیک سے پتا تو نہیں...... مگر آٹھ دس دن تو رہیں گے۔''

''کہاں ٹھہرے ہو بیٹا؟''

''ان کے دوست کی فیملی ہے۔ کافی بڑا اپارٹمنٹ ہے۔'' حجاب نے کہا۔

''چلو...... تم واپس آتی ہو تو پھر تفصیل سے بات کریں گے۔ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں حجاب! غلطیاں انسانوں سے ہوتی ہیں اصل بات یہی ہے کہ انسان غلطیوں سے سبق سیکھے۔ کچھ وقتی پریشانیاں ہیں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ تم نے گزارنی ہے۔ تم جس طرح چاہو گی، ویسا ہی ہو گا ان شاء اللہ۔''

''آپ بھی پریشان نہ ہوں ابو! امی اور فیصل بھائی کو میری طرف سے تسلی دیں۔ میں ٹھیک ہوں۔''

''مگر آواز سے بہت کمزور لگ رہی ہو۔ لگتا ہے کوئی اور بول رہا ہے۔''

"بس..... بس ایک دو دن بخار ہوا تھا۔ اب اچھی ہوں۔ مجھے زیادہ فکر امی کی ہے۔ ان کا بہت خیال رکھیں ابو۔"

"وہ بھی اب ان شاء اللہ بہتر ہوتی جائے گی۔ جو تھوڑی بہت مالی پریشانیاں آگئی تھیں وہ بھی اب دور ہو رہی ہیں۔ تمہارے ڈاکٹر انکل توقع سے زیادہ تعاون کر رہے ہیں اس سلسلے میں۔ وہ بھی تم سے ملنے کے لیے بے قرار ہیں۔ تم روم واپس آتی ہو تو پھر بات ہوتی ہے ان سے بھی۔"

جلال نے حجاب کو تحکمانہ اشارہ کیا کہ وہ اب بات ختم کر دے۔ حجاب نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور گفتگو کو جلدی سے اختتام کی طرف لے آئی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد باپ بیٹی نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ دیا۔

بات ختم کر کے حجاب بے دم سی ہو گئی۔ اس کا رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی اداکار کوئی مشکل شاٹ دینے کے بعد نڈھال سا ہو کر گر جائے۔ اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ جلال جلدی سے پانی لے آیا۔ گلاس تھما کر

اس نے چند گھونٹ لیے اور تکیے سے سر ٹکا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

کچھ دیر بعد وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا۔ "دیکھو حجاب! میں نے دوسری شادی کر کے کوئی غیر شرعی یا غیر اخلاقی کام نہیں کیا ہے۔ اگر اس وجہ سے تم مجھ سے علیحدہ ہونا چاہتی ہو تو میں یہ آسانی سے نہیں ہونے دوں گا۔ جو کچھ مجھ سے بن پڑا کروں گا۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا تم؟"

حجاب اثبات میں سر ہلانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکی۔ حالانکہ وہ پوچھ سکتی تھی کہ دوسری شادی کر کے تو تم نے کوئی ناجائز کام نہیں کیا لیکن زبردستی مجھے اپنے ساتھ رہنے پر مجبور کر کے تو ناجائز کام کرو گے۔

وہ شیروانی کا کالر درست کر کے اور گردن کو ذرا تان کر بولا۔ "تمہاری والدہ فیملی نے مجھے بہت ڈسپوزٹ کیا ہے۔ اب اگر وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ادھر ادھر سے رقمیں پکڑ کر میرا قرضہ اتار دیں گے اور پھر تمہارے من مانی کرنے کے لیے آزاد ہوں گے تو ایسا نہیں ہو گا۔ یہ معاملہ عدالتوں میں پہنچے گا۔ اور تمہیں پتا ہی ہے عدالتوں میں عورت کی کتنی مٹی پلید ہوتی ہے۔ تمہارے لیے طلاق حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہو گا جب! اس لیے میرا مخلصانہ مشورہ ہے تمہیں، حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو کچھ ہوا میں سب بھولنے کو تیار ہوں۔ تم بھی بھول جاؤ۔ میں تمہیں ارم سے بہت دور رکھوں گا۔ تم ایک بالکل مختلف اور اچھی زندگی گزارو گی۔ اس سارے معاملے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرو۔"

"میں کیسے غور کروں جلال۔" وہ سسکی۔ "اس بند قبر میں، میں سوچنے کے قابل ہی نہیں ہوں۔ پلیز پہلے مجھے یہاں سے نکالیں۔"

"میں نہیں نکال سکتا۔" وہ ایک دم گرج کر بولا۔ "ابھی نہیں نکال سکتا۔ وہ حرامی..... خنزیر کا بچہ..... جب تک یہاں ہے میں کوئی رسک نہیں لوں گا۔ اور میں نے تمہیں کہا تھا کہ پھر اس بارے میں بکواس نہ کرنا۔ میں نے کہا تھا یا نہیں؟" اس نے مشتعل ہو کر اس کے بال پکڑ لیے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے منہ کو اتنے زور سے دبایا کہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بری طرح کراہنے لگی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے رخسار سے خون رسنا شروع ہو گیا ہے تو اس نے اسے چھوڑ دیا اور غصے میں کھولتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی ذہنی حالت عجیب تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ ایک بار

پھر دروازہ لاک ہونے کی منحوس آواز سن رہی تھی۔ یہ کیسی آواز تھی جو سیدھی اس کے دل پر اثر کرتی تھی۔ اس کی دھڑکنیں بتدریج بڑھتی چلی گئیں۔ بازو میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔ منہ خشک ہو رہا تھا بالکل خشک۔ یہاں اسے کس نے پانی پلایا تھا۔ اس نے خود ہی پانی کا گلاس لینے کے لیے سائیڈ ٹیبل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لیکن گلاس اس سائیڈ ٹیبل پر نہیں تھا۔ وہ شاید دوسری سائیڈ ٹیبل پر تھا لیکن بیڈ پر کھسک کر دوسری ٹیبل کی طرف جانا اسے بہت دشوار محسوس ہوا۔ جیسے کوئی طویل سفر ہو۔ وہ وہیں پڑی رہی۔ اس پر ایک بار پھر نقاہت آمیز غنودگی طاری ہونے لگی۔ بے سمت کی تاریکی اس کے دل و دماغ میں گہرائی تک اتر رہی تھی۔ بیداری اور غنودگی کی درمیانی کیفیت میں اس کا تصور اسے کہیں سے کہیں لے گیا۔ وہ ایک خشک ویران گہرے کنویں میں تھی۔ اس میں سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ پھر کسی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اوپر کھینچ لیا۔ اس نے دیکھا۔ تاریک کنویں سے باہر نیلا آسمان ہے، خوشگوار ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ وہ اپنے گھر کے لان میں ہے۔ بچپن لوٹ آیا ہے۔ وہ دس بارہ سالہ لڑکی کے روپ میں ہے۔ اس نے پتلون شرٹ پہن رکھی ہے۔ اس کے ریشمی بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ وہ فیصل سے لڑ جھگڑ رہی ہے۔ امی آواز دیتی ہیں چائے تیار ہے۔ آجاؤ۔ وہ سب لان کی میز کے گرد بیٹھ کر کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔

امی، ابو، باجی، فیصل..... سب کے چہرے بارونق ہیں۔ مسکراہٹیں ہونٹوں سے نکلی پڑ رہی ہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گی۔ میں جوس لوں گی۔ وہ ٹھنک کر کہتی ہے۔ ابو اسے لاڈ سے اپنے ساتھ لگاتے ہیں۔ سر چومتے ہیں۔ ٹھنڈے جوس کا گلاس اس کے ہونٹوں کی طرف بڑھاتے ہیں۔

وہ جیسے تڑپ کر اپنے حواس میں واپس آگئی۔ گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ زبان منہ میں سوکھے چمڑے کا ٹکڑا ہو رہی تھی۔ اس نے اپنے بے جان جسم کو بمشکل دوسری سائیڈ ٹیبل کی طرف بڑھایا۔ یہاں پانی کا گلاس موجود تھا۔ نیم تاریکی میں اس نے گلاس پکڑنا چاہا۔ ہاتھ لگنے سے گلاس پھولدار ٹائیلوں پر گرا اور چکنا چور ہو گیا۔ اس کے سینے میں درد بڑھتا جا رہا تھا۔

O..... ٭ .....O

ہادی کا دل گواہی دے رہا تھا کہ حجاب سخت مصیبت میں ہے۔ اس کے ساتھ کچھ ہونے والا ہے۔ اس نے اس کی حالت دیکھی تھی اور وہ حالت اس کے حافظے پر نقش تھی۔ رات گیارہ بجے کے قریب عطا انکل کا فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ حجاب میلانو میں ہے۔ فیصل نے نیٹ پر اس سے بات کی ہے۔ وہ ٹھیک ہے۔ ایک دو دن بعد وہ پھر بات کرے گی۔

ہادی یہ سب ماننے کو تیار نہیں تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کے ذہن میں بار بار یہی آ رہا تھا کہ حجاب روم میں ہی ہے۔ بہت مشکل میں ہے۔ کوئی ہادی کے دل کو تھی میں لے کر دبا رہا تھا۔ وہ اس والی کوٹھی کی طرف کھینچ رہا تھا۔

اس نے ایک بار پھر ارم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ اس کا فون آف تھا۔ کل شام اس نے بتایا تھا کہ اسے حجاب کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے جب ہادی نے ایک اہم فیصلہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ہاشم ایرک کا نمبر پریس کیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اس سے اس اہم موضوع پر بات کر

رہا تھا۔

وقت تھا رات ایک بج کر چالیس منٹ۔ وہ روم کی ایک نسبتاً سرد رات تھی۔ سڑکیں ٹریفک سے خالی نظر آ رہی تھیں۔ ہادی اور ہاشم ایرک گاڑی پر سوار تیزی سے "ایون ٹینو" کے علاقے میں داخل ہوئے۔ یہ سرکاری گاڑی تھی۔ وہ ایک بڑا جوا کھیلنے جا رہے تھے۔ اگر وریں والی کوٹھی میں حجاب مل جاتی تو اور بات تھی ورنہ وہ ایک بڑی مصیبت میں پھنس سکتے تھے۔ (تاہم حجاب مل جاتی اور ان کے ساتھ آنے سے انکار کر دیتی تو بھی وہ مشکل کا شکار ہو جاتے) ہاشم باقاعدہ یونیفارم میں تھا۔ اس کا ماتحت تھامس بھی ساتھ تھا۔ گاڑی وہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ انہوں نے گاڑی عین وریں والی کوٹھی کے سامنے کھڑی کی۔ تیسری چوتھی بیل پر چھوٹا گیٹ کھلا اور اس میں سے گارڈ نے اپنی صورت دکھائی۔ پولیس کو دیکھ کر وہ الرٹ ہو گیا۔ ہاشم اور ہادی بھی باہر آ گئے ہاشم ایرک نے گارڈ سے کہا۔ "ہمیں گھر کی تلاشی لینا ہے"

"وہ کیوں جناب؟" گارڈ نے بھی انگلش میں پوچھا۔

"کچھ دیر پہلے یہ مسٹر ہادی یہاں آئے تھے۔ یہاں کے اونر جلال الدین سے ملنے کے لیے ابھی انہوں نے کال بیل نہیں دی تھی کہ اندر سے کسی خاتون کے چلانے کی آوازیں آئیں وہ مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ انہوں نے ہمیں رپورٹ کیا ہے۔"

"یہاں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ نہ کوئی خاتون ہے سر۔"

"ہمیں یہ تو دیکھنا ہے کہ خاتون ہے یا نہیں۔" ہاشم ایرک نے اندر داخل ہونا چاہا۔ گارڈ نے راستہ روکا۔

"سر! آپ کے پاس سرچ وارنٹ ہے؟" دوسرے گارڈ نے پوچھا۔

"پیچھے ہٹو۔ یہ ہنگامی صورت حال ہے۔ خاتون کی جان خطرے میں ہے۔"

"آپ مسٹر جلال الدین سے فون پر بات کر لیجیے۔" پہلا گارڈ بولا۔

"ہمیں کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم راستہ دو۔" مگر انڈیل ہاشم ایرک گارڈ کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ تھامس اور ہادی بھی اس کے پیچھے تھے۔ گارڈز بہت جز بز نظر آ رہے تھے لیکن پولیس سے مزاحمت کا مطلب بھی وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

ہاشم ایرک، تھامس اور ہادی نے تیزی سے کوٹھی کو سرچ کرنا شروع کیا۔ نچلی منزل میں گارڈز کے علاوہ ڈرائیور اور خانساماں وغیرہ تھے۔ بالائی منزل پر دو ملازمائیں بھی نظر آئیں۔ نیند سے بیدار ہونے کے بعد وہ ہراساں دکھائی دے رہی تھیں۔ ہادی نے دونوں کو پہچان لیا۔ ان میں سے ایک ہٹی کٹی کلثوم تھی۔ شریفاں کی اطلاع کے مطابق کلثوم یہاں حجاب کی سخت گیر نگران کا کردار ادا کر رہی تھی۔

ہادی کے اشارے پر ہاشم ایرک نے کلثوم کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس نے شور مچانے والی خاتون کے بارے میں پوچھا۔

کلثوم نے صاف انکار کیا اور کہا کہ یہاں ان دونوں کے سوا کوئی عورت موجود نہیں۔ دوسری ملازمہ ناہید بولی۔ "آپ تلاشی لے لیجیے جی۔ پوری کوٹھی آپ کے سامنے ہے۔" ناہید بری بھلی انگلش بول رہی تھی۔

تھامس گارڈز اور ملازمین کے پاس کھڑا رہا۔ وہ کسی کو فون ملانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ ہاشم ایرک اور ہادی ایک بار پھر کوٹھی میں گھومنے لگے۔ پانچ دس منٹ میں انہوں نے چھت سمیت ہر جگہ دیکھ لیا مگر کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔

ہاشم ایرک کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے ہادی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو کوئی نہیں۔"

"یہ ملازمہ کلثوم ضرور کچھ جانتی ہوگی۔ اس پر تھوڑی سی سختی کر کے دیکھا جائے۔"

"نہیں..... یہ میرے اختیار میں نہیں۔ ہم حد سے تجاوز کر جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ ہم زیادہ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتے۔" ہاشم نے قدرے روکھے لہجے میں کہا۔

چار پانچ منٹ بعد وہ پوری طرح مایوس ہو چکے تھے۔ ہاشم ایرک نے اسے اور تھامس کو اشارہ کیا کہ اب چلنا چاہیے۔ وہ سیڑھیاں اتر کر گراؤنڈ فلور پر آ گئے۔ ہادی سب سے پیچھے تھا۔ اس کی بے قرار نگاہیں اب بھی چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل جکڑا جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ باہر نکل آئے۔ ہاشم اور تھامس صحن میں تھے جبکہ ہادی صحن میں پہنچنے والا تھا۔ اچانک اسے ایک مدھم آواز سنائی دی۔ جیسے کسی نے کسی دروازے پر رک کر وہی دستک دی ہو۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ چند لمحے بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔ یہ آواز دستک جیسی ہی تھی۔ ہاشم کو پکارتے ہوئے وہ واپس مڑا اور آواز کی سمت بڑھا۔ آواز ایک چوبی دروازے کے عقب سے آئی تھی۔ یہ دروازہ وہ پہلے بھی کھول کر دیکھ چکے تھے۔ اندرونی لائٹ آن کی۔ مدھم آواز پھر ابھری ہادی کو اندازہ ہوا کہ ایک الماری کی اوٹ میں تنگ سا زینہ بھی ہے جو نیچے اتر رہا ہے۔

"مسٹر ہاشم! ادھر آئیں۔" وہ پکار کر بولا۔

ہاشم دوڑتا ہوا پہنچ گیا۔ آوازیں زینے کے نچلے سرے سے آئی تھیں۔ ہاشم نے اپنا سرکاری پسٹل نکال لیا۔ وہ دونوں تیزی سے زینے اتر کر نیچے پہنچے۔ یہاں ایک بیسمنٹ کا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔

اندر سے اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا بڑی تیزی سے ہوا۔ دروازہ کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہاشم ایرک کو دروازہ ان لاک کرنے کے لیے پسٹل سے تین فائر کرنا پڑے۔ دھماکوں سے در و دیوار گونج اٹھے۔ وہ ایک نیم تاریک نیم سرد بیسمنٹ میں داخل ہوئے۔ ہادی کی حسیات سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ اس نے دیکھا۔ بیسمنٹ کے دروازے کے بالکل پاس حجاب ایک غالیچے پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں تھی۔ بیڈ کے پاس ایک گلاس کے ٹکڑے پڑے تھے اور پانی پھیلا ہوا تھا۔ "حجاب..... حجاب" ہادی نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

ہاشم اور ہادی نے اسے اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کی نبضیں اور سانسیں بہت دھیمی پڑ چکی تھیں۔ ہاشم نے اپنے دونوں ہاتھ بے ہوش حجاب کے سینے پر رکھے اور اسے ابتدائی طبی امداد دینے لگا۔ وہ اس کے دل کو پمپ کر رہا تھا۔ پھر اس نے اسے ماؤتھ ٹو ماؤتھ ہیلپ دی۔ اس دوران میں تھامس نے ایمبولینس کو کال کر دی۔ ہاشم کی کوششیں رنگ لائیں اور حجاب کسمسانے لگی۔ وہ نیم بے ہوشی میں بڑبڑائی۔ "پلیز جلال..... پلیز......

مجھے نکال دیں یہاں سے۔ میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گے۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔"

ہادی نے اس کا ہاتھ تھاما۔ "حوصلہ کرو حب! ہم نکال رہے ہیں تمہیں۔ ابھی نکال رہے ہیں۔"

اس نے ہادی کی آواز سنی ہی نہیں۔ یا سنی تو پہچانی ہی نہیں۔ وہ جلال کو ہی پکارتی رہی۔ "دروازہ کھول دیں جلال! میرا سانس رُک رہا ہے۔ مجھے نکال لیں پلیز۔ میں مر جاؤں گی۔"

اسی دوران میں اوپر کوٹھی کے پورچ کی طرف ایمبولینس کے تیز سائرن سنائی دینے لگے۔ یہ آواز بہ آسانی اس تہہ خانے تک بھی پہنچ رہی تھی۔

حجاب نے بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ جیسے کسی نئے خیال سے ڈر گئی ہو پھر بے ہوشی میں کراہی۔

"......اور...... میرے امی ابو کو کچھ نہ کہنا جلال! میرے بھائی کو کچھ نہ کہنا۔ وہ بڑے کمزور ہیں۔ میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں جلال!"

دو منٹ بعد اسٹریچر بیسمنٹ میں پہنچ گیا۔ ہادی نے حجاب کو اپنی گود میں بھر کر اسٹریچر پر لٹایا۔ وہ لوگ بڑی تیزی کے ساتھ اسٹریچر کو ایمبولینس کی طرف دوڑاتے چلے گئے۔

O......❖......O

حجاب کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ ہسپتال کے سی سی یو میں تھی۔ دس بارہ گھنٹے بیت چکے تھے درجنوں ٹیسٹ ہوئے تھے اور ابھی مزید ہو رہے تھے۔ ہادی اسے دیکھنے کے لیے تڑپ رہا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ وہ ہسپتال نہیں جا سکتا۔ اس کا رابطہ بس عطا انکل سے تھا اور وہ اسے ہر پل کی خبر دے رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے ہارٹ سپیشلسٹ کو بھی بلا لیا تھا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ شدید ترین Anxiety اور گھٹن کا شکار ہونے کے بعد وہ بے ہوش ہوئی ہے اور اس کے دل کا ایک حصہ درست فنکشن نہیں کر رہا۔

ڈاکٹر کسی سرجری کی بات کر رہے تھے۔ کبھی پیس میکر لگائے جانے کا امکان ظاہر کر رہے تھے سب سے بڑا مسئلہ حجاب کے سانس کی بحالی کا تھا۔ اس کی سانس ٹھیک نہیں تھی۔ وہ جیسے اب بھی خود کو اسی بیسمنٹ میں محسوس کرتی تھی اور کھینچ کھینچ کر ہوا اپنے پھیپھڑوں میں لے جاتی تھی اسے اس سنگین ڈس آرڈر سے نکالنے کے لیے سائیکاٹرسٹ کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی تھیں۔ مگر ابھی تک بے سود تھا۔

عطا انکل کے مطابق جلال بھی میلانو سے روم پہنچ چکا تھا۔ اسے پولیس نے پوچھ گچھ کے لیے بلایا تھا۔ وہ دو تین گھنٹے پولیس اسٹیشن رہنے کے بعد فی الحال واپس آ گیا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ حجاب اس کی منکوحہ ہے اور وہ اپنی مرضی و رضا سے اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ چونکہ وہ آج کل بہت ڈپریشن میں تھی اور بالکل خاموش اور پُرسکون جگہ پر رہنا چاہ رہی تھی اس لیے اپنی مرضی سے بیسمنٹ میں شفٹ ہو گئی تھی۔ اس کے ہاتھ کی چوٹ کو بھی جلال نے حادثاتی قرار دیا تھا۔ لیکن حقیقت کیا ہے یہ سب کو نظر آ رہا تھا۔

ہادی کو حجاب کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ ہر طرف بس وہی تھی۔ اس نے حسن و عشق کے ان گنت پہلوؤں کو اپنے ہزار ہا شعروں میں نظم کیا تھا۔ لیکن یہ کبھی نہ سوچا تھا کہ ایک دن وہ خود بھی کہانیوں جیسے بے پناہ عشق کی زد میں آ

جائے گا۔ اس نے دیو مالائی کہانیوں میں پڑھا تھا کہ عشق سمندر میں ڈوب جانے والے کسی اور ہی روپ میں ڈھل جاتے ہیں وہ اپنے محبوب کے نام کی تسبیح پھیرتے ہیں اور جنگلوں میں نکل جاتے ہیں۔ اس نے تسبیح تو نہیں پھیری تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ آتی جاتی ہر سانس کے ساتھ حجاب کا نام بھی اس کے سینے میں داخل ہوتا اور نکلتا تھا۔

وہ جاگتا تو سب سے پہلے اسی کا خیال ذہن میں آتا۔ اس کے ذہن میں ہر وقت وہی بیسمنٹ کے اور ایمبولینس کے مناظر گھومتے رہتے تھے۔ پچھلے چند ہفتوں میں حجاب نے اس بیسمنٹ میں جو کچھ جھیلا وہ ناقابلِ بیان تھا۔ اس کے والد نے اسے اپنے سسرال واپس جانے کا حکم دیا اور وہ چلی گئی۔ اپنی جان پر ہزار ہا مصیبتیں جھیل لیں لیکن وہاں سے ہلی نہیں۔ یہاں تک کہ موت کے سایوں نے اسے ڈھانپنا شروع کر دیا۔ وہ شبنم تھی اور دھوپ کی زد میں آ گئی۔ پھول تھی اور لُو میں جھلس گئی۔ وہی نظم اور تمہیں معلوم ہے کاسابیانکا کون تھا۔ کاسابیانکا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ وہ بحری جہاز کے آفیسر کا لختِ جگر تھا اور جب ویران پانیوں میں انگریزوں نے حملہ کیا۔ جب جہاز کو آگ لگی اور ہر طرف تہلکہ مچا تو باپ نے کاسابیانکا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا۔ "کاسابیانکا! یہاں کھڑے رہنا جب تک میں نہ کہوں۔"

ایک روز عطا انکل کا فون آیا۔ انہوں نے کہا۔ "ہادی! ڈاکٹر بڑے پریشان ہیں حجاب کی بیماری انہیں اُلجھا رہی ہے۔ وہ دس بارہ گھنٹوں کے لیے بہتر ہو جاتی ہے لیکن پھر طبیعت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ سانس کی تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے جہاں تک میں سمجھا ہوں اس کی تکلیف نہ صرف کارڈیک (قلبی) ہے بلکہ سائیکولوجیکل بھی ہے۔ دونوں طرح کے مسائل اس طرح اُلجھ گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔"

"سائیکاٹرسٹ کیا کہتے ہیں؟"

"انڈیا کا ایک معروف سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر سرفراز مسلسل حجاب سے کونسلنگ کر رہا ہے۔ کل بھی حجاب سے اس کی ایک لمبی نشست ہوئی ہے۔ وہ آزاد گفتگو کے ذریعے اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ درحقیقت ان ذہنی اذیتوں میں حجاب نے جلال کا استبداد برداشت کیا ہے کہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہے۔ چھوٹی بڑی باتیں اس کے ذہن میں سوئیوں کی طرح گڑی ہوئی ہیں۔ وہ خود کو اب بھی جلال کے شکنجے میں سمجھ رہی ہے۔ کبھی کبھی ایک ڈری سہمی چھوٹی سی بچی کی طرح سوچنے لگتی ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔ اسے اور اس کے گھر والوں کو عدالتوں میں گھسیٹے گا۔ ڈاکٹر سرفراز تو یہ کہہ رہے تھے کہ اگر یہ طلاق والا عمل جلد مکمل ہو جائے اور حجاب کو یقین ہو جائے کہ وہ جلال سے آزاد ہو چکی ہے تو اس کی حالت سنبھل سکتی ہے۔"

"اس سلسلے میں آپ نے انکل فیاض وغیرہ سے بات کی ہے؟"

"ہاں...... بلکہ میں اور فیاض نے اکٹھے ہی جلال سے ملاقات کی تھی۔ دو ٹوک باتیں ہوئی ہیں۔ وہ پس و پیش سے کام لے رہا ہے۔"

"اب پس و پیش کیوں؟" ہادی نے تڑخ کر کہا۔ "اب وہ حجاب کو کس طرح زبردستی ساتھ رکھ سکتا ہے۔"

"ہاں...... اس کی پوزیشن تو اب بہت کمزور ہے۔ مگر اپنی اوقات ظاہر کر رہا ہے۔ عدالتی کارروائی سے ڈرانے

کی کوشش کر رہا ہے۔ مگر یہ چل نہیں سکے گا۔ میں اور فیاض کل اِیڈوو کیٹ سے بھی بات کر رہے ہیں۔"

ہادی کے ذہن میں شعلے سے بھڑک رہے تھے۔ وہ ایک تخلیق کار تھا۔ اس نے کبھی چیونٹی بھی نہیں ماری تھی۔ لیکن آج..... آج پتا نہیں کیوں اسے لگ رہا تھا کہ وہ جلال کو جان سے مار سکتا ہے۔

اس نے رات کا بیشتر حصہ ہوٹل کی راہداریوں میں بے قراری سے گھومتے ہوئے گزارا جلال کی صورت روبرو کرنگاہوں میں گھومتی تھی۔ اس نے رات دو بجے گلزاری کو فون کیا۔ وہ یقیناً کسی نائٹ کلب میں ہی تھا اور اپنے ناٹے قد کے ساتھ کسی دراز قد لڑکی کی تلاش میں تھا۔ ہادی کو پتا تھا کہ دراز قد لڑکیاں اس کا کریز ہیں۔

ہادی نے کہا۔ "گلزاری! ایک کام آن پڑا ہے تم سے۔"

"جناب! آپ تمہید نہ باندھا کریں۔ بے دھڑک حکم دیا کریں۔ آپ کا خادم ہر وقت حاضر جناب کہنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔"

"ایک چیز مہیا کرنی ہے۔"

"فرمائیں جناب!"

"فون پر نہیں۔ اسی ریستوران میں پہنچو۔ ابھی اسی وقت۔" ہادی نے کہا۔

O..... ❖ .....O

اس واقعے کے ٹھیک دس گھنٹے بعد ہادی، جلال شاپنگ سنٹر کے سامنے موجود تھا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی تھی، ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہادی نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔ چہرے کا کچھ حصہ مفلر میں چھپا ہوا تھا۔ وہ شاپنگ سنٹر میں داخل ہوا اور سیدھا اس پورشن کی طرف بڑھا جہاں جلال الدین کا شاندار آفس واقع تھا۔ آفس کے بالکل قریب پہنچا تو یکے بعد دیگرے دو گارڈز نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ وہ ان کو دھکیلتا ہوا اور دندناتا ہوا جلال کے آفس میں داخل ہو گیا۔ جلال ایک وسیع و عریض میز کے عقب میں موجود تھا۔ اس کا فربہ اندام بھائی ظہیر الدین بھی ساتھ بیٹھا تھا۔ شاید کسی معاملے پر بحث ہو رہی تھی۔ وہ دونوں اس طرح ہادی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ خاص طور سے جلال کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

جلال اور ہادی چند سیکنڈ تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ گارڈز ہادی کی دونوں جانب موجود تھے اور اگلے حکم کے لیے جلال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جلال کے ایک اشارے پر وہ اس پر جھپٹ سکتے تھے اور ایک ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ جلال نے اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے اور گارڈز کو باہر جانے کا حکم دیا۔

"میں تم سے بالکل اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" ہادی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

ایک توقف کے بعد جلال نے ظہیر الدین اور ایک سیکرٹری ٹائپ لڑکی کو بھی باہر جانے کی ہدایت کی۔ وہ دونوں آفس میں تنہا رہ گئے۔

ہادی، جلال کے عین سامنے جا کھڑا ہوا۔ جلال اب سنبھل گیا تھا اور اس کی آنکھوں سے سرخی جھلکنے لگی تھی۔ ہادی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔ "تمہیں ایک کام کرنا ہو گا جلال! حجاب کو طلاق کے کاغذوں پر دستخط کرنے ہوں گے۔ ابھی اسی وقت۔"

"تم مجھے حکم دینے والے کون ہوتے ہو۔" وہ پھنکارا۔

"میں وہ ہوں جو آج..... ابھی..... اسی جگہ..... تمہیں قتل کر سکتا ہے اور قتل ہو بھی سکتا ہے۔" ہادی نے خونخوار انداز میں کہا۔

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ آفس کے در و دیوار میں ایک پُرہول گونج پیدا ہوئی اور اس گونج نے جلال جیسے دبنگ بندے کو بھی بنیادوں سے ہلا دیا اور تو اور اپنے لہجے کے آہنگ پر وہ خود بھی حیران ہوا۔ کہاں سے آئی تھی یہ بے پناہ توانائی، کہاں سے آیا تھا یہ بے اماں دبدبہ، یہ محبت کی دین تھا۔ یہ عشق کا معجزہ تھا۔ وہ تو ایک شاعر تھا۔ ایک خاموش طبع نرم خو شخص، اس نے زندگی میں کسی سے جھگڑا نہیں کیا تھا۔ لیکن آج وہ بولا تھا تو اس کی آواز میں منہ زور طوفانوں اور بھرے سمندروں کی وحشتیں سمٹ آئی تھیں۔ جلال اس کو دیکھتا رہ گیا۔ پھر وہ نیچے جھکا۔ ہادی کو اندازہ ہوا کہ کسی کو بلانے کے لیے کال بیل کا بٹن دبانا چاہتا ہے۔ ہادی نے جیب میں سے بھرا ہوا پستول نکالا اور بے دریغ جلال کی چوڑی چکلی چھاتی پر رکھ دیا۔ عین دل کے مقام پر (یہ پستول گلزاری نے فراہم کیا تھا۔)

"جلال! میں تجھے کہہ رہا ہوں۔ میں مار دوں گا تجھے۔ ابھی اسی وقت، اس قالین پر تیری لاش گرے گی۔ ابھی اسی وقت۔" وہ جنونی انداز میں بولا۔

جلال کا رنگ بالکل ہلدی ہو گیا۔ وہ ڈرنے والا شخص نہیں تھا مگر ہادی کا لہجہ پتھر کو پانی کر دینے والا تھا۔ اس نے پستول کو دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ "تم بھی بچ نہیں سکو گے۔" جلال کمزور آواز میں بولا۔

"میں بچنا چاہتا بھی نہیں ہوں۔ بالکل تیار ہو کر آیا ہوں۔ مجھے پتا ہے ہم دونوں کی لاشیں گریں گی۔ لیکن پہلے تیری لاش گرے گی۔ پہلے تیری گرے گی۔" ہادی وحشی لہجے میں پھنکارا اور پستول والا ہاتھ اتنے زور سے جلال کی گردن پر مارا کہ وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرایا اور دم بخود ہو گیا۔ اس کا پتا پانی ہو چکا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ اگلے چند سیکنڈ میں وہی ہو گا جو ہادی کہہ رہا ہے۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے سیاہ پستول کے خم دار ٹریگر پر رکھی ہوئی انگلی کو دیکھا اور اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے تاثرات گواہی دے رہے تھے کہ اس نے شکست تسلیم کر لی ہے۔

O..... ❖ .....O

حجاب آزاد ہو چکی تھی۔ طلاق کا پراسس مکمل ہو گیا تھا۔ کاغذات اسے مل چکے تھے۔ اس آزادی نے اس کی صحت پر مثبت اثرات ڈالے۔ وہ پہلے سے بہتر دکھنے لگی لیکن جو روگ دل کو لگ گیا تھا وہ اتنی آسانی سے جانے والا تو نہیں تھا۔ قید و بند کے شب و روز اس کے قلبی اور عصبی نظام کو بے طرح متاثر کر چکے تھے کئی موقعوں پر تو ڈاکٹر بھی الجھن کا شکار ہو جاتے تھے۔ اس کی بیماری بڑی پیچیدہ تھی اور مہلک بھی۔ عام طور پر جوان عمری میں ہارٹ اٹیک اور دل کی دیگر شدید بیماریاں نہیں ہوتیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے کیسوں کی شرح بڑھ رہی ہے۔

کبھی کبھی دو چار دن کے لیے وہ بالکل ٹھیک بھی ہو جاتی تھی مگر پھر بیماری کا حملہ ہوتا تھا دل کے فنکشنز متاثر ہوتے تھے اور سانس کی آمد و رفت بُری طرح بگڑ جاتی تھی ایک دن ڈاکٹر عطا انکل کی زبانی ہی ہادی کو معلوم ہوا کہ

اس کے ہارٹ کے الیکٹرانک سسٹم کو کمپوز کرنے کے لیے اس کے سینے کی جلد میں جو پیس میکر لگایا گیا تھا وہ اُتار دیا گیا ہے اور وہ پہلے سے بہتر محسوس کر رہی ہے۔ مگر یہ بہتری کب تک رہے گی ڈاکٹر یقین سے کچھ نہیں کہہ پاتے۔

ہادی کے قیام میں اطالین ایمبیسی نے جو ہنگامی توسیع کی تھی وہ بھی اب ختم ہونے والی تھی۔ اس کے متبادل کاغذات تیار ہو چکے تھے۔ اب اسے ہر صورت میں اٹلی کو چھوڑنا تھا اور روم سے جانا تھا۔ وہ جانے سے پہلے صرف ایک بار حجاب کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک دن اس نے عطا انکل سے اس خواہش کا اظہار کیا۔ عطا انکل سے اب وہ بے تکلف گفتگو کر لیتا تھا۔ عطا انکل بھی ہادی کے دل کے معاملات کو کافی حد تک جان چکے تھے۔ اس سچی محبت کی خوشبو انہوں نے بڑی وضاحت سے محسوس کر لی تھی جو ہادی کے دل میں حجاب کے لیے موجود تھی۔ وہی محبت جو ہر مصلحت ہر صورت حال سے بالاتر ہوتی ہے۔ وہ اب ان سے کبھی کبھی بالکل دوستانہ لہجے میں بات کر لیتا تھا۔ اس نے جب عطا صاحب کو بتایا کہ وہ جانے سے پہلے ایک بار حجاب کو دیکھنا چاہتا ہے تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ وہ انکار نہیں کر رہے تھے۔ کچھ سوچنا چاہتے تھے۔

وہ جنوری کی ایک سرد رات تھی۔ روم کا درجہ حرارت دو تین ڈگری سے زیادہ نہیں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ عطا صاحب کا فون آیا۔ آج رات بارہ بجے بعد حجاب کے پاس ہسپتال میں صرف میں ہوں گا۔ تم بارہ بجے کے بعد جب آنا چاہو، آ سکتے ہو لیکن بہتر یہ ہے کہ حجاب کے سامنے نہ آؤ۔

''نہیں انکل! آپ بے فکر رہیں۔ میں بس دور ہی سے دیکھ لوں گا۔''

وہ ہسپتال پہنچا تھا۔ اور اس نے حجاب کو دور سے دیکھا تھا، ایک کھڑکی میں سے۔ وہ سفید بستر پر جیسے سمٹی لیٹی تھی۔ کسی اُجلے اُجلے راج ہنس کی طرح۔ پیشانی کی چمک ماند تھی مگر بالکل اوجھل نہیں تھی۔ رخسار پر اب خراش کا نشان سا رہ گیا تھا۔ ہلکے رنگوں سے بنائی گئی وہ ایک نازک تصویر نظر آتی تھی اور ہادی اب واپس جا رہا تھا۔ اپنے دل کی بات دل میں لیے۔ اسے بتائے بغیر کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ ایسی محبت کہ جس کو لفظوں میں بیان کرنا اس جیسے قلم کار کے لیے بھی ممکن نہیں۔ وہ اپنی ساری توانائیاں جمع کر کے لفظوں کے انبار بھی لگا دیتا تو اس محبت کی نیم کا حق بھی ادا نہ کر پاتا۔ وہ محبت کی اس حسین مورتی کے سامنے کسی پجاری کی طرح لب بستہ کھڑا رہا۔ دیکھتا رہا اور پھر پیچھے ہٹ گیا۔ کیا یہ اس کا آخری خراج عقیدت ہے۔ کیا اب وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ اس نے سوچا اور اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

کچھ دیر بعد عطا انکل بھی خاموشی سے اُٹھ کر باہر آ گئے۔ ہادی نے سرگوشی میں کہا۔ ''انکل! آپ نے کھڑکیاں اور دروازے کھلے کیوں رکھ چھوڑے ہیں۔ میں تو کھڑکی کے شیشے میں سے بھی دیکھ سکتا تھا۔''

''اس کی وجہ تم نہیں ہو۔'' عطا انکل نے کہا۔ ''یہ ویسے ہی کھڑکیاں دروازے بند نہیں کرنے دیتی۔ اسے وحشت ہونے لگتی ہے۔ یہ اسی سختی کا نتیجہ ہے جو جلال نے اس پر روا رکھی ہے۔''

ہادی ایک آہ کھینچ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رُک سکتا۔ عطا انکل کے تاثرات سے بھی یہی ظاہر تھا۔ کسی وقت کوئی یہاں آ سکتا تھا۔

ہادی نے ایک الوداعی نظر سوئی ہوئی حجاب پر ڈالی۔ تصوری تصور میں اس کے ہاتھ کو چھوا اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور پلٹ گیا۔ اس کے دل میں نیک تمناؤں اور دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

O.....❖.....O

ہادی اب پاکستان میں تھا۔ لاہور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ جو سیر و تفریح کے لیے پاکستان سے نکلا تھا کتنا بڑا گھاؤ لے کر واپس آیا ہے۔

اب پھر وہی شب و روز تھے۔ وہی معمولات، وہی روزمرہ کے مسائل، وہی شیخو بھائی کی Do More کی باتیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں اور پریشانیاں۔ فرق صرف ایک تھا۔ اب ہادی کا قلم روانی سے چل رہا تھا۔ وہ لکھ رہا تھا اور مسلسل لکھ رہا تھا۔ وہ بہت کچھ روم میں چھوڑ آیا تھا لیکن وہاں سے قلم لے آیا تھا اور قلم کی روانی لے آیا تھا اور یہ روانی موتی بکھیر رہی تھی۔ تخلیق کے خشک ہو جانے والے سوتے اب تازہ پانیوں کو اچھال دے رہے تھے۔ ایک درد تھا۔ ایک کرب تھا..... ایک ٹیس تھی، جو شب و روز چبھتی تھی اور اس کو لکھنے پر ابھارتی تھی اور وہ لکھتا تھا کسی کی حسین مسکراہٹ کے قصیدے، روشن پیشانی کے نغمے، نچلا ہونٹ ہولے سے دانتوں دبانے کی ادا..... اور اس ادا کی سحر کاریاں اور وہ ہزاروں میل دور بیٹھی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے کبھی کچھ خبر نہ ہوتی تھی۔ کبھی منیر نیازی کے خوبصورت الفاظ دکھ کی لہر بن کر اس کے کانوں میں گونجنے لگتے۔ پہلی بات ہی آخری تھی۔ اس سے آگے بڑھی نہیں۔ ڈری ڈری سی ایک بیل تھی جیسے دیوار پہ پوری چڑھی نہیں۔

گاہے بگاہے عطا انکل سے انٹرنیٹ پر یا فون پر اس کا رابطہ ہو جاتا تھا۔ حجاب کی حالت جوں کی توں تھی۔ کبھی چند دنوں کے لیے سنبھل جاتی لیکن پھر بیماری کا ایک دورانیہ آ جاتا جو چند گھنٹے یا دو تین دن جاری رہتا۔ انکل فیاض فیملی اب اسے سرحد پار آسٹریا لے جانے کا سوچ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں اس کا بہتر علاج ہو پائے گا۔ اس کی نفسیاتی ٹریٹمنٹ بھی بدستور جاری تھی۔ حجاب کی والدہ کی صحت کے حوالے سے اچھی اطلاعات تھیں۔

ہادی کی کوشش سے گجرات میں انکل فیاض کے پلاٹ کا ایک اچھا گاہک مل گیا تھا۔ پلاٹ کا مختار نامہ گجرات میں انکل فیاض کے ایک بھائی کے پاس تھا، لہٰذا رجسٹری وغیرہ میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ ہادی نے اس گاہک کا رابطہ براہ راست عطا انکل سے کروا دیا اور خود بیچ میں سے نکل گیا۔

حجاب کی صحت کی صورت حال کے علاوہ بھی روم سے چیدہ چیدہ خبریں عطا انکل کی زبانی ہادی تک پہنچتی رہتی تھیں۔ ظہیر الدین کا اپنے بڑے بھائی جلال الدین سے تنازعہ ہوا تھا اور وہ علیحدہ گھر خرید رہا تھا۔ اب اگلا قدم شاید کاروبار کی علیحدگی کا تھا۔

چند روز بعد ہادی کو جلال کے حوالے سے ایک اور اہم خبر ملی۔ پتا چلا کہ جلال اور اس کی نو بیاہتا ارم میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں جو دن بدن شدت پکڑ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جلال نے ارم سے مار پیٹ بھی کی ہے۔ اس کا سبب کوئی ایسا انکشاف بتایا جا رہا تھا جو حال ہی میں جلال پر ہوا تھا۔ ہادی کو پریشانی لاحق ہو گئی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہاں گلزاری نے اپنے وعدے کی خلاف ورزی کی ہو۔

ہادی نے اسے منہ مانگی قیمت دی تھی اور ساتھ ساتھ اسے پابند بھی کیا تھا کہ اب وہ ارم کے ابارشن والے معاملے کو ارم کے خلاف ہرگز ہرگز استعمال نہیں کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو پھر ناجائز پسٹل والا وہ کیس فوراً کھل جائے گا جو ہاشم ایبک کے پاس التوا میں پڑا ہے۔ (وہ پسٹل بھی ابھی تک ہاشم کے پاس تھا اور فون پر بنائی گئی وہ وڈیو بھی جس میں گلزاری نے پسٹل کی ملکیت کا اعتراف کیا تھا۔)

ہادی نے اگلے روز روم میں گلزاری سے رابطہ کیا اور اس سے بازپرس کی۔ اس نے قسمیں کھا کر کہا کہ اس نے اس سلسلے میں اپنی زبان بالکل بند رکھی ہوئی ہے اور ہمیشہ رکھے گا۔ اس نے ہادی کو بتایا۔ "جناب! میری معلومات کے مطابق ارم اور جلال کے اختلافات کسی اور وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس جھگڑے کی بنیاد کوئی فون کال بنی ہے جو ارم کرسمس کی رات اپنے کسی جانے والے کو کر رہی تھی۔ اس کی آواز جلال کے کانوں تک پہنچ گئی تھی اور معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ یہ باتیں ایک ملازمہ کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں۔"

ہادی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اسے وہ آخری فون کال یاد آئی جو ارم نے اسے کی تھی۔ وہ اس وقت آور دوا کے زیر اثر لگتی تھی۔ ایک دم اونچی آواز میں بولنے لگی تھی۔ خود ہادی بھی حیران ہوا تھا۔ یقیناً یہی وہ فون کال تھی جس کا ذکر اب گلزاری کر رہا تھا۔ ہادی سوچنے لگا تو کیا اسی کو مکافات عمل کہتے ہیں۔ ہادی، ارم کو اسی کے بلکوں میں جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے روم میں ارم کو یقین دلایا تھا کہ حجاب، جلال کے شکنجے سے نکل آئی تو وہ ابارشن والے معاملے کو بنیاد بنا کر ارم کو کسی کام پر مجبور نہیں کرے گا اور نہ کسی دوسرے کو ایسا کرنے دے گا اور وہ وعدے کا پاس کرنے والا بندہ تھا۔ ارم اب کسی اور کی نہیں اپنی غلطی کی وجہ سے مصیبتوں کا شکار ہو رہی تھی۔

اسی حوالے سے چار پانچ روز بعد ایک اور خبر ہادی کو ملی۔ یہ خبر عطا انکل نے ہی پہنچائی تھی۔ اور یہ کافی خبر تھی۔ عطا انکل نے فون پر بتایا۔ "جلال! جیل میں ہے۔"

"وہ کیسے؟" ہادی حیران رہ گیا۔

"اس نے ارم سے مار پیٹ کی ہے۔ ارم کا جبڑا ٹوٹ گیا ہے۔ ہسپتال میں Pins وغیرہ لگا کر اس کی ہڈی جوڑی گئی ہے۔ اس نے جلال پر کیس کرا دیا ہے۔ اب وہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں ہے۔ لگتا ہے کہ ایک ڈیڑھ سال کی سزا تو اسے ضرور ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ ہو جائے۔ اس کا سابقہ ریکارڈ بھی اسے مشکل میں ڈالے گا۔ حجاب کے ساتھ اس کا سلوک اور اسے مسلسل بند رکھنے کا واقعہ بھی پولیس کے ریکارڈ پر ہے۔"

جلال کو اس کے کرموں کی سزا مل رہی ہے۔ اس نے مذہب کو موم کی ناک بنا رکھا تھا، اور اسے اپنے مطلب کی سمت موڑتا تھا ورنہ اس کی فطرت اپنے بڑے بھائی فیروز سے کچھ مختلف نہیں تھی۔ لفافے دو تھے، اندر مضمون ایک ہی تھا۔

بینش کو مار کر فیروز تو سخت سزا سے بچ گیا تھا مگر اب لگ رہا تھا کہ جلال آسانی سے نہیں چھوٹ سکے گا۔ یہ کافی اہم خبریں تھیں لیکن ہادی کے لیے اتنی اہم نہیں تھیں۔ اس کے دل و دماغ میں تو بس ایک ہی لہر چل رہی تھی۔ ایک ہی خیال...... ایک ہی فکر...... ایک ہی دعا...... ایک ہی آس...... وہ ٹھیک ہو جائے...... وہ جی اٹھے۔

پیشانی کا چاند چمک جائے۔ ہونٹوں کے پھول کھل جائیں اور پھر وینس کی کسی اور جھمگاتی رات میں، وہ ویسے ہی کسی خوش رنگ روشنی کی طرح جھلملائے۔ ہواؤں میں تیرے، پانیوں کو کہکشاں بنائے۔

اور وہ ٹھیک نہیں ہو رہی تھی۔ انکل فیاض اور فیصل اسے لے کر وینس چلے گئے تھے۔ وہاں عطا انکل نے اپنے تعلقات استعمال کرتے ہوئے اسے ایک نیم پرائیویٹ ہسپتال میں داخل کرا دیا تھا کہا جا رہا تھا کہ اس امریکن ہسپتال میں حجاب کو بہترین طبی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں اور اگر خدانخواستہ ضرورت پڑی تو اسے اسی ہسپتال سے آسٹریا یا پھر امریکہ بھی شفٹ کیا جا سکے گا۔

ایک روز ایک ایسا فون آیا جس نے اسے حیران کر دیا۔ یہ اٹلی سے حجاب کے بھائی فیصل کا فون تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے فوراً بعد اس نے کہا۔ "میں آپ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں ہادی صاحب!"

"کس بات کی؟"

"میں نے ریستوران میں آپ سے بدتمیزی سے بات کی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اصل میں باتوں کے بتنگڑ بنا دیے گئے تھے۔ ایک عجیب سا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ میں بہت زیادہ ڈپریس تھا۔ مجھے کم از کم باجی کے ساتھ تفصیل سے بات کر لینی چاہیے تھی۔"

"ہاں فیصل! مجھے بھی یہی افسوس تھا۔ تم اگر ٹھنڈے دماغ کے ساتھ حجاب سے بات کر لیتے تو بہت کچھ واضح ہو جاتا۔ وہ بہت پاک صاف سوچ کی مالک ہیں فیصل! بہت آنسٹ اور سچی۔ مجھ سے وہ تصویر والی غلطی ضرور ہوئی لیکن اس کے علاوہ ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہے ہیں۔ بہرحال فیصل! مجھے اپنے اوپر بھی بے حد افسوس ہے میں نے بھی ریستوران میں تم سے غلط رویہ اختیار کیا۔"

"نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔"

"بات تھی فیصل! میں نے تمہیں اور انکل فیاض کو بے حسی کے طعنے دیئے۔ مجھے شکوہ تھا کہ آپ کی طرف سے وہ کوششیں نہیں ہو رہیں جو ہونی چاہئیں تھیں۔ راستے میں عطا انکل نے مجھے بتایا کہ آپ لوگوں نے حجاب کی خاطر اپنے سر کی چھت تک فروخت کر دی ہے۔ آئی ایم ریئلی ویری سوری فیصل۔"

"مینشن ناٹ ہادی صاحب! آپ کی طرف سے بہت اچھا بھی تو ہوا ہے۔ جو کام میرے کرنے والا تھا وہ آپ نے کیا۔ پاکستان آنے سے پہلے آپ جلال سے ملے۔ اس کو راہ راست پر لائے۔ اسے پیپرز پر سائن کے لیے آمادہ کیا۔ مجھے تین چار روز بعد ہی اس واقعے کا پتا چل گیا تھا۔ میں اس کے لیے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

"وہ مجھے ایک اچھا دوست سمجھتی ہیں اور میں نے اسی دوستی کا تھوڑا سا معمولی سا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔" پھر وہ موضوع بدل کر بولا۔ "اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"دو تین دن سے کافی بہتر ہیں۔ لیکن اب پتا نہیں پھر کیوں کچھ گھنٹے یا دن اچھے اور چلے گی۔ بس ہر وقت ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ تین چار روز تک ایک سینئر سرجن ڈاکٹر بھی فلورنس سے یہاں آ رہا ہے۔ وہ بھی باجی کا معائنہ کرے گا۔" فیصل کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

ہادی نے اس سے تسلی تشفی کی باتیں کیں۔

فیصل کے فون کے بعد ہادی کو اپنے دل کے بے پناہ بوجھ میں کچھ بوجھ اترا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی باتوں سے صاف پتا چلتا تھا کہ حجاب سے اس کی ایک طویل نشست ہوئی ہے۔ اور اس نے اس کی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ سب نفو باتیں تھیں۔ انٹرنیٹ پر ہادی اور حجاب کے پرانے رابطے، ہادی کا حجاب سے ملنے کے لیے اٹلی آنا۔ وینس کے ہوٹل میں حجاب کے ساتھ رہنا اور پتا نہیں کیا کچھ۔ جلال سے ہادی کی فیصلہ کن ملاقات والے واقعے نے بھی فیصل کو متاثر کیا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے بس اتنا ہی معلوم ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر عطا اور ہادی نے مل کر حجاب کے لیے جو تگ و دو کی تھی وہ اسے معلوم نہیں تھی۔ اور ہادی کے خیال میں یہ اچھا ہی تھا۔

○ ● ○

وہ فروری کی ایک ٹھنڈی شام تھی۔ مقامی ہوٹل میں ایک شاندار تقریب ہو رہی تھی یہ ہادی کے گیتوں اور نظموں کی کتاب "بے نوا" کی رونمائی کی تقریب تھی۔ اس تقریب کی ساری فنانسنگ شیخو بھائی نے کی تھی۔ معززین شہر جمع تھے۔ کیمروں کی فلش لائٹس چمک رہی تھیں۔ ہر طرف گہما گہمی تھی۔ پچھلے چند سالوں میں بطور گیت نگار ہادی کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہوا تھا۔ اسے خوشی سے پھولا نہیں سمانا چاہیے تھا مگر وہ اس رنگا رنگ تقریب میں بھی بالکل اُداس اور کھویا ہوا تھا۔ جیسے اسے زبردستی پکڑ کر یہاں بٹھایا گیا ہو۔ اس کی سوچوں کے ہر دھارے کا رُخ حجاب کی طرف تھا۔ پچھلے کئی دن سے حجاب کی طبیعت اچھی نہیں چل رہی تھی۔

تقریب اختتامی مراحل میں تھی جب ہادی کے فون پر ڈاکٹر عطا کی کال آئی۔ ان کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "ہادی! اس کی حالت اچھی نہیں۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہے۔"

یہ فقرہ نہیں ایک بارودی دھماکہ تھا جس نے ہادی کے دل و دماغ کو اُڑا کر رکھ دیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شیخو بھائی نے اپنے مخصوص لہجے میں پوچھا۔ "کی ہویا اے لالے دی جان؟"

"میں جا رہا ہوں۔ حجاب کی طبیعت بہت خراب ہے۔" اس نے سرگوشی کی اور تقریب چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔

سات آٹھ دن پہلے ہی اس کے پاسپورٹ پر نیا "شین جین" ویزا لگا تھا۔ اسے صرف ٹکٹ کی ضرورت تھی۔ شیخو بھائی نے بھاگ دوڑ کر کے سارا انتظام کر دیا۔ اس نے اپنی والدہ اور بھائی کو صورت حال سے آگاہ کر کے جانے کی اجازت لی اور اگلے روز رات کو اٹلی کے لیے پرواز کر گیا۔

دوران پرواز اس کا دل مسلسل کسی بے رحم مٹھی میں جکڑا رہا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں اور سینے میں ایسا غبار تھا جو اس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ بالکل جیسے حجاب کا دم گھٹتا تھا اور وہ بالکل زرد ہو جاتی تھی۔ اس نے اسے کیوں بلایا تھا۔ یہ سوال بھی بار بار ہادی کے ذہن میں اُبھرتا اور ڈوبتا تھا۔

جس وقت ہادی مارکو پولو ایئرپورٹ پر اترنے کے بعد ایک انڈین سردار کی ٹیکسی میں وینس پہنچا رات کے نو بج چکے تھے۔ ویسی ہی جگمگاتی رات جب ہادی اور حجاب پہلی بار ایک سڑک پر ملے تھے۔ لیکن آج سارے منظر دھندلے

ہوئے تھے۔ ہر روشنی جیسے سسکیاں بھر رہی تھی اور ان ہزار ہا روشنیوں کے آنسو آبی گزرگاہوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ حجاب کی حالت ایسی تھی کہ عطا انکل اسے لینے کے لیے ایئرپورٹ بھی نہیں آ سکے تھے۔ وینس پہنچنے کے بعد فون پر عطا انکل سے رابطہ ہوا۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں ہسپتال کا ایڈریس اور کمرے کا نمبر وغیرہ بتایا۔

ہادی ہسپتال پہنچا۔ اس کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آ جانا چاہتا تھا۔ اس نے پتا نہیں حجاب کو کس حالت میں دیکھنا تھا۔ کوریڈور میں اس کی نگاہ عطا انکل پر پڑی۔ ان کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ ایک طرف فیصل دیوار کے سہارے خاموش کھڑا نظر آیا۔ اس کا چہرہ بھی دُکھ کی آماجگاہ تھا۔ انکل فیاض ایک کونے میں جائے نماز بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔

عطا انکل نے ہادی کو گلے سے لگایا۔ "انکل کیسی ہے حجاب؟"

"خود دیکھ لو۔" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ہسپتال کا براؤن حفاظتی لباس پہن کر اور ماسک لگا کر وہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے کی کھڑکیاں بھی حجاب کی وجہ سے کھلی رکھی گئی تھیں۔ ہادی کے تصور میں تھا کہ وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور رنگ ہلدی جیسا۔ لیکن اس کی ظاہری شکل وصورت میں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آیا۔ ہاں چہرے کا رنگ گواہی دیتا تھا کہ اس کی حالت بہت اچھی نہیں۔ وہ ہلکے سبز بستر پر نیم دراز تھی۔ بازو میں دو ڈرپس لگی تھیں۔ سرہانے کی طرف ہارٹ ریٹ مانیٹر اور دیگر ہیلتھ ڈیوائسز رکھے تھے۔ آکسیجن ماسک جو شاید کچھ دیر پہلے اس کے منہ پر تھا ایک طرف پڑا تھا۔

عطا صاحب نے اسے ہادی کے آنے کی اطلاع پہلے ہی دے دی تھی۔ اس لیے وہ کچھ زیادہ حیران نہیں ہوئی۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے یک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ ہادی اس کے قریب کرسی پر جا بیٹھا۔ "ہیلو حجاب!"

"ہیلو ہادی! کیسے ہیں آپ؟" اس نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں اور اللہ نے چاہا تو آپ بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"اگر تکلیفوں سے چھٹکارا پانے کو ٹھیک ہونا کہتے ہیں تو میں ضرور ٹھیک ہو جاؤں گی۔" وہ ایک بار پھر ہولے سے مسکرائی۔

ہادی کو معلوم تھا کہ اس کی بیماری میں ایسے وقفے آتے ہیں جب وہ ایک دم بھلی چنگی لگنے لگتی ہے، بلکہ خوراک بھی لینا شروع کر دیتی ہے۔ یہ بھی یقیناً ایسا ہی وقفہ تھا۔ ہادی نے نرمی سے اس کے ہاتھ کو چھوا اور تسلی تشفی کے بول بولے۔ وہ اس کے بولوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے آپ سے ایک دو باتیں کرنا ہیں لیکن ابھی نہیں۔ ڈاکٹرز راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے حجاب! میں اِدھر ہی ہوں۔ اِدھر ہی رہوں گا جب تک آپ ٹھیک نہ ہو جائیں۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک بار پھر شکستہ مسکراہٹ اُبھری۔

چند منٹ بیٹھ کر ہادی باہر آ گیا۔ انکل فیاض غم کی تصویر بنے سامنے کھڑے تھے۔ ہادی نے ان سے ہاتھ ملایا

اور تسلی کے بول بولے۔ فیصل ایک طرف بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ عطا انکل اسے دلاسہ دے رہے تھے۔ ہادی بھی ان کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے فیصل کو اپنے ساتھ لگایا اور اسے حوصلہ مندی کی تلقین کی لیکن حوصلہ اس کے اپنے اندر بھی نہیں تھا۔ فیصل کی آنکھیں تر بتر تھیں۔ بہن کے لیے اس نے کیا کچھ کیا۔ اُن چاہی شادی تک کی لیکن وہ پھر بھی موت کے منہ میں تھی۔ ہاں بیٹیوں کی خوشی کے لیے باپ اور بھائی اسی طرح نیلام ہوتے ہیں۔

کچھ دیر بعد ہادی اور عطا انکل باہر ہسپتال کی لابی میں بیٹھے تھے۔ عطا انکل نے دلگیر آواز میں کہا۔ "ہادی! وہ ختم ہو رہی ہے۔ ڈاکٹروں کے خیال میں اب اس کے پاس چند دن سے زیادہ نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب انکل؟" ہادی کی دھڑکن تھم سی گئی۔

"اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہو سکتا ہے۔ بیماری بہت سنگین صورت اختیار کر چکی ہے۔ امریکن سرجن نے بھی تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ غالباً اب اسے کہیں باہر لے جانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی معجزہ ہی اب......" عطا انکل کا گلا پھر رندھ گیا اور وہ جملہ مکمل نہ کر سکے۔

"لیکن اسے ہے کیا انکل؟"

"یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ آسان لفظوں میں یہ سمجھو کہ ہمارے دل کا اپنا ایک الیکٹرک نظام ہوتا ہے۔ دل کے ایک حصے میں قدرت نے کچھ خلیے ایسے پیدا کر رکھے ہیں جو دل کو دھڑکنے کے لیے برقی توانائی دیتے ہیں۔ بالکل بجلی کے کرنٹ جیسی طاقت۔ ہماری زبان میں اسے SaNode کہتے ہیں۔ یہ Node ہی دراصل وہ زندگی ہے جس پر ہماری سائنس آ کر اپنے ہاتھ کھڑے کر دیتی ہے۔ یہ "زندگی" قدرت کاملہ سے ماں کے پیٹ میں حمل کے تیسرے چوتھے ماہ اچانک وجود میں آتی ہے اور پھر انسان کی طبعی عمر تک جاری و ساری رہتی ہے۔ یہ معجزہ ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں نا کہ انسان سائنس کو جتنا زیادہ جانتا ہے اتنا ہی خدا کے وجود کو زیادہ محسوس کرنے لگتا ہے۔"

"تو کیا حجاب کے ہارٹ کے اس نظام میں خرابی ہے۔"

"خرابی ہی نہیں بہت بڑا بریک ہے ہادی۔" عطا انکل نے بے حد افسردہ لہجے میں کہا۔

"مجھے کچھ بتائیں انکل! میں سب جاننا چاہتا ہوں۔"

"یہ تمہاری سمجھ سے بالا ہوگا ہادی! اور اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ بس یوں سمجھو کہ SaNode زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اس کو قدرت کا پیس میکر بھی کہتے ہیں۔ یہاں سے پیدا ہونے والی لہریں ایک چھوٹے سے واسطے کے ساتھ باریک رگوں کے ایک اور نظام تک پہنچتی ہیں۔ جسے ہم HisPurkinji کہتے ہیں۔ یہ نظام ہمارے دل کو دھڑکاتا ہے لیکن یہ نظام بھی تب ہی کام کرتا ہے جب SaNode درست کام کر رہا ہو۔ لیکن وہ بُری طرح ڈسٹرب ہو چکا ہے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ پچھلے میں آخری اٹیک سے پہلے بھی کئی چھوٹے چھوٹے اٹیک حجاب کو ہوتے رہے ہوں گے۔"

"تو کیا پیس میکرز وغیرہ بھی ہیلپ نہیں دے رہے؟"

"نہیں ہادی! اس خاص کیس میں پیس میکر بھی بہت پیچیدگیاں پیدا کر رہا ہے۔ چند دن پہلے دوبارہ ایک پیس

میکر لگایا گیا تھا لیکن اسے اُتارنا پڑا ہے۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ SaNode کے سگنل بڑی تیزی سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب وہ کسی بھی وقت ختم ہو جائیں گے۔ کیوں ختم ہو جائیں گے اس کا جواب ہمارے پاس نہیں۔ جس چیز کی ابتدا کے بارے میں ہم آج تک نہیں جان سکے اس کی انتہا کے بارے میں کیسے جان سکتے ہیں۔"

وہ بڑی عجیب رات تھی۔ بہت سرد اور بوجھل۔ انکل فیاض مسلسل تین دن سے ہسپتال میں تھے۔ عطا انکل نے بہ مشکل کر انہیں گھر بھیج دیا تھا (یہاں وہ لوگ عطا صاحب کے ہی ایک پرانے دوست کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تین دن پہلے تک حجاب کی والدہ صوفیہ بیگم بھی یہاں تھیں۔ اب انہیں سمجھا بجھا کر واپس روم بھیج دیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ حجاب سنبھل رہی ہے۔)

فیصل "آرام گاہ" میں کچھ دیر سونے کے لیے چلا گیا تھا۔ عطا انکل باہر لابی میں بیٹھے تھے۔ ہادی کمرے میں حجاب کے پاس تھا۔ وہ بستر پر نیم دراز تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ ٹھہری آواز میں بولی۔ "ہادی! میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔"

"کس بات کی؟"

"آپ کو پتا ہے۔"

"مجھے کچھ پتا۔ اور نہ کوئی ایسی بات ہے۔"

"ہے ہادی! ہے۔" وہ کراہ کر بولی۔ "میں نے آپ کے منہ پر طمانچہ مارا ہادی! میں اس وقت مر کیوں نہ گئی۔ زمین غرق نہ ہو گئی۔ کاش ایسا ہو جاتا۔" وہ سسک پڑی اور اس نے اپنا ہاتھ ہادی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"بس اتنی سی بات کے لیے تم نے اتنی دور سے بھگایا ہے۔" ہادی زبردستی مسکرایا۔

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے ہادی! آپ مجھے معاف کریں۔ یا مجھے سزا دیں۔ میں نے ایسا کیوں کیا؟ زندگی بھر کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا اور اگر اٹھایا تو کس پر...... کیوں میرا ہاتھ اسی وقت ٹوٹ نہ گیا۔"

"وہ ایسا وقت تھا حجاب! جب آپ اپنے حواس میں نہیں تھیں اور شاید میں بھی نہیں تھا۔ میں آپ کو زبردستی لے جانا چاہ رہا تھا۔ میرے خیال میں آپ کی جگہ کوئی بھی ہوتا۔ اس کا ردعمل یہی ہوتا۔"

"نہیں ہادی! آپ مجھے دل سے معاف کر دیں اور اگر نہیں تو مجھے اس قصور کی سزا دیں۔"

ہادی نے گہری سانس لی اور اس کا ہاتھ تھپتھپا کر مسکرایا۔ "اچھا سوچتے ہیں اس بارے میں بھی۔"

"نہیں ہادی! میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں......"

ہادی نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی بات نہ کہنا حجاب! آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔" اس کے لہجے میں ایسی تڑپ تھی کہ حجاب بھی چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

اس نے اس کے ہونٹوں سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ کتنی ہی دیر گم صم اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بھی دیکھتا رہا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں وال کلاک کی نہایت مہین ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔ کمرے میں اور کوریڈور میں بہت مدھم سی روشنی تھی۔ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "ایک بات پوچھوں......

سچ جواب دیجیے گا۔"

"ہاں پوچھیں۔"

"آپ مجھ سے پیار کرتے ہیں نا؟" اس نے اچانک کہا۔

کتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ دی تھی اس نے۔ ہادی دم بخود رہ گیا۔ بے ساختہ ہونٹ تھرائے اور ساتھ ہی پورا جسم تھرا گیا لیکن وہ کچھ بول نہ سکا۔ "کہیے ہادی! یہ بات دوستی سے آگے کی ہے نا۔ آپ پیار کرتے ہیں نا مجھ سے؟"

"آپ سے کس نے کہا؟" وہ بمشکل بولا۔

"آپ نے کہا۔"

"کب کہا؟"

"کئی بار...... جگہ جگہ۔" وہ عجیب سوئے ہوئے سے انداز میں بولی۔

"میں سمجھا نہیں حب!"

"آپ نے اس وقت کہا ہادی! جب آپ نے جلال کا قرضہ اتارنے کے لیے ڈاکٹر انکل کے ساتھ مل کر دن رات بھاگ دوڑ کی۔ اپنی چیزیں تک فروخت کیں۔ اور آپ نے اس وقت کہا ہادی! جب آپ پولیس کو لے کر دس والی کوٹھی میں گھسے۔ خود کو خطرے میں ڈالا اور مجھے وہاں سے نکالا۔ اور اس وقت کہا جب آپ کو پتا چلا کہ جلال قرضہ وصول ہونے کے بعد بھی ابو اور فیصل کو تنگ کر رہا ہے۔ آپ اس کے دفتر میں چلے گئے۔ اسے مجبور کیا کاغذوں پر دستخط کرنے کے لیے۔ مجھے عطا انکل نے سب کچھ بتا دیا ہے ہادی! آپ کیا کیا چھپائیں گے۔ آپ نے میرے لیے ادم سے ٹکر لی یا نہیں؟ جلال کے کارندوں سے چوٹیں کھائی یا نہیں اور پھر جب میں بے ہوش ہو کر روم کے ہسپتال میں پڑی تھی آپ مجھے خاموشی سے دیکھنے آئے یا نہیں؟ آپ آنسو لے کر خاموشی سے پاکستان واپس چلے گئے لیکن پاکستان واپس جا کر بھی آپ کی ساری سوچوں کا رُخ یہاں ہماری طرف ہی رہا۔ آپ نے سینکڑوں فون کالیں کیں ڈاکٹر انکل کو۔ وہاں بھی آپ ہمارے مسئلوں کے بارے میں ہی سوچتے رہے۔ اب یہاں جو میرا علاج ہو رہا ہے اس کے لیے رقم بھی آپ کی کوششوں سے ہی اکٹھی ہوئی ہے۔ آپ نے ابو کی گجرات والی جگہ فروخت کرائی۔ آپ نے......"

"پلیز...... پلیز حب! مجھے شرمندہ نہ کریں۔" ہادی نے اس کی بات کاٹی۔

"میں اور بہت سی باتیں گنوا سکتی ہوں ہادی! چھوٹی چھوٹی، بڑی بڑی بہت سی باتیں۔" حجاب کی آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسو اس کے شفاف رُخساروں پر پھسلنے لگے۔

وہ حجاب سے نظر چرا کر ان آنسوؤں کی حرکت کو دیکھتا رہا۔ چلتے رُکتے اور پھر چلتے آنسو۔ حجاب کی آواز پھر اس کے کانوں میں گونجی۔ "بولیں ہادی! بتائیں، پیار کرتے ہیں نا مجھ سے۔ پیار کرنے لگے ہیں نا؟"

اس نے ایک طویل سانس لی۔ ہونٹوں پر زبردستی ایک مدھم مسکراہٹ بکھیری اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ہولے سے بولا۔ "ہاں حجاب...... تھوڑا...... تھوڑا......"

"نہیں...... نہیں۔" اس نے پورے یقین سے نفی میں سر ہلایا۔ "تھوڑا نہیں بہت زیادہ کرتے ہیں۔ بہت زیادہ۔" وہ سسک پڑی۔ "بتائیں ایسا ہی ہے نا؟"

ہادی کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ دو آنسوؤں نے بستر کی سبز چادر پر گر کر جیسے اثبات میں جواب دیا اور خاموشی سے چادر میں جذب ہو گئے۔

"اور میں نے آپ کو مارا...... آپ کی توہین کی...... بار بار بے عزت کیا۔"

اس نے حجاب کا سرد ہاتھ تھاما اور بولا۔ "حجاب! پلیز...... اگر آپ نے ایسی ہی باتیں کرنی ہیں تو میں اُٹھ کر چلا جاتا ہوں۔"

اچانک قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہادی نے ادھ کھلی کھڑکی میں سے دیکھا۔ عطا انکل آ رہے تھے۔ اس نے رومال نکال کر جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ دونوں خاموش ہو گئے۔

O......◆......O

اگلے روز دوپہر کے وقت حجاب کی طبیعت پھر بگڑ گئی۔ وہ اسی طرح کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی جیسے کسی حبس زدہ جگہ پر اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ رنگ زرد ہو گیا۔ طبیعت کی خرابی کے دوران میں ڈاکٹروں کی ٹیم نے اس کے کچھ ٹیسٹ لیے جن کی رپورٹ بھی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آ گئی۔ سب کچھ ویسے ہی ہو رہا تھا جیسے ڈاکٹروں نے کہا تھا۔ اگلے دو چار دن میں ہونے والا بیماری کا دوسرا یا تیسرا حملہ SCD (اچانک قلبی موت) کا باعث بن سکتا تھا۔

آنسوؤں سے تر آنکھوں کے ساتھ ہادی نے بھی ایک دو رپورٹس دیکھیں۔ حجاب کی بیماری کو Arrhythmia کا نام دیا جا رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ وہ شدید قسم کے ڈس آرڈر Bradycardias کا شکار ہے۔ جس میں دھڑکن بلاوجہ سست ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس واقعے کے ایک گھنٹے بعد ہسپتال کے ہی ایک کمرے میں فیاض صاحب اور ڈاکٹر عطا گفتگو میں مصروف تھے۔ یہ رہائشی کمرے ہسپتال کی بلڈنگ کی آخوین منزل پر مریضوں کے لواحقین کے لیے بنے ہوئے تھے۔ دوسرے شہر سے آنے والے یہاں قیام کر سکتے تھے۔ حجاب کی بڑھتی ہوئی تکلیف کی بات ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں ڈاکٹر عطا کے فون پر کال آئی۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف ان کا کوئی اسسٹنٹ تھا۔ اس نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! سہ پہر کا اخبار دیکھا ہے آپ نے؟"

"نہیں تو۔"

"یہاں روم میں جلال الدین صاحب سخت مصیبت میں ہیں۔ وہ میلانو میں ایک پلازہ بنوا رہے تھے۔ اس کا ایک بہت بڑا شیڈ گرا ہے۔ جس کے نیچے آ کر کئی لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے ہیں۔ ان پر مجرمانہ غفلت کا الزام لگا ہے کیونکہ ایسا ہی چھوٹا واقعہ وہاں ایک ماہ پہلے بھی ہوا تھا اور محکمے نے انہیں حفاظتی انتظام کے لیے سخت وارننگ دی تھی۔"

"او گاڈ۔" عطا صاحب نے بے ساختہ کہا۔

"جلال الدین صاحب کے خلاف میلانو میں باقاعدہ ایک جلوس نکلا ہے اور انہیں سخت سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ سنا ہے کہ وہ پہلے ہی کسی کیس میں گرفتار ہیں۔"

"ہاں گرفتار تو ہے۔"

"بہرحال...... راٹھور خاندان کے تین چار اور بڑوں کو بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ گرفتار ہونے والوں میں جلال الدین کے کوئی پیر صاحب بھی شامل ہیں۔ وہ بھی شراکت دار تھے۔"

اسسٹنٹ کی کال سننے کے بعد عطا صاحب نے تھکی تھکی سی سانس لی۔

"کیا ہوا؟" فیاض صاحب نے پوچھا۔

"سچ کہتے ہیں فیاض! مصیبت آتی ہے تو تنہا نہیں آتی۔ جلال اپنے اعمال کے شکنجے میں آ گیا ہے۔ بہت کچھ ختم ہو رہا ہے اس کا۔" اس کے بعد انہوں نے فیاض کو اس واقعے کی تفصیل سے آگاہ کیا۔

"میری بچی کو بڑا دکھ دیا ہے اس نے۔" فیاض صاحب نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔ "ایک موقع پر تو مجھے لگا تھا شاید میں اب کبھی اس کی صورت ہی نہ دیکھ سکوں گا۔"

"میرے خیال میں ہم اس میں ہادی کے کردار کو بھی نہیں بھول سکتے۔ اگر وہ رسک لے کر وہاں ورس والی کوٹھی میں نہ جاتا تو شاید وہیں پر سب کچھ ختم ہو گیا ہوتا۔ اس نے قدم قدم پر ساتھ دیا ہے فیاض۔"

فیاض صاحب خاموش رہے۔

عطا صاحب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "شروع میں ہمیں یہ غلط فہمی رہی کہ شاید اس کی وجہ سے جلال اور حجاب کے تعلقات مزید بگڑے ہیں۔ لیکن اب گہرائی سے دیکھا جائے تو ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔ تعلقات پہلے ہی بہت زیادہ بگڑ چکے تھے۔ اسی شدید گھٹن سے نکلنے کے لیے تو حجاب وینس گئی تھی سہیلی کی شادی پر۔ اب یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہادی اور حجاب کی پہلی ملاقات وہیں وینس میں ہوئی۔ اور اس کے بعد ڈیڑھ دو ماہ تک وہ صرف اور صرف دوستوں کی طرح ملے۔ ان کے تعلقات میں کسی کجی کا دور دور تک شائبہ نہ تھا۔"

"تمہارا مطلب ہے عطا وہ ابھی تک حجاب کو ایک دوست کی حیثیت سے دیکھتا ہے؟"

"نہیں...... یہاں اس معاملے میں پیچیدگی موجود ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ حجاب کو پسند کرنے لگا تھا اور بے حد شدت سے۔ مگر یہ اس کا ظرف ہے کہ اس نے اس بارے میں کبھی ایک لفظ حجاب سے نہیں کہا۔ اس کو شبہ تک نہیں ہونے دیا۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی ہرگز یہاں نہ آتا، اگر حجاب اس سے خود آنے کی درخواست نہ کرتی۔ اپنی محبت کے حوالے سے وہ بہت گہرا، بہت زیادہ محتاط ہے۔ اس سارے معاملے میں اس سے بس ایک چھوٹی سی غلطی ہوئی جسے بدخواہوں نے بڑھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہی تصویر والی۔"

"ہاں...... لیکن جلال کے تیور تو اس سے پہلے ہی بہت بگڑ چکے تھے۔ وہ ارم سے شادی کا پکا فیصلہ کر چکا تھا۔" فیاض صاحب نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں فیصل اور ہادی نظر آئے۔ وہ باتیں کرتے ہوئے انہی کی طرف آ رہے تھے۔ فیاض اور عطا صاحب کو خاموش ہونا پڑا۔

O......❖......O

وہ ایک اور انہونیوں والی رات تھی۔ ہسپتال کی دیواروں سے باہر سرد ہوائیں سر پٹخ رہی تھیں۔ اندر ماحول نیم گرم تھا۔ رات کے دو بجے تھے۔ کمرے میں ہادی، حجاب کے سامنے بیٹھا تھا۔ سہ پہر کے بعد اس کی طبیعت پھر سنبھل گئی تھی۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس نے ہلکا پھلکا کھانا کھایا تھا اور اسٹابری جوس پیا تھا۔ حجاب کا ہاتھ ہادی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ حیران ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ ہادی کو دیکھ کر بولی۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ہادی! لوگ...... لوگ کیا کہیں گے؟"

"ہم لوگوں کو نہیں بتائیں گے حجاب! ابھی کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ صرف عطا انکل، فیصل اور انکل فیاض کو علم ہوگا۔ یہاں وینس میں اور ہے بھی کون جسے پتا چل سکے۔"

"نہیں ہادی! ابو کیسے مانیں گے۔"

"میں نے کہا ہے نا حجاب! یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ ان کو منانا میرا کام ہے۔ میں ان کے قدموں پر سر رکھ دوں گا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا۔ کروں گا۔"

وہ کراہتے ہوئے بولی۔ "ہادی! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ مم...... مجھ پر رحم کریں...... مجھے بہت کچھ اندازہ ہے کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ کیا آپ ایک...... ایک قبر سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں تو بس یہ......"

ہادی نے حجاب کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آپ کچھ نہ کہیں حجاب! مجھے پتا ہے میں دیوانوں جیسی باتیں کر رہا ہوں۔ لیکن مجھے میری دیوانگی کے ساتھ رہنے دیں۔ مجھے آپ کے سر کی قسم ہے۔ حجاب میں آپ سے زندگی میں پہلی اور آخری بار کچھ مانگ رہا ہوں۔ پھر کبھی نہیں۔"

اس نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ ہادی نے ایک بار پھر بڑی نرمی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ "نہیں حب! اب کچھ نہ کہنا...... اگر کچھ کہنا ہے تو پھر ہمیں اسی جگہ اپنے ہاتھوں سے میری جان لے لیں۔"

حجاب نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھوں کے بیرونی گوشوں سے دو موتی نکلے اور اس کے زرد شفاف رخساروں پر پھسلتے چلے گئے۔ گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ان سوئیوں کو روکنا نہیں تھا بہت جلد ان کے وہ چند چکر مکمل ہونے والے تھے جن کا تعین ڈاکٹروں نے کر دیا تھا اور درست کیا تھا۔

وہ شاعر تھا...... ایک پیدائشی تخلیق کار تھا اور اکثر تخلیق کاروں کی دنیا اور ہوتی ہے۔ ان کے شب و روز جدا ہوتے ہیں۔ وہ خیالوں اور تصورات میں زندہ رہتے ہیں۔ اور جب ایسے لوگ سچے عشق کے تجربے سے گزرتے ہیں تو اکثر کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ ہادی کے اندر بھی ایک بے پناہ توانائی پیدا ہو چکی تھی۔ وہی توانائی جس نے جلال جیسے دبنگ شخص کو پستول کی صرف ایک جنبش سے گھٹنوں پر گرا دیا تھا۔ آج یہی توانائی کسی اور صورت میں پھر ہادی کے اندر موجزن تھی۔ آج یہ توانائی انکل فیاض کو ایک ایسے کام کے لیے تیار کر رہی تھی جو وہ ہرگز کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن یہ توانائی اپنے اندر منہ زور پانیوں کا بہاؤ رکھتی تھی۔ ایک ایسے طوفانی ریلے کی طرح تھی جو بظاہر خاموش ہونے کے باوجود چٹانوں کو اکھاڑتا ہے اور اپنے اندر بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ ہادی کی توانائی نہیں تھی۔ یہ تو عشق کی خداداد قوت تھی۔

جس منزل تے عشق پہنچایا
عقل نوں خبر نہ کائی

بند کمرے میں انکل فیاض کرسی پر تھے۔ ہادی ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ انکل فیاض کے پاؤں پر تھے۔ ان کے درمیان کافی لمبی بات ہوئی تھی لیکن اب پچھلے تین چار منٹ سے ہادی کی زبان پر بس یہی الفاظ تھے۔ ''انکل پلیز..... میرے حال پر رحم کیجیے۔ حجاب کے یہ دو دن ہیں یا تین چار دن ہیں۔ خدا کے لیے مجھے یہ دے دیجیے۔ میں انہیں اپنی پوری زندگی سمجھوں گا۔ اگر یہ دن بڑھ گئے تو یہ قدرت کی طرف سے مجھے انعام ہوگا اور اگر نہ بڑھے تو یہی میری پوری زندگی کی طرح ہوں گے۔''

پریشانی، کشمکش اور تناؤ کے بعد انکل فیاض کے چہرے پر اب نرمی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ وہ آنکھیں پھیلا پھیلا کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرنے لگے۔ پھر انہوں نے ہادی کے کندھے پر اپنا لرزاں ہاتھ رکھا اور بولے۔

''اس طرح نہ کرو۔ صوفے پر بیٹھو..... میں حجاب سے بات کرکے ہی کچھ بتا سکتا ہوں۔''

ہادی نے خلوصِ دل سے ان کا ہاتھ چوما اور اٹھنے سے پہلے بولا۔ ''انکل! میں نے آپ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ میرے دل میں جو کچھ بھی تھا لیکن حجاب نے ہمیشہ مجھے ایک اچھے دوست کی طرح سمجھا۔ اب میں ہی ہوں جو اس دوستی کو ایک اور رشتہ دینا چاہ رہا ہوں۔ اگر وہ مان جائیں گی تو اس دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت انسان اور کوئی نہیں ہوگا۔''

O.....✿.....O

یہ انہونیوں کے شب و روز تھے۔ سب کچھ انوکھا ہو رہا تھا۔ لمحوں نے اپنی طنابیں کھینچ لی تھیں۔ وقت سمٹ گیا تھا اور وقت کے ساتھ واقعات بھی سمٹ گئے تھے۔ جلدی جلدی وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ آج وینس میں ہادی کی تیسری شب تھی اور آج وہ ہفت اقلیم کی دولت کا مالک بن رہا تھا۔ منہ زور ریلے نے سب کو ایک طلسماتی بہاؤ میں بہا دیا تھا۔ کوئی منطق، کوئی دلیل یا وجہ راہ میں حائل نہ ہو پائی تھی۔ عطا انکل نے انڈین سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر سرفراز سے بھی آف دی ریکارڈ بات کی تھی۔ انہوں نے اس ہنگامی شادی کے بارے میں کوئی واضح رائے نہیں دی تھی۔ نہ فائدہ مند قرار دیا تھا نہ نقصان دہ۔ ہاں اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر اس قسم کی کوئی تبدیلی بہت پہلے ہوتی تو شاید نفسیاتی طور پر حجاب کو بحال کرنے میں بہت مدد دیتی۔ عطا صاحب نے ڈاکٹر سرفراز سے درخواست کی تھی کہ وہ یہ بات صرف اپنے تک ہی رکھیں گے۔ پی ایچ ڈی ڈاکٹر سرفراز کی باتوں سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ اس قسم کی کوئی جذباتی اسپورٹ (جو حجاب کو طلاق یافتہ کے زمرے سے نکال دے) اس کے لیے بہتری پیدا کر سکتی ہے۔ کم از کم اس کے آخری دن بہتر ہو سکتے ہیں۔

اس رات حجاب کی طبیعت بہتر تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ شدید بیمار ہے ہی نہیں۔ ہادی نے یہاں وینس میں اگر انکل فیاض کو راضی کر لیا تھا تو وہاں اپنی والدہ کو راضی کرنا اس کے لیے کون سا مشکل کام تھا۔ وہ اس بارے میں کافی کچھ تو انہیں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ انہیں بھی معلوم تھا کہ بیٹے نے جو ٹھانی ہے، وہ کر کے رہے گا۔ ہادی نے کوئی ایک گھنٹہ پہلے فون پر ان کی بات بھی حجاب سے کروائی تھی۔

ہسپتال کے اس پرائیویٹ کمرے میں بڑی خاموشی کے ساتھ حجاب سے ہادی کا نکاح ہو گیا۔ عطا انکل، فیصل اور انکل فیاض اس موقعے پر موجود تھے۔ ایک طرح وہ سب ایک محبت بھرے ٹرانس میں تھے۔ آنکھیں بھیگی تھیں اور دل رقت سے بھرے ہوئے۔ شرعی طور پر اس نکاح میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ Divorce کے بعد حجاب کی تین ماہ چار دن کی عدت پوری ہو چکی تھی۔ ایک بیمار خاتون سے نکاح کرنا بھی کہیں منع نہیں تھا۔

حجاب کے جسم پر وہی ہسپتال والے سفیدی مائل کپڑے تھے۔ بس اس نے ایک لمبی کامدار شال اوڑھ لی تھی۔ اور ہادی کی محبت بھری، ناقابلِ مزاحمت ضد کے سامنے سر جھکا دیا تھا۔ وہ جس طرح خود مختلف تھا، اس کی ضد بھی مختلف تھی۔ حجاب کا رنگ زردی مائل تھا۔ جیسے وہ شادی کے نہیں مایوں کے بستر پر بیٹھی ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں ابھی تک ڈرپس کے لیے برانولا لگی ہوئی تھی اور اسی ہاتھ میں ہادی نے تھوڑی سی مہندی بھی لگا دی تھی۔

• گہری خاموشی تھی۔ ہسپتال کے کوریڈور اور گیلریوں میں سناٹا تھا اور اس سناٹے میں جیسے ایک غیر مرئی آواز گونج رہی تھی۔ چھوڑ بابل کا گھر، آج پی کے نگر مجھے جانا پڑا۔ یہ پی کا نگر کون سا تھا۔ شاید وہی نگر جو اس کمرے میں موجود ان گنت میڈیکل رپورٹس پر لکھا ہوا تھا۔ ''SCD، اچانک قلبی موت'' گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ اس پرائیویٹ وارڈ میں صرف ایک ڈیوٹی ڈاکٹر ''ڈورتھی'' تھی جسے ڈاکٹر عطا نے اعتماد میں لے کر اس ساری صورتِ حال سے آگاہ کر رکھا تھا۔ وہ اس انوکھی شادی پر حیران تھی۔ خوش بھی اور غمزدہ بھی۔

رات کا باقی حصہ ہادی نے حجاب کے بستر کے پاس کرسی پر بیٹھے بیٹھے گزار دیا۔ حجاب کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے بہت سی باتیں کیں۔ حجاب نے کہا۔ ''ہادی میری بات کا بُرا نہ مانیے گا۔ ہمیں حقیقت سے نظر نہیں چرانی چاہیے۔ میں یہاں اس کمرے میں مرنا نہیں چاہتی۔ کیا کچھ ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں کہیں کھلی فضا میں سانس لے سکوں۔''

''وہی پھر وہی مرنے والی باتیں۔''

''پلیز ہادی! مجھے بتائیں۔'' وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے اس بارے میں عطا انکل سے بات کی تھی۔ وہ یہی کہتے ہیں کہ آپ کا اس وقت ہسپتال سے نکلنا کسی طرح بھی مناسب نہیں اور نہ اس کی اجازت دی جائے گی۔ ہاں ایک کام ہو سکتا ہے۔ آٹھویں فلور پر کچھ رہائشی کمرے بنے ہوئے ہیں۔ آپ ماحول کی تبدیلی کے لیے عارضی طور پر وہاں جا سکتی ہیں۔ اس کے لیے بھی عطا انکل کو خصوصی پرمیشن حاصل کرنا پڑے گی۔''

''پلیز ہادی! کچھ کریں۔ نہیں تو میں ڈاکٹروں کو کہے بغیر ہوئے وقت سے پہلے ہی آپ کو خدا حافظ کہہ جاؤں گی۔''

''اور اگر آپ نے ایسی باتیں بند نہ کیں تو میں ابھی پاکستان روانہ ہونے کے لیے ایئرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔'' ہادی نے اس کا کان ہولے سے کھینچتے ہوئے کہا۔

اگلا دن گزر گیا۔ ہادی ہر پل اس کے پاس رہا۔ پھر انہونی شبھوں کے اس دورانیے میں وہ ایک اور انہونی

شب تھی۔ ہادی اور حجاب بلڈنگ کی آٹھویں منزل پر ایک فرنشڈ، کشادہ کمرے میں موجود تھے۔ کیپسول لفٹ کے ذریعے وہ پانچ سیکنڈ میں گراؤنڈ فلور سے اوپر پہنچے تھے، اور اگر خدانخواستہ کوئی ضرورت پیش آتی تو پانچ سیکنڈ میں ہی نیچے بھی اُتر سکتے تھے۔ شادی کے بعد یہ ایک طرح سے ان کی پہلی رات تھی۔ ڈاکٹر ڈورتھی نے سرخ اور سفید گلابوں کے دو بڑے گلدستے کمرے میں رکھ دیے تھے اور ان کی خوشبو سے فضا مہک رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکیاں جگمگاتے ہوئے وینس شہر کی طرف تھیں۔ روشنیوں کا ایک جھمکٹا اور ان روشنیوں کی چمک آبی گزرگاہوں اور نہروں میں منعکس ہو رہی تھی۔ ہاں ایسی ہی ایک شب میں وہ پہلی بار ملے تھے۔

کمرے میں پہنچتے ہی حجاب بے چین نظر آنے لگی۔ اس کی سانس بوجھل ہو گئی۔ اس کے کہنے سے پہلے ہی ہادی نے کھڑکیاں کھول دیں۔ کمرے میں ٹمپریچر تھوڑا سا گر گیا اسے زیادہ کرنے کے لیے ہادی نے حرارت مہیا کرنے والے ڈیوائس کو ایڈجسٹ کیا۔ وہ دونوں کمبل اوڑھ کر اور ٹیک لگا کر بستر پر بیٹھ گئے۔ بلندی سے وینس کا نظارہ دلفریب تھا روشنیاں علاقوں کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ یہ وینزیا کیپ ٹلیٹن تھی۔ یہ "مارکو" کے در و دیوار تھے اور یہ ریالٹو کے مشہور پل کی روشنیاں، اسی پل کے نزدیک ایک دن حجاب نے ہادی کے کان کے پاس غبارہ پھوڑا تھا اور پھر ہنس ہنس کر دہری ہو گئی تھی۔

ہادی نے حجاب کو اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کھڑکیوں سے باہر بھی جھانک رہا تھا۔ اسے یہی لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے ایک خواب دیکھ رہا ہے۔ حجاب نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔

"ہادی ایسا تو نہیں ہوا کرتا آپ نے یہ سب کیسے کر لیا۔ کس طرح کر لیا یہ سب کچھ۔ سب مان گئے کم بھی مان گئی۔"

"بس ایک جادو ہے میرے پاس۔"

"کیسا جادو؟"

"آپ کی محبت کا جادو۔"

"کیا یہ سب کچھ راز رہ سکے گا؟"

"کیوں نہیں رہے گا۔ ہم چار لوگوں کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں اور جب تک ہم نہیں چاہیں گے۔ ہو گا بھی نہیں۔"

"جب تک کا کیا مطلب؟ دو تین دن کی تو بات ہے ساری۔"

"خبردار..... " ہادی نے پھر اس کے ہونٹوں کو ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔ "بطور شوہر میرا آپ کو حکم ہے کہ اس بارے میں بات نہیں کریں گی۔ آپ کو یاد ہے کہ آپ نے روم میں جاتے ہوئے کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا؟" وہ اس کے ہاتھ کے نیچے سے ہی بولی۔

"آپ نے کہا تھا، آج ہم آخری دن مل رہے ہیں۔ میں نے کہا تھا آپ آخری دن کہہ کر میرا موڈ خراب کر

رہی ہیں۔ آپ نے جواب دیا تھا۔ آپ اس کو آخری دن کیوں کہتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ آج کا پورا دن ہمارے پاس ہے۔ گلاس کو آدھا خالی کیوں دیکھتے ہیں۔ آدھا بھرا ہوا کیوں نہیں دیکھتے۔"

وہ چپ ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک لیے وینس کی ہزار ہا روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ جیسے خود کو ان جگمگاتی سڑکوں پر رواں دیکھ رہی ہو۔ ہادی نے اسے نرمی سے بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس نے اپنا سر ہادی کے سینے پر رکھ دیا۔ وہ اس کے بالوں کو چوم کر بولا۔ "کیا سوچنے لگی ہیں؟"

اس نے کھوئی کھوئی آواز میں کہا۔ "ہادی! آپ کو پتا ہے جب جلال تہہ خانے میں میرے ساتھ سختی کرتا تھا مجھے مارتا تھا، تو کیا کہتا تھا؟"

"کیا؟"

"وہ کہتا تھا تم اپنے اندر کی چنگاری کی بات کیا کرتی تھیں۔ اب بتاؤ کہاں ہے وہ چنگاری؟ میں خود حیران ہوتی تھی کہ جلال کا ظلم سہنے سے انکار کرنے والی وہ چنگاری کہاں گئی لیکن اب مجھے پتا چلا ہے کہ وہ چنگاری کہاں تھی؟"

"کہاں تھی؟"

"یہاں..." حجاب نے ہادی کے ساتھ لگے لگے اس کے دل کے مقام پر انگلی رکھی۔ "ہاں ہادی! وہ چنگاری اُڑ کر یہاں آ گئی تھی آپ کے دل میں وہ ختم نہیں ہوئی تھی۔ بس اس نے جگہ بدل لی تھی۔ اور یہی چنگاری تھی جو شعلہ بنی اور...... اور جلال کے دفتر میں گئی تھی اور اس پر لرزہ طاری کر دیا۔"

ہادی اس کی بات کی گہرائی میں کھو کر رہ گیا۔ نرمی سے اس کے بالوں کو چوم کر بولا۔ "شاید ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ..... ایسی چنگاریاں جو ظلم کے نتیجے میں چمکتی ہیں۔ ختم نہیں ہوتیں۔ بس جگہ بدل لیتی ہیں اور کبھی شکل بدل لیتی ہیں۔"

حجاب کی دوا کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ہادی کی نظر بار بار وال کلاک کی طرف بھی اُٹھ رہی تھی۔ وقت ہونے سے صرف ایک منٹ پہلے روم سروس سسٹم پر ڈاکٹر ڈورتھی کی کال آ گئی۔ ہادی نے کال ریسیو کی۔ فرانسیسی ڈاکٹر ڈورتھی بولی۔ "آپ کی مسز ٹھیک ہیں مسٹر ہادی؟"

"یس ڈاکٹر!"

"ان کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔"

"یاد دہانی کا شکریہ ڈاکٹر۔"

"اوکے..... گڈ ونشز..... " ڈاکٹر نے کہا۔

دوا اور پانی کا گلاس پاس ہی پڑے تھے۔ ہادی نے اسی طرح حجاب کو بانہوں میں لیے لیے اسے دوا کھلائی۔ اصرار کر کے تھوڑا سا جوس پلایا۔ اس نے اپنا سر پھر ہادی کے سینے سے ٹکا دیا۔ نیم وا آنکھوں سے وینس کی جادوئی روشنیوں کو دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے بولی۔ "ہادی! مجھے سچ بتایئے گا۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے نا؟"

"اگر سچ پوچھ رہی ہیں تو نہیں۔ میں اپنا دوسرا آپشن استعمال کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ سینے سے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں آپ کو سزا دینا چاہتا ہوں۔"

"جی؟" وہ کچھ بھی نہیں۔

ہادی نے اس کی ٹھوڑی اوپر اُٹھائی اور بڑی محبت سے اس کے رُخسار کو چوما پھر اس کی ٹھوڑی کو پھر ناک کو پھر اس تابندہ پیشانی کو (جو ہمیشہ ایک چاند کی طرح اس سے ہزار ہا میل کے فاصلے پر رہی تھی۔) پھر اس کے نازک ہونٹوں کو شاید یہ واقعی جاگتی آنکھوں کا خواب تھا۔ حجاب کو چھوئے بغیر بھی ان کا عشق مکمل تھا لیکن اب یہ عشق کاملیت کی معراج کو چھو رہا تھا۔

وہ ایک جادوئی شب تھی۔ ہادی خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھ رہا تھا۔ وہ حجاب کو بس اسی طرح اپنی باہوں میں سمیٹے بیٹھا رہا۔ اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کرتا رہا۔ تب وہ اس کے سینے پر سر رکھے رکھے سو گئی۔ ہادی نے مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ وہاں ایک سکون بھری مسکان کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ہادی نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی کہ کہیں وہ جاگ نہ جائے۔ پھر وہ بھی سو گیا۔

صبح دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ اسی طرح اس کے سینے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ ایک دم وہ بُری طرح چونک گیا۔ اس نے اسے ہلایا۔ "حب......"

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہولے سے بولی۔ "نہیں...... ابھی کچھ نہیں ہوا۔"

ہادی کے سارے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگی تھیں۔

وہ کچھ دیر بعد سرگوشی میں بولی۔ "آپ کو پتا ہے، آج کیا ہے؟"

"کیا ہے؟"

"ابو کی برتھ ڈے ہے۔ ان کو بتایئے گا نہیں۔ شام کو ایک چھوٹا سا کیک لے آیئے گا اور کوئی تحفہ بھی۔ میں ابھی سوچ کر بتاؤں گی۔"

"ایز یو لائیک۔" ہادی نے اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کی۔

سارا دن انہوں نے نیچے ہسپتال کے گراؤنڈ فلور پر ہی گزارا۔ حجاب کے دو تین ٹیسٹ بھی ہوئے جن میں اکو گرافی بھی شامل تھی۔

شام کے بعد وہ ایک بار پھر آٹھویں فلور کے رہائشی اپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ بعد میں فیصل، ڈاکٹر عطا اور فیاض صاحب بھی وہیں آ گئے۔ فیاض صاحب نے حجاب کے ساتھ مل کر کیک کاٹا۔ حجاب اور فیصل نے انہیں تحفے دیئے۔ حجاب کا تحفہ ایک خوبصورت سی رسٹ واچ تھی، چمڑے کے بہت نرم اسٹریپ والی۔ فیاض صاحب نے رسٹ واچ کو چوما اور پھر حجاب کو اپنے ساتھ لگا کر اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی۔ وہ آنسو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ بڑی خوشگوار رات تھی۔ حجاب کی طبیعت بھی بہت اچھی تھی۔ وہ سب کمرے میں ہی موجود رہے اور رات آخری پہر تک باتیں کرتے رہے۔ حجاب چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹی چھوٹی یادوں میں جیسے کھو سی گئی۔ اس نے سیل فون پر روم میں اپنی امی سے بھی طویل بات کی۔ انہیں اپنی خیریت اور تندرستی کے بارے میں بتایا۔ وہ خود چراغ کی طرح ٹمٹما رہی تھی مگر اس حالت میں بھی اسے اپنی امی کی صحت کی غیر معمولی فکر تھی۔ وہ انہیں کھانے پینے کے ٹپس دے رہی تھی اور پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی بھابی یعنی فیصل کی بیوی سے بھی بات کی اور اسے اپنے حوالے سے تسلی دی۔ امی سے بات ختم کرتے ہوئے اس نے فون پر انہیں الوداعی بوسہ دیا اور اس کی آنکھوں میں ایک مسرت آمیز طمانیت کروٹیں لینے لگی۔

اور یہ اگلی شب تھی۔ شام کو تھوڑی دیر حجاب مضمحل رہی تھی۔ بہر حال دو انجکشنز لگنے کے بعد کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں آٹھویں فلور کے اسی کمرے میں موجود تھے جہاں جگمگاتا وینس شہر اپنی ساری رعنائیوں اور یادوں کے ساتھ لان کے قریب تر آ جاتا تھا اور وہ اس میں کھو جاتے تھے۔ وہی پرسوں والا منظر تھا۔ حجاب کے کہنے سے پہلے ہی ہادی نے باہر کی طرف کی کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ وہ دونوں کمبل لیے بستر پر نیم دراز تھے۔ ہادی نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی اپنے ہاتھ سے اسے کھانا کھلایا تھا۔ اس کے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ اس کے ناخن تراشے تھے اور اس کی مہندی والی ہتھیلی کو چوما تھا۔

جب وہ اس کی ہتھیلی کو اپنی انگلیوں سے سہلا رہا تھا۔ حجاب نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ "میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔"

"شکریہ۔"

"لیکن بہت دیر کر دی میں نے۔"

"کیا مطلب؟"

وہ جلدی سے بات بدل کر بولی۔ "یہ بات مجھے کل رات ہی کہہ دینی چاہیے تھی۔ کتنی پیاری چاندنی تھی۔ آج تو ہلکے بادل ہیں۔"

ہادی نے لئے اسے ذرا غور کر دیکھا۔ وہ تازہ گلدستے کے سفید گلابوں پر انگلی پھیرنے لگی۔ کمرے میں گلابوں کی خوشبو جیسے رس بس گئی تھی۔ ہر شے مہکتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی خوبصورت باتیں۔ جنہیں سن کر آنکھوں میں دیئے سے جلتے تھے اور جنہیں کہہ کر اپنے ہونٹوں پر ہی پیار آنے لگتا تھا۔

رات آگے کو سرکتی رہی۔ ہادی نے اسے باہوں میں لے کر اس کی روشن پیشانی پر طویل بوسہ دیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ آہستہ سے دانتوں میں دبایا اور ہادی کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا کریں گے میرے بعد؟"

ہادی کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ "شاید کبھی شادی نہیں کروں گا۔ بس وینس اور روم کی ان گلیوں میں گھوما کروں گا۔ ایسے شعر لکھوں گا جو دل والوں کو تڑپا دیں گے۔ لیکن اگر یہ ہوا بھی تو پتا ہے کب ہوگا؟"

"کب ہوگا؟"

"جب آپ پینسٹھ سال سے اوپر کی ہو جائیں گی اور میں ستر بہتر کا ہوں گا۔ ہمارے بہت سے بچے ہوں گے......اور ان کے بچے بھی۔"

"واقعی؟" اس نے ہادی کے سینے میں جذب ہوتے ہوئے کہا۔

"واقعی۔" ہادی نے جواب دیا۔

لیکن......وہ اسی رات مر گئی......دنیا سے رخصت ہو گئی۔ ڈاکٹروں کے کہنے کے عین مطابق۔ بس دس بیس گھنٹوں کا فرق ہی پڑا ہوگا۔ رات کے دو بجے تھے جب ہادی کی بانہوں میں چھپے چھپے اور اس کے سینے سے لگے لگے اس کی سانس بوجھل ہونے لگی۔

"کھڑکیاں کھول دیں ہادی۔" وہ کسمسائی۔

"کھڑکیاں کھلی ہیں حب!"

"نہیں......ساری کھول دیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

"ساری کھلی ہیں حب!"

اس نے تصدیق کے لیے ہادی کے سینے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ مگر جیسے اسے کھڑکیاں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ نہ وینس نظر آ رہا تھا۔ نہ اس کی نہریں اور سڑکیں جن پر ماضی کی ایک سہانی شب کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ تو جیسے ایک تاریک بیسمنٹ کو ہی دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ڈورتھی کی ہدایت کے عین مطابق ہادی نے کال بیل کا سرخ بٹن دبا دیا۔ ایک منٹ کے اندر اندر ہسپتال کا چاق و چوبند عملہ پورٹ ایبل بیڈ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہادی کے سینے سے لگے لگے بولی۔ "ہادی مجھے کہیں نہ بھیجیں۔ مجھے یہیں رکھیں۔ بس ابو کو یہاں بلا لیں۔"

"وہ بھی آ جاتے ہیں حب! ابھی ہمیں نیچے جانا ہے۔"

اس نے خود کو بمشکل حجاب سے علیحدہ کیا۔ عملہ اس کے بیڈ کو تیز رفتار لفٹ کی طرف دوڑاتا چلا گیا۔

چند منٹ بعد جب اسے آکسیجن لگی ہوئی تھی اور اسے انتہائی نگہداشت یونٹ میں لے جایا جا رہا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں ہادی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ میں اس کے ابو کا ہاتھ تھا۔ وہ جیسے ان دونوں ہاتھوں کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ انہیں آخر تک چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ شاید دنیا کی ہر حجاب کے لیے یہ دونوں ہاتھ اہم ترین ہوتے ہیں۔

جب وینس کی سہانی شب ختم ہو رہی تھی۔ وینس کی لڑکی بھی ختم ہو گئی۔ اس نے اپنا نازک چہرہ ہسپتال کی ہلکی سبز چادر میں ڈھانپ لیا۔ ہادی نے دھاڑیں مار کر روتے ہوئے انکل فیاض کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور انہیں سہارا دیتا ہوا ہسپتال کے سی سی یو سے دور لے آیا۔ "نہیں انکل......نہیں انکل۔" وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

O......✿......O

حجاب کی موت پر ہادی نے بس چند آنسو ہی بہائے تھے۔ لیکن باقی آنسو کہاں تھے؟ وہ بیکراں پانی۔ وہ سمندر؟ وہ دل میں تھا۔ ٹھہرا ہوا تھا لیکن تہہ میں طوفانی ہلچل تھی۔ ہادی نے روم میں حجاب کی آخری رسومات میں بڑی

خاموشی سے شرکت کی۔ اس کی میت کو کندھا بھی دیا، اس کی قبر پر مٹی بھی ڈالی، اس کے لیے دعا کے واسطے ہاتھ بھی اٹھائے۔ لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے اور اس مرنے والی سے اس کا کتنا قریبی رشتہ ہے۔ یہ بات ایک راز تھی اور ہمیشہ راز ہی رہنا تھا۔

وہ واپسی سے پہلے خالہ صوفیہ سے بھی ملنا چاہتا تھا لیکن وہ کسی دوسرے عزیز کے گھر میں تھیں۔ انہیں ان سارے دلخراش معاملات سے فی الحال بالکل بے خبر رکھا گیا تھا۔

روم چھوڑنے سے دو دن پہلے ہادی رات کے وقت اکیلا ہوٹل سے نکلا اور اس مسلم قبرستان میں پہنچا جہاں وہ ابدی نیند سو رہی تھی۔ اسے لگا کہ یہ اس کی ایسی شریکِ حیات کی قبر ہے جو برسوں اس کے ساتھ رہی ہے۔ وہ اس کی قبر کے پاس دوزانو بیٹھ گیا۔

یہ عشق نہیں آساں......اس کے دل کے اندر سے کسی نے پکار کر کہا۔ نیم تاریکی تھی اور خاموشی تھی۔ دل میں ٹھہرا ہوا پانی حرکت کرنے لگا۔ اُچھال میں آ گیا۔ وہ اس کی قبر پر رویا اور ایسا رویا کہ دل میں کوئی حسرت نہ رہی۔ نہ جانے یہ کتنا دورانیہ تھا۔ ایک گھنٹہ دو گھنٹے یا اس سے زیادہ۔

"میرے بعد کیا کریں گے؟" حجاب کی آواز کانوں میں گونجی۔

"شاید کبھی شادی نہیں کروں گا۔ بس وینس اور روم کی ان گلیوں میں ہی گھوما کروں گا اور ایسے شعر لکھوں گا جو دل والوں کو تڑپا دیں۔"

"ٹائم ختم ہوا جناب!" قبرستان کے مسلمان اطالوی چوکیدار کی پاٹ دار آواز آئی۔

وہ اس کی قبر پر الوداعی نظر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتا گیا......چلتا چلا گیا۔ وہ سب کچھ جیسے ایک خیال کی طرح تھا۔ ارد گرد دور دور کے زرد غبار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ وہ ہوٹل پہنچا۔ اس نے ہوٹل چھوڑا۔ اسٹیشن پر آیا۔ یہ سب کچھ ایک دھندلاہٹ میں چھپا ہوا تھا۔

اگلے روز اس نے خود کو ٹرین میں پایا۔ وہ وینس جا رہا تھا۔ آرام دہ نشست پر دراز، کھڑکی سے لگے لگے، وہ اونگھنے لگا۔ نیند اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں اس کا تصور ایک بار پھر حجاب کو اس کے سامنے لے آیا۔ اس نے چمکیلا گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ وہ بولی۔ "آپ دکھی نہ ہوں۔ آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے اور آخر میں میری موت کو بھی ایک سنہری موڑ دیا ہے۔ آپ سوچیں، ورنہ میں اسی بیسمنٹ میں مر جاتی۔ بغیر روشنی دیکھے، بغیر کھلی ہوا میں سانس لیے، بغیر اپنے پیاروں سے ملے۔ تو نہ جانے میری روح کب تک بھٹکتی رہتی۔ اب یہ سب نہیں ہوا اور وہ ہوا ہے جس کی میں نے کبھی توقع نہیں کی تھی۔ میں نے ان تین دنوں میں تین زندگیاں جی لی ہیں ہادی! میں خوش ہوں۔ آپ بھی آنسو پونچھ لیں۔" پھر اس نے گلابی آنچل آگے بڑھایا اور اپنے ہاتھ سے ہادی کے آنسو پونچھ دیئے۔ اس کے آنچل میں سرخ و سفید گلابوں کی مہک تھی۔ پھر وہ اوجھل ہو گئی۔

وہ جیسے چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ گاڑی اپنی رفتار سے جا رہی تھی۔ اسے اپنے ارد گرد واقعی سرخ و سفید گلابوں کی مہک محسوس ہوئی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے سینے میں غم کے شعلوں کو قدرے دھیما محسوس کیا۔

ہاں ..... اگر واقعی وہ اس سمت میں گھٹ گھٹ کر مر جاتی تو یہ سانحہ مزید کتنا اندوہناک ہو جاتا۔

اس رات وہ وینس میں اُترا اور جانے پہچانے راستوں پر چلنے لگا۔ وینس کی نہروں میں آبی بسیں رواں تھیں۔ آبی ٹیکسیوں میں خوش و خرم جوڑے قہقہے بکھیر رہے تھے۔ وہ چلتا چلتا اسی سڑک پر پہنچ گیا جہاں حجاب سے پہلی بار ملا تھا۔ یہ وہی سڑک تھی، وہی موڑ تھا۔ سامنے ہی وہ ریستوران نظر آ رہا تھا اور وہ چھتری بھی جو حجاب نے اٹھائی گیرے کے راستے میں گرائی تھی اور اس موڑ کے پاس ہی آبی گزرگاہ کا پانی چمک رہا تھا۔ یہ سمندر کا حصہ تھا اور اس لحاظ سے سمندر ہی تھا۔ کناروں پر روشنیوں کے ہزارہا جگنو اطالوی موسیقی کی لہروں پر رقصاں تھے۔ چند اچھی چیزیں لکھنے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی۔ اس سے زیادہ گداز دل میں کہاں پیدا ہو سکتا تھا۔ اس نے پیار کر کا قلم اور نوٹ بک نکال لی۔ درد روشنائی کی طرح تھا۔ لیکن جب روشنائی ضرورت سے زیادہ ہو تو لفظ پھیلنے لگتے ہیں۔ اس نے ذرا انتظار کرنا مناسب سمجھا اور نئی چیز لکھنے سے پہلے ایک پرانی چیز پڑھنے لگا۔ حجاب اور اس کے سارے حالات اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔

"اور تم جانتے ہو کاسابیانکا کون تھا۔ کاسابیانکا اطاعت اور فرمانبرداری کی لازوال مثال تھا۔ وہ بحری جہاز کے آفیسر کا لختِ جگر تھا اور جب کھلے ویران پانیوں میں انگریزوں نے حملہ کیا۔ جب جہاز کو آگ لگی اور ہر طرف تہلکہ مچا، لشکریوں کی آہ و بکا سے عرشے لرزنے لگے تو باپ نے کاسابیانکا کو ایک جگہ کھڑا کیا اور کہا۔ "کاسا! یہاں کھڑے رہنا، جب تک میں نہ کہوں۔"

اور وہ کہہ کر چلا گیا اور وہ بارود کی بارش میں موت کا شکار ہوا اور بیٹا، باپ کے حکم پر اسی جگہ کھڑا رہا۔ گو موت نے اپنے گھیرے تنگ کیے لیکن وہ ہلا نہیں۔ وہ کیسے ہلتا؟ ابھی اس کے باپ کا حکم نہیں تھا۔ اور وہ اسی جگہ کھڑا کھڑا امر گیا اور وہ اطاعت کی لازوال مثال تھا۔

میں نے کاسابیانکا کو نہیں دیکھا لیکن میں نے روم کی روشنیوں میں چمکتی دمکتی ایک لڑکی کو دیکھا ہے۔ وہ بھی اپنے باپ کے حکم پر ایک جلتی ہوئی چار دیواری میں کھڑی رہی۔ اس کے نازک پاؤں جل گئے۔ اس کا کومل بدن جھلس گیا۔ وہ درد سے کراہتی رہی۔ اور کراہتی رہی۔

"ہاں ..... میں نے کاسابیانکا کو نہیں دیکھا لیکن روم کی اس لڑکی کو دیکھا ہے۔"

❖ ..... ختم شد ..... ❖